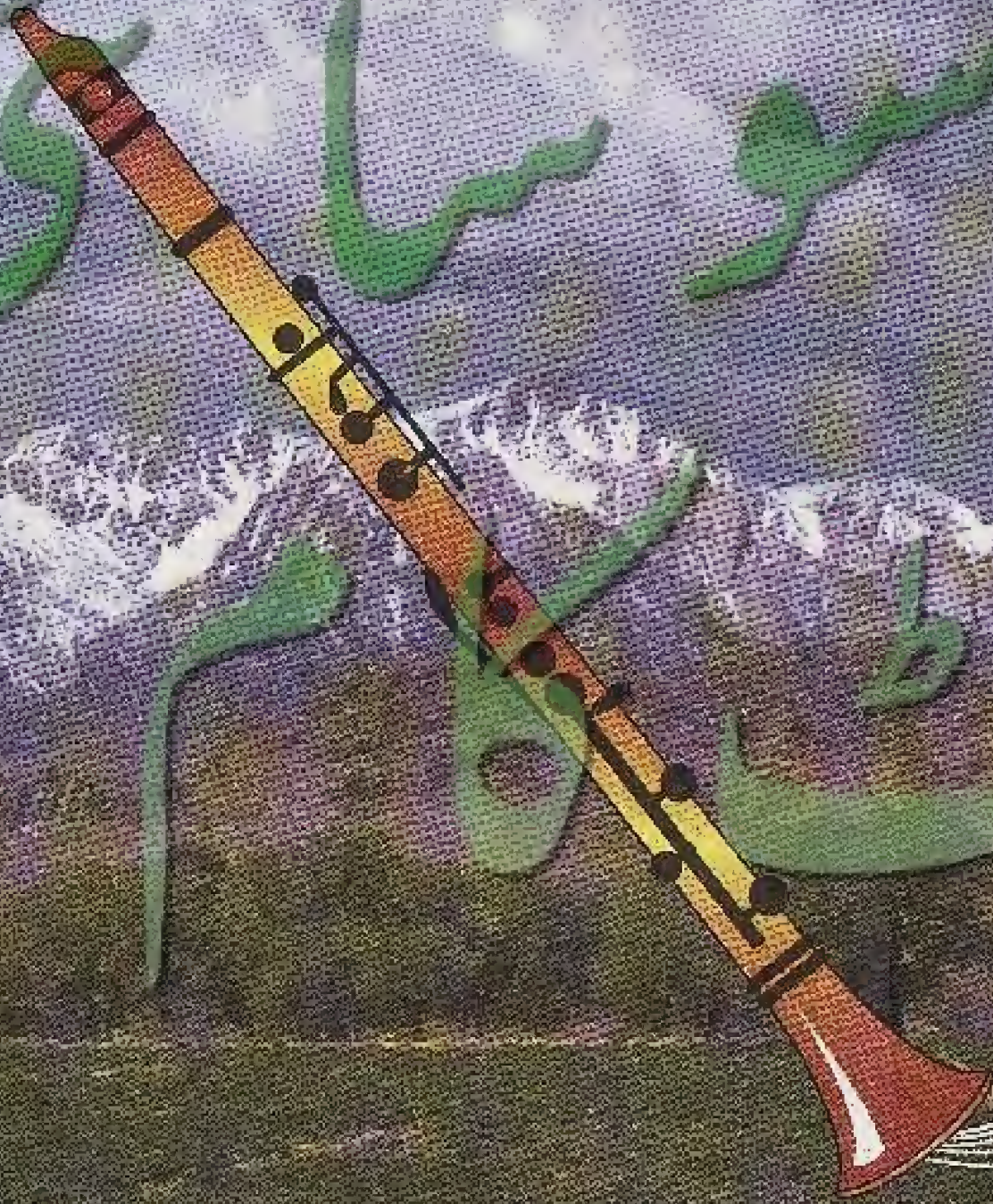


کھیل تماشہ



اشفاق احمد

اپنے والد
اور
انکے دوستوں چاچا شیر سنگھ
بھائی کرتار سنگھ اور تایا لال بھ سنگھ
کے نام

891.4393 Ishfaq Ahmad
Khuli Tamasha/ Ishfaq Ahmad.-
Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2007.
216pp.
I. Urdu Literature - Novel.
1. Title.

اس کتاب کا کوئی بھی حصہ سنگ میل پبلی کیشنز/ مصنف سے باقاعدہ
تحریری اجازت کے بغیر کہیں بھی شائع نہیں کیا جاسکتا اگر اس قسم کی
کوئی بھی صورت حال ظہور پذیر ہوتی ہے تو قانونی کارروائی کا حق محفوظ ہے

2007

نیاز احمد نے

سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

سے شائع کی۔

ISBN 969-35-1087-9

Sang-e-Meel Publications

25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 957 Lahore-54000 PAKISTAN

Phones: 7220100-7228143 Fax: 7245101

http://www.sang-e-meel.com e-mail: smj@sang-e-meel.com

Chowk Urdu Bazar Lahore, Pakistan. Phone 7667970

حاجی حنیف اینڈ سنز پرنٹرز، لاہور

بازار سے گزرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ چوک میں بہت سے لوگ جمع ہیں اور انہوں نے کسی شخص کو گھیر رکھا ہے۔ مجھے وہ شخص تو نظر نہیں آیا البتہ گروہ کے شور اور لوگوں کی تعداد سے اندازہ ہوا کہ کوئی اہم واقعہ ہو گیا ہے اور لوگ بہت ہی غصے میں ہیں۔

ہمارے تخت پر کایہ چوک نانک شاہی اینٹوں کے فرش کا پکا چوک تھا اور اس کے چاروں طرف زیادہ کیچڑے، صرافے، برتنوں اور پیساریوں کی بڑی بڑی دکانیں تھیں۔ ان کے درمیان تک سب کی دوسری چھوٹی چھوٹی دکانیں بھی تھیں جن کے کوٹھے نیچے تھے اور ان پر بور یوں کے ٹاٹ والے چھوٹے چھوٹے بیت لگائے تھے۔ بڑی دکانوں پر ان کے سائز کے دھاتی کے چوبارے تھے جن کی سیریلیاں دکانوں کے پہلو سے چڑھتی تھیں اور کھڑکیاں چوک میں جھلکتی تھیں۔

چوک کے درمیان میں سینٹ کا ایک خشک فوارہ تھا جسے کبھی نے پانی کا نکاشن نہیں دیا تھا۔ حالانکہ یہ فوارہ بھی کبھی کا تھا اور پانی بھی کبھی کا لیکن محمول چنگی کے کسی آسٹم پر جھکڑے کی وجہ سے فوارے کو پانی سے محروم کر دیا گیا تھا۔ اس فوارے کے اندر مزدور اپنی پکڑیاں بچھا کر اور بور یوں کو گچھا بچھا کر کے نیچے بنا کے سوتے تھے۔ فوارے کے باہر ان کی ہتھ کڑیاں کھڑی ہوئیں اور گاڑیوں کے نیچے بازار کے کتورے اور ان کے دوست کتورے چھوٹے چھوٹے پریشاب کر کے دیر دیر تک سویا کرتے۔

جن لوگوں نے چوک میں ایک شخص کو گھیرا ہوا تھا وہ اس فوارے کے پاس جمع تھے اور آگے بڑھ کر اس شخص کو پلڑے کے اور ٹھڈے مار رہے تھے۔ وہ شخص زمین پر گر ہوا تھا اور آدمیوں کا گروہ اس کے گرد ایک قد آدم بنور کی طرح گھیرا ڈالے کھڑا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر اس بنور کے شکاف میں اپنی تھوڑی تھوڑی گھسا کر دیکھا کہ ایک نوجوان سال کا ہے۔ سر پر

ڈیوں والا درمال کس کے بندھا ہوا کمار والی نیلی قیص، سفید شلوار پاؤں میں ادھوڑی کے جوتے اور چہرے پر ڈاڑھی کی نئی نئی فصل۔ دوچوک کے نائک شاہی فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا اور اس نے اپنا سر ڈاڑھوں میں دبا رکھا تھا۔

جب لوگوں نے "مارو مارو..... اور مارو" کا نعرہ بلند کیا تو لالہ رام چند صراف نے عینک اتار کر کہا: "بھائی قانون کو اپنے ہاتھ میں نہ لو اسے پولیس کے حوالے کر دو۔"

"ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔" سب نے لالہ جی کی تائید کی اور چور کو کھڑے ہونے کا حکم دیا۔ چور نے بھائی گور بخش سنگھ کتابوں والے کی دکان سے تاج کینٹی کا ایک قرآن شریف چر لیا تھا اور ادھر ادھر دیکھ کر اپنی قیص کے اندر اس لیا تھا۔ بھائی گور بخش سنگھ کی دکان پر آدھی قیمت پر پرانی کتابیں بیچنے اور نئی کتابیں خریدنے والے طالب علموں اور ان کے والدین کا جھوم تھا کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔ سامنے پرانی شربت والے نے چوری کے اس سارے عمل کو سلو مشن میں بڑی تفصیل سے دیکھا تھا۔ اس نے چور کے کامیاب اقدام کو اپنی منحوس آواز سے ذلت و رسوائی میں تبدیل کر دیا۔ بھائی گور بخش سنگھ اپنے پھٹے سے ننگے پاؤں کود کر چور کو گردن سے پکڑ لائے اور سب کے سامنے اس سے مال مسروقہ برآمد کر لیا۔

یہ ہلکے سنہرے کارڈ بورڈ کی جلد والا قرآن شریف تھا جس کی سورۃ فاتحہ پانچ رنگے بلاکوں میں چھپی تھی اور باقی کا سارا قرآن شریف دو رنگا تھا۔ ترجمہ مولوی فتح محمد جانی حری کا تھا اور حاشیوں پر ضروری وضاحت درج تھی۔

جب غصے میں پھرا ہوا اگر وہ نوجوان کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر تھانے کی طرف لے چلا تو ماسٹر بانی اپنے چہرے کی کھڑکی سے اس کشاکش جالوس کو دیکھ کر ننگے پاؤں چوک میں اترے اور بھائی گور بخش سنگھ کا راستہ روک کر بولے: "کتنے کا ہے بھائی جی؟"

بھائی جی نے غصے سے ہاتھ جھٹک کر کہا: "خدا کا کلام انمول ہے اس کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔"

"میرا مطلب ہے تمہاری ادالہ بدلا سکتی ہے؟" ماسٹر بانی نے شرمندگی نالتے ہوئے کہا:

"چھ روپے" بھائی جی نے چور کو غصے سے گھور اور اسے مارنے کو ایک بار پھر ہاتھ اوپر اٹھایا۔

ماسٹر بانی نے اپنے کلف لگے حمل کے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور ہلکے سے خوف سے ان کا چہرہ ڈرا سا سنجیدہ ہو گیا۔ اس میں سے پانچ کا ایک نوٹ برآمد ہوا اور ماسٹر بانی نے

دھکی آواز میں کہا: "آپ یہ رکھیں بھائی جی میں ایک روپیہ جا کے بھجواتا ہوں۔"

جب بھائی گور بخش سنگھ نے پانچ کا نوٹ پکڑ لیا تو گروہ کا تنور سرخیوں کے اٹنے ٹاپے کی طرح کھل گیا۔ پھر چمدن راہونے لگا اور آہستہ آہستہ لوگ پرے ہٹتے ہٹتے غائب ہو گئے۔

میں نے ڈرتے ڈرتے چارج خشم کی مورت والا ایک روپیہ اپنی جیب سے نکالا اور ماسٹر بانی کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا۔ انہوں نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور میں نے آگے بڑھ کر دو روپیہ بھائی گور بخش سنگھ کو دے دیا۔ اپنے چھ روپے پورے ہو جانے کے بعد بھائی جی بڑبڑ کرتے اور گالیاں بکتے اپنی دکان کی طرف مڑ گئے۔

وہ نوجوان ابھی تک اسی طرح کھڑا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ جب ماسٹر بانی نے عبت سے چپکار کر کہا: "جاؤ بیجا جاؤ" تو اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیلاب بہہ نکلا۔ وہ روتا جاتا تھا۔ قرآن شریف کو چومنا جاتا تھا اور نکمیر کی وجہ سے سنہرے کارڈ بورڈ کا ٹائٹل کھٹکتی ہو تا جا رہا تھا۔

ماسٹر بانی نے جاتے ہوئے نوجوان پر اپنی نگاہیں گاڑ کر دونوں ہاتھ دعا کیلئے اٹھائے۔ دل

ی دل میں کچھ کہا اور میری طرف دیکھے بغیر فرمایا: "کل میرے چہرے پر تشریف لا کر روپیہ لے جائے گا۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔"

ماسٹر بانی کمارنٹ بجاتے تھے اور لچھو بساطی کے چہرے میں اکیلے رہتے تھے۔

ہمارا تخت پور کوئی بڑا شہر نہیں تھا شعل کی ایک تحصیل تھی۔ پہلے اس کو سرکاری

کاغذات میں قصبہ لکھتے تھے لیکن 1935ء میں جارج ٹیمن کی سلور جوبلی پر اسے شہر لکھا جانے

لگا۔ بائیس ہزار کی آبادی۔ ایک بڑا تحصیلدار ایک چھوٹا۔ ایک سب انسپکٹر ایک اسے ایس

آئی۔ تھانے کے علاوہ گھڑ سوار دلی بھتہ۔ چھوٹی بیچ کا چار سنگیلوں والا ریلوے سٹیشن۔ ایک

ایل ایس ایم ایف ڈاکٹر۔ دو ٹریڈنگ کمپنیاؤں۔ لاریوں کے لڑے ساتھ برف کا کارخانہ۔ گونڈالہ

کی تنگ گلی میں غنڈہ ورام کی بوتلیں بھرنے والی مشین اور قبرستان کے پاس لالہ تنخواہ رام کی

جنگ فیکٹری۔ لوگ شام کے وقت اس فیکٹری کے پھانک پر لالہ جی کی ذاتی بجلی کے لانٹو جلتے

دیکھتے جاتے تھے۔ ہمارے شہر میں سب کچھ تھا بس ایک بجلی نہیں تھی اور بجلی کے نہ ہونے

سے باہر کے لوگ ہمارے شہر کو قصبہ ہی سمجھتے تھے اور قصبہ ہی کہتے تھے حالانکہ یہاں دنیا بھر

میں دوسرے نمبر کا گوروارہ تھا اور ننگوں کا بہت بڑا استھان تھا۔

موگا تو صرف آنکلیں بنانے والے ڈاکٹر تھیں اور اس کی وجہ سے مشہور تھا لیکن ہمارا

شہر ضلع بھر میں سب سے بڑی اناج منڈی اور اپنے گور دوارے کی وجہ سے پنجاب میں شہرت رکھتا تھا۔ یہاں کے لوگ بڑے ہانکے اور اپنی مرضی کے مالک تھے۔ بڑی بڑی..... اور سودا گری کی عورتوں کو احوال کر لے جانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ لمبی لمبی چٹیلیں کاٹ کر جب ملزم واپس اپنے شہر آتے تو ریلوے سٹیشن پر بیٹھ باجے کے جلو میں اپنے گھر جاتے جہاں بڑے بڑے تंबوڑوں میں ٹھٹھے چاول کی دھکیں غریبوں میں تقسیم کی جاتیں اور مٹی کے آنہوروں میں برف ڈال کر شکر کا شربت پلایا جاتا۔

ماسٹر بانی بیٹھ میں کلارنٹ بجاتے تھے لیکن بیٹھ والوں کی وردی نہیں پہنتے تھے۔ سفید کلاف لگا ملل کا کرید اور چابی کے لٹھے کی کھڑکھڑ کرتی شلوار۔ کانوں میں سونے کی نیپیاں اور آنکھوں میں بھاری سرمہ۔ چھوٹی چھوٹی سیاہ مونچھیں۔ چوڑا تھا۔ پاؤں میں ریشمی نائی کی سیاہ گرگابی اور کلائی پر سونے شیشے کی دیسٹ اینڈ گھڑی۔ بیٹھ سے الگ تھلگ ایک طرف ہو کر کلارنٹ بجاتے اور دھن کا ساتھ دیتے۔ جب وقفہ ہوتا تو دھن سے سروں میں اپنا ساز بچھڑتے اور سروں کی سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے ایک اونچی کوک فریڈ قائم کر کے بند دروازے پر ایک صدا اسی لگاتے اور کلارنٹ منہ سے نکال کر کھڑے ہو جاتے۔ وہ بیٹھ کا ایک حصہ نہیں تھے۔ بیٹھ ان کا ایک جزو تھا۔ خود بیٹھ والوں میں شامل نہیں تھے سارا بیٹھ ان کی فرخ تھا۔ پتہ نہیں وہ اس کام کی اجازت بھی لیتے تھے یا نہیں البتہ وہ بیٹھ والوں کے کہنے پر ضرور جاتے تھے۔ واپسی پر وہ اپنا کلارنٹ کیس ہاتھ میں لٹکائے جاتے بھی اکیلے تھے اور اسی طرح آتے بھی اکیلے تھے۔ میں نے انہیں نہ تو کبھی گلیوں بازاروں میں گھومتے دیکھا اور نہ دو ستون یاروں کی سنگت میں موجود پایا۔ کچھ اس طرح سے تھے کہ کہیں کہیں تھے اور کچھ ایسے رہتے تھے کہ ہر وقت غیر حاضر سے نظر آتے۔ چلتے تو نامعلوم سے گزر جاتے۔ انتہائی خاموشی کے باوصف ان کی آنکھوں میں بلا کی فصاحت تھی۔ اپنی نرم ردی اور خوشگوار مسکراہٹ سے انہوں نے اپنے اور لوگوں کے درمیان لا تعلقی کا ایک پردہ کھینچ رکھا تھا اور لا تعلقی کی یہ نرمی اس قدر سخت تھی کہ اس پردے کی اوٹ سے کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔

جب میں سکول میں پڑھتا تھا تو ماسٹر بانی میرے ہیرو تھے اور جب میں کالج میں داخلہ لے کر گرمیوں کی چھٹیوں میں واپس گھر آیا تو ان کی شکل ایسے محبوب کی سی ہو گئی تھی جس کے ساتھ ہر وقت بھاگ جانے کوئی چاہنے لگے۔ وہ عمر میں مجھ سے تین چار سال بڑے ہوں گے لیکن رتے میں بہت آگے پہنچے ہوئے تھے۔ اسنے آگے کے اس سے آگے اور کچھ ہوتا ہی

نہیں۔ نہ منزل نہ نشان نہ خیال نہ واہم۔

میں ماسٹر بانی سے ملنا چاہتا تھا اور مل نہ سکتا تھا۔ بات کرنی چاہتا تھا اور میرا حوصلہ نہ بڑتا تھا۔ دیکھنا چاہتا تھا اور وہ نظر نہیں آتے تھے۔ ان کی ذات میں ایک عجیب طرح کا شفقت آمیز تہور تھا جیسے ایرینا میں داخل ہونے والے نل کے وجود پر ہوتا ہے۔ اسے معلوم تو ہوتا ہے کہ وہ مغلوب ہو جائے گا لیکن یقین نہیں ہوتا۔ ماسٹر بانی بھرے پرے شہر کے سنیان ایرینا میں سگھارے ہوئے نل کی طرح موجود تھے حالانکہ نہ ان کی کوئی تعلیم تھی نہ امیر تھے نہ عالی منصب نہ ہی ان کی کوئی بیک گراؤنڈ تھی۔

اگلے روز جب میں ان سے اپنا درپہ واپس لینے کیلئے ان کی سیڑھیاں چڑھا تو چارپائی پر آلتی پالتی مارے اپنا کلارنٹ صاف کر رہے تھے۔ مجھے دیکھ کر مسکرائے اور سامنے پڑے ہوئے موٹر سے پر بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ وہ بڑی دیر تک اپنے کلارنٹ کے ٹوٹے صاف کرتے رہے اور میں بڑی دیر تک اس طرح بیٹھا رہا۔ پھر انہوں نے چہرہ اوپر اٹھائے بغیر آہستہ سے کہا "وہ نوجوان کسی قریبی گاؤں کا معلوم ہوتا تھا۔"

"جی" میں نے مرعوب ہو کر ویسی ہی آہستگی سے جواب دیا۔

"اگر اپنے تحت پور کا ہوتا تو پہلے بھی کہیں ضرور نظر آتا۔"

"جی اور مست ہے" میں نے ان کا فرمانا تسلیم کرتے ہوئے کہا "وہ کسی قریبی گاؤں ہی کا تھا اور قرآن شریف لے کر اپنے گاؤں ہی چلا گیا۔"

"لوگ بھی بڑے مودک ہوتے ہیں" انہوں نے دیکھی لہجے میں کہا۔

"نہی پینک" مودک بھی ہوتے ہیں اور ظالم بھی۔"

"اور یہ سارا ظلم مودکھائی کی وجہ سے ہے" انہوں نے سر اوپر اٹھائے بغیر کہا "اگر بات سمجھ میں آجائے تو ایسے ختم ہو جاتا ہے۔ پر بات سمجھ میں آئی نہیں اور اوھر سے اوھر جاتی ہے..... اسے مارنا نہیں چاہیے تھا۔"

"اس نے چوری جو کی تھی ماسٹر جی" میں نے حوصلہ کر کے کہا "تو پھر لوگوں نے اسے مارنا ہی تھا تھا۔"

وہ تھوڑی دیر اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے پھر اپنے آپ سے کہنے لگے "صاحبزادے! ہم سبھی چور ہیں کوئی سول کا چور کوئی بیان کا چور۔ کوئی چور کا چور کوئی یار کا چور ایہ سارا بارہا پارا چوری یاری کا ہی ہے۔ وہ چور نہیں تھا تھا۔"

”نوں چور نہیں تھا“ میں نے گہرا کر پوچھا۔

”وہی نو جوان جس نے قرآن شریف چڑھایا تھا۔“

پھر وہ اپنے سامان کو اسی طرح چھوڑ کر اندر کمرے میں چلے گئے۔

ماسٹر بانی کا چہرہ بارہ ایک مستطیل کمرے اس کے سامنے تقریباً اسی سائز کے برآمدے اور برآمدے سے ذرا سے بڑے صحن پر مشتمل تھا۔ برآمدے اور صحن کے رقبے پر خطر نچی نائیکلوں کا فرش تھا۔ صحن کی بازار والی سائیڈ سرخ سینٹ کی تھی جس میں دس بارہ آدمیوں کے بیٹھنے کی ایک نشست گاہ تھی۔ سرخ سینٹ کی اسی نشست گاہ میں بیٹھے آدمی ذرا سی گردن گھا کر نیچے بازار میں دیکھ سکتے تھے اور بازار سے گزرنے والا شخص ذرا سی نگاہ اٹھا کر اوپر بیٹھے ہوئے آدمیوں کی سریاں دیکھ سکتا تھا۔ برآمدے کے کونے میں پانی سے بھرا ایک ننسا گھڑا تھا جس کے گھٹے میں چنبیلی کے تازک تازک پھولوں کا ایک ہار تھا۔ ساتھ ہی ایک چھوٹی سی تپائی پر مٹی کی ایک کوری کنالی میں شیشے کا گلاس اونڈھا رکھا ہوا تھا اور کنالی چنبیلی کے پھولوں سے بھری ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد ماسٹر بانی کمرے سے برآمد ہوئے ان کے ہاتھ میں نیلے رنگ کا ایک ربڑ تھا اور دوسرے ہاتھ کی مٹھی بند تھی۔ ان کے آنے پر میں موڑنے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا تو انہوں نے بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے اپنی مٹھی کھول کر جارج ششم کا ایک قدرے میلا سا روپیہ میری طرف بڑھا کر کہا ”صاحبزادے یہ آپ کا روپیہ ہے۔“ میں نے روپیہ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور اسی طرح کھڑا رہا۔ وہ اپنی چادر پائی پر بیٹھ کر کلارنٹ کیس پر ٹیلا ربڑ باندھنے لگے اور میں اپنی جگہ پر بدستور کھڑا رہا۔

انہوں نے نگاہیں اوپر اٹھائے بغیر دھیمے سروں میں کہا ”بیٹھو صاحبزادے“ بیٹھو تو میں نے حوصلہ کر کے اپنے ذائقے ہاتھ کے نیچے بایاں ہاتھ رکھ کر وہ روپیہ ان کی طرف بڑھاتے ہوئے ہوئے سے کہا ”مجھے اپنا شاگرد کر لیں“ وہ میرے روپیے کی اس اچانک تبدیلی پر حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگے اور ہنس کر بولے ”شاگرد! آپ کو اوہ کس لیے؟“

میں نے کہا ”میں بانسری بجانا چاہتا ہوں اور آپ کی شاگردی میں آنے کا خواہشمند ہوں۔“

”نہیں بھائی ناں“ انہوں نے نفی کے انداز میں اپنا ہاتھ ہلایا اور خوشگوار لہجے میں بولے ”میں استاد کی شاگردی نہیں کرتا ناں میرے میں اتنی قابلیت ہے کہ کسی کو اپنا شاگرد

بنائوں۔ یہ تو بس ایسے کھیل تھا شاہ۔ تمہاری مہربانی۔“

میں آگے بڑھ کر ان کی چادر پائی کے پاس زمین پر بیٹھ گیا اور لجاجت سے بولا ”آپ میں قابلیت ہو یا نہ ہو یہ سب کھیل تھا شاہ ہو یا نہ ہو“ میں آپ کی شاگردی میں آنا چاہتا ہوں اور آپ کا شاگرد ہو کر رہنا چاہتا ہوں۔“ انہوں نے کہا ”تم ایک معزز گھرانے کے فرزند ہو اور یہ کسب ماگت لوگوں کا ہے۔ تمہارے گھروالے یہ کس طرح برداشت کریں گے کہ ان کا بیٹا فقیر ہو جائے اور کوک فریاد کرنے لگے۔ اس خیال کو دل سے نکال دو اور بڑھو گھس۔ بڑے افسر ہو۔ ماں باپ کا نام روشن کرو اور اس شہر کی عزت بناؤ کہ ہم بھی کہیں سکیں ہمارے تخت پور کا بیٹا اپنی کشتی لگا ہوا ہے۔“

میں نے کہا ”صاحب میرے میں ڈپٹی کمشنر بھی ہو جاؤں گا اور ماں باپ کا نام بھی روشن کر لوں گا لیکن میں آپ کا شاگرد بن کر بھی رہنا چاہتا ہوں گا مجھے قبول فرما لیجئے۔“

انہوں نے کہا ”تم بانسری کیوں بجانا چاہتے ہو؟“

”اس لیے کہ بانسری کی آواز مجھے اچھی لگتی ہے۔“

”اگر تم کو بانسری سے بھی اچھی کوئی اور آواز مل گئی تو کیا بانسری چھوڑ دو گے؟“

میرے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔

کہنے لگے ”اگر اپنے محبوب سے کوئی اچھا چہرہ نظر آگیا تو محبوب کو چھوڑ دو گے۔ اپنے

دین و دھرم سے کوئی اچھا دین و دھرم مل گیا تو اپنے دین کو چھوڑ دو گے؟“

میں اسی طرح بے جواب اور بے کلام گھبرا سا فرش پر بیٹھا رہا تو انہوں نے روپیہ

میرے ہاتھ کے کونے سے اٹھا لیا اور کہا ”استادی شاگردی کوئی نہیں آج سے تم میرے

چھوٹے بھائی ہو اور جب تک ہم دونوں میں سے کوئی بھی موجود ہے تم میرے بھائی ہی رہو

گے۔“ میں نے ان کا ہاتھ اپنی مٹھیوں میں پکھنچ کر چہرے سے لگا لیا اور میرا رونا نکل گیا!

بچل کی وہ بانسری جس پر میں نے دو تین دھنیں پکی کی ہوئی تھیں وہ میرے استاد کو

پسند نہ آئی۔ دراصل انہیں میرے بھانے کا انداز اور میری کارکردگی مناسب معلوم نہ ہوئی

اور انہوں نے مجھے یہ کہہ کر روک دیا کہ جب تک صحیح قسم کی بانسری نہیں ملتی مشق جاری

نہیں کرائی جاسکتی اور جب تک مشق جاری نہیں ہوتی اس وقت تک صرف میل جول اور

بات چیت پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

گرمیوں کی چھٹیاں تھیں اور میں شام پانچ کے بعد ان کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ کبھی

کبھی ان کے پاس کوئی ایسا آدمی بھی نظر آ جاتا جس سے میں بالکل نادانف ہوتا۔ وہ اس کے ساتھ میرا تعارف نہیں کراتے تھے البتہ باتوں میں خودی کھل جاتا تھا کہ کون آدمی ہے اور کس غرض سے آیا ہے۔ ان لوگوں میں بیشتر لوگ اہل حرفہ ہوتے تھے۔ کوئی ترخان کوئی جولہا کوئی کہار اور کوئی گانے بجانے والا جو کسی راگ راگنی کا الٹ پھیر سمجھنے کیلئے ان کے پاس آتا تھا۔ گوردوارہ صاحب کے خلی چکریوں والے اکانی اور مینی جوڑی بجانے والے راگی تقریباً ہر روز ہی وہاں آتے تھے اور شہد کیرتن کے بارے میں ان سے رائے لیا کرتے تھے۔ ان لوگوں کی آپس کی باتیں میرے لئے بڑی مفید ہوتیں اور راگ و دیا کی سکھشا میں بہت مدد دیتیں۔

ماسٹر صاحب مجھے "صاحبزادہ" کہہ کر بلاتے تھے اور مجھے اس خطاب سے بڑی کوفت ہوتی تھی۔ ایک روز میں نے جرأت کر کے ان سے کہہ ہی دیا کہ اس خطاب سے مجھے بڑی ندامت ہوتی ہے اس لیے مجھے میرا نام لے کر بلایا کریں تو انہوں نے مسکرا کر کہا "بھئی تمہارا نام اتنا بے وزن اور بے سرا ہے کہ ہم سے پکارا نہیں جاتا۔" میں نے کہا "آپ جس نام سے مجھے پکارنا چاہیں وہی میرا اصل نام ہوگا۔"

کہنے لگے "پھر ٹھیک ہے اپنا پہلا اور آخری حرف چھوڑ دو۔ میں تمہیں شفا کے نام سے بلایا کر دوں گا۔" میرے لئے اس سے اچھا اور کیا نام ہو سکتا تھا؟ خوشی منظور کر لیا اور اپنے آپ کو شفا ہی سمجھنے لگا۔ تھوڑے دنوں بعد جب ان کے ملنے ملانے والوں نے میرے نام کو اندانیہ صورت دی تو میں شفا ہی کہلانے لگا۔ لیکن میرا یہ نام صرف ان کی محفل تک محدود تھا۔ میرے گھر والوں یا شہر کے لوگوں کو اس تبدیلی نام کا کوئی علم نہ تھا۔

لوگوں کی محفل میں میں ماسٹر صاحب کو "جناب" کہہ کر مخاطب کرتا۔ اکیلے ہوتے تو میں "سرکار" کہہ کر بلاتا اور جب کسی کیفیت کا عالم ہوتا تو میرے منہ سے بے اختیار "مہراج" نکل جاتا۔

سیالکوٹ سے چھ چابیوں والی بوزی کی بکلو فلوٹ پہنچ چکی تھی اور میں نے باقاعدگی سے اس پر سرگرم کی پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ایک مہینہ گزرنے کے باوجود اور لگن و حیاں کی پریکٹس کے باوجود انہوں نے مجھے آگے کوئی سبق نہ دیا۔ البتہ ان کی غیر موجودگی میں چوری چوری میں کچھ ایسی خود ساختہ بندشیں بجانے لگا تھا جو مجھے بڑا لطف دیتیں اور میں اپنے آپ کو دودیتے ہوئے خود ہی سر دھنا کرتا۔ ایک روز انہوں نے میٹر حیاں چڑھتے ہوئے رک کر کوئی ایسی ہی بندش سنی تو اوپر آکر فرمایا "شفا ہی ایہ کام جو تم نے شروع کیا ہے ٹھیک

نہیں اس سے کوئی مسئلہ حل نہیں ہوگا۔"

میرے اوسان خطا ہو گئے اور اپنی چوری چڑے جانے پر میں پتھر کی صورت بن گیا! انہوں نے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے اپنا کلارنٹ اٹھایا اور ایک زمزمہ لے کر سرگرم بجاتی شروع کر دی۔ میں سمجھا یہ میرے لیے سنگت کا حکم ہے۔ بکلو ہونٹوں سے لگا کر میں نے بھی سرگرم میں ساتھ دینا شروع کیا تو انہوں نے سر کے اشارے سے روک دیا۔ تھوڑی دیر سرگرم کے الٹ پھیر کے بعد انہوں نے ہاتھ میری طرف بڑھایا اور کلارنٹ پکڑا کر بولے "اسے بجاؤ مگر کچھ بجانا ہے تو۔ یہ فلوٹ وغیرہ وہاں بات ساز ہیں، مصنوعی عشق بازی کے بہانے۔"

میرے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اتنا بڑا ساز "میڑھی سیدھی چابیاں" استادوں کا ورثہ گوردکانہ میں اسے کس طرح اپنا سکتا ہوں۔ ساری عمر بھی ریاض کروں تب بھی سرگرم کے جال سے نہیں نکل سکتا۔ یہ تو جمل دیوتا کا ساز ہے جو آدھی رات کو سمندر سے نکل کر بجاتے ہیں اور پھر آخری سروں کے ساتھ سمندر ہی میں ڈوب جاتے ہیں۔ میں اسے کدھر سے بجالوں گا اور میں وہ پچونک کہاں سے لاؤں گا جو مرنے اور جینے کے درمیان ہوتی ہے اور خود ہی فیصلہ کرتی جاتی ہے کہ کلارنٹ نواز کو جینا ہے کہ مرنا ہے۔ کلارنٹ کو ہاتھ سے چھوٹ کے گرنا ہے یا پھر سے ٹوٹے ہو کر کیس میں بند ہونا ہے۔ میں مہراج کا کلارنٹ ہاتھوں میں لئے بیٹھا تھا اور مہراج چارپائی پر بیٹھے میری طرف غور سے دیکھ رہے تھے۔

ماسٹر صاحب کا معمول تھا کہ سر دیاں گرمیاں فجر سے پہلے منہ اند میرے اٹھ کر اپنے صحن میں آکر گرے ہوتے اور گوردوارہ صاحب کے گلس کی طرف منہ کر کے کلارنٹ پر آسا کی وار بجاتے۔ بازار کا خاموش اور چپ چاپ چوک واد کی آہیں دینے لگتا اور ساری خاموش فضا اس آواز سے لہریز ہو جاتی۔ ہر نام سنگھ سوڈھی جو ہمارے علاقے کے بہت بڑے بلکہ سب سے بڑے زمیندار تھے اپنی ریڑھی میں سوار ہو کر اس آواز سے بہت پہلے چوک میں پہنچ جاتے۔ ان کا ملازم جسا سوڈھی صاحب کی ریڑھی آہستہ آہستہ حویلی سے دھکیلتا ہوا چوک میں لے آتا اور دکان کے پچھے پر بیٹھ جاتا۔ سردار صاحب پچھلے دس سال سے قالج کے مریض تھے اور سوائے اس ایک وقت کے اپنی حویلی سے باہر نہیں نکلتے تھے۔ جب تک کلارنٹ بجاتا رہتا سردار صاحب کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری ان کی داڑھی اور گلے کے صافے کو بھگوٹی رہتی۔ ان کے بچوں پوتوں اور نواسوں نے کئی مرتبہ کہا کہ وہ شدید گرمی اور سردی میں اسی طرح باہر نکل کر چوک میں نہ جایا کریں جب ضرورت پڑے ماسٹر بائی کو حویلی پر بلا کر

آسا کی وار سن لیا کریں لیکن سوڈھی صاحب نہیں مانتے تھے۔ خود ماسٹر صاحب نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی تھی کہ آپ بزرگ ہیں اور بزرگوں کی سیوا ہمارا دھرم ہے میں حویلی میں آکر دار سنا چایا کروں گا لیکن سوڈھی صاحب نے ان کی درخواست یہ کہہ کر نال دی تھی کہ تھوڑی دیر کو میں کھلی ہوا میں نکل کر دوا ہر دے موسم کا نظارہ کر لیتا ہوں مجھے آنے ہی دو۔

اندھیرے چوک میں سوڈھی ہر نام سنگھ کی ریڑھی آجائے پر ماسٹر صاحب کو بھی علم ہو جاتا اور دو کارنت کی لے اور اونچی کر دیتے۔ کئی مرتبہ یہ دار سن کر سردار صاحب کی سسکیاں اتنی اونچی ہو جاتیں کہ وہ دار کی آفس دیتے ہوئے چوک کے ساتھ جھگڑا کرنے لگتیں اور ان کے درمیان گہری ٹوک جھونک ہوتی۔ جتنا اپنی انیوں کی جھونک میں اسی طرح پھٹے پر گھما پھما پڑا ہوتا اور سردار صاحب کی ”داڑھی لو گڑ کی طرح بھینگتی رہتی۔ کئی مرتبہ دوا اپنی سسکیوں کے درمیان جیسے کو ہلکی ہلکی آوازیں دے کر بلا تے کہ ”لے یہ ماسٹر بانی کو دے آ۔“ ”اٹھ جیابہ بانی کو بیچت کر آ۔“ پر جسے کو اپنے تن بدن کا ہوش نہ ہوتا اور وہیل پر بڑی فخر کی طرح ناک اور سختوں سے آوازیں لگالے جاتا۔ مجھے یہ سب اس لیے معلوم ہے کہ صبح سویرے میں بھی چوک میں جاتے لگا تھا اور قریب ہی لالہ رام چند ہراف کے پھٹے پر بیٹھ کر آسا کی وار سننے لگا تھا۔ اس وار کے آخر میں سرکار کچھ سر میں ایسی لگاتے تھے جو میری سمجھ میں نہیں آتی تھیں۔ جوڑ تو راگ کے اندر لگتا تھا پر سرتیاں کچھ باہر کی ہوتی تھیں جیسے زمین پر چلتے چلتے کوئی سواری ہوا میں اڑنے لگے اور ہلکی سی بڑھت کے بعد پھر زمین پر لینڈ کر جائے۔ یہ بات پوچھنے کا مجھ میں حوصلہ نہیں تھا پر جاننے کیلئے ہر وقت بے چین رہتا تھا۔

مستری دان سنگھ میرے صاحب کا بڑا اچھا پار تھا۔ منہ پھٹ کافی اجڑا غلیظ گفتگو کار سیما۔ علم سے کور اور رلہ چلتوں سے انحصار کرنے کا عادی۔ لیکن حالات حاضرہ پر ایسے اچھے کبت جوڑتا تھا کہ جس دکان پر جا کر بیٹھتا لوگوں کے ٹھٹھ لگ جاتے اور سننے والے تالیاں بجا بجا کر اس کے کبتوں کی تان اٹھاتے۔ کارنت کو وہ پھونکتی کہتا تھا۔ جب بھی ماسٹر صاحب کے چوبارے پر آتا سب سے پہلے یہی پوچھتا ”او بھئی۔“ کو حرا ہے تیری پھونکی۔ ایک دو پھونکیں مار کر ہمارے سینے کی انگلی ٹھسی بھی لگا دے ایک پر اٹھا ہم بھی سینک لیں۔“ ماسٹر صاحب اس کی باتیں سن کر بہت خوش ہوتے اور اس کے لئے نیچے سے سوڈا اور ضرور منگواتے۔ مستری دان سنگھ گرمی سردی ایک کچھا اور ایک لمبا کرت پہن کر گھوما کرتا۔ پاؤں میں

بغیر قمیص کے فلیٹ بوٹ اور سر پر پگڑی کے بجائے ہاتھ بھر لمبا صاف۔ سر کا جوڑا ہمیشہ ڈھیلا اور گردن کے کیس کھلے۔ بدن سے کبھی ناٹکی کی خوشبو آتی کبھی دیار کی۔ جب کاٹھ کا کام نہ کر رہا ہوتا تو جسم سے کچے گارے کی پھینک آیا کرتی جیسے کوئی کوٹھالیپ پوت کر ابھی اٹھایا گیا ہو۔ اپنی بیوی ہردئی سے بہت ڈرتا تھا جو اس کو ڈوٹی سے اور چھٹے سے مارتی اور گھر سے باہر نکال کر اندر سے دروازہ بند کر لیتی تھی۔ دو تین مرتبہ ہردئی نے ڈانگ لے کر خوب اس کی ہڈیاں سنگتی تھیں لیکن زخموں چوٹوں کی تاب نہ لاکر زندہ بچ گیا اور معافی مانگ کر پھر اپنے گھر چلا گیا۔ اصل میں مستری دان سنگھ ٹھکر کے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اپنے اڑے کے سامنے سے گزرتی ہوئی عورتوں پر ایسا ذمہ داری تھا کہ وہ دودھ پڑا دیتی سیلا کرتیں ہردئی کے پاس نکالت لے کر آتیں۔ ہردئی بات کی تحقیق کے بغیر سونالے کر اندر سے نکلتی اور کام پر بیٹھتے مستری کی ہڈیاں توڑنے لگتی۔ وہ اٹھ کر بھانٹا تو ہردئی لاریوں کے اڑے تک اس کا پیچھا کرتی اور آستینیں چڑھا کر جو کچھ اس کے منہ میں آتا بکے جاتی۔ لوگ اکٹھے ہو کر ہردئی کا ٹھکانا سننے اور تالیاں بجا بجا کر ”شاوا تانی۔ شاوا تانی“ کے نعرے مارتے۔ اس مارا ماری اور زور زور کی میں ایک مرتبہ مستری دان سنگھ پر قتل کا مقدمہ بھی بن گیا تھا اور دو تین سال سیشن سپردگی کی قید کٹ کر بڑی مشکل سے رہا ہوا۔ اس خوفناک مقدمے سے دان سنگھ کی رہائی بھی میرے صاحب کی بدولت ہوئی تھی اور وہی اس کو چھڑا کر لائے تھے۔

ہوا یوں تھا کہ ایک مرتبہ مستری دان سنگھ نے گھریلو جھگڑوں سے تنگ آکر اور ہردئی کے ہاتھوں بھرے بازار میں ڈھیل ہونے کے بعد خود کشی کا پروگرام بنایا اور گلے میں رسہ ڈال کر پھانسی لینے کے سارے انتظامات مکمل کر لئے۔ ایک روز جب ہردئی دربار صاحب ہاتھ دیکھنے گئی ہوئی تھی مستری دان سنگھ نے اپنے اوزاروں والے صندوق سے پھانسی کا مونارہ نکالا اور اسے اپنے کوٹھے کے بڑے شہتر میں ڈال کر پہلے تو دو جھونٹے لے کر اس کی مضبوطی کا معائنہ کیا پھر سٹول پر چڑھ کر اس میں گول پھندے کی کاٹھ ڈالی۔ ساتھ ہی ایک چھونٹے رسے کے سرے کو پھندے کے ساتھ اس طرح پیوست کیا کہ گردن پر کھینچنے پر پڑے اور وجود آرام کے ساتھ لٹکا رہے۔ دیکھنے والوں کو یوں لگے کہ پھانسی لگ چکی ہے پر لٹکا ہوا وجود مزے سے سانس لیتا ہے اور آنکھوں کی جھری میں سے حالات کا جائزہ لیتا جائے۔

مستری دان سنگھ بڑا کارگر اور مکینکل ذہن کا آدمی تھا۔ اپنے محفوظ پھندے میں دو مرتبہ گردن ڈال کر اس نے فرائی لی اور کامیابی کے ساتھ نیچے اتر آیا۔ اسے یقین تھا کہ جو ٹھنی

ہر دلی دربار صاحب سے واپس آکر کوٹھے کا دروازہ کھولے گی پہلے ایک زور کی چیخ مارے گی پھر اونچے اونچے بین کرنا شروع کر دے گی۔ لوگ اس کے بین سن کر اس کے گھر کی طرف بھاگیں گے اور وہ در و در اور اپنے گھر والے کی لاش کی طرف ہاتھ اٹھا اٹھا کہے گی ”مجھے کیا پتا تھا ان سنگھ کا تو اتنا بڑا فیصلہ کر لے گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ تو میرے دکھوں کے ہاتھوں جان دے دے گا۔ میری اپنی کرنی سے مارا جائے گا۔ میرے ظلم سے شہید ہو جائے گا۔ دے میرے سوئے یا شاہ۔ میرے راتھا میرے دریا میاں۔ آخری باری مجھے معافی تو دیتا جا میرے قصور تو معاف کرتا جا۔“ پھر وہ بیہوش ہو کر گر پڑے گی اور عورتیں اسے پٹکھا جھلتے ہوئے منہ پر ٹھنڈے پانی کے تڑے دے دینے لگیں گی۔ لوگ دھڑکی سے دسہ کلاٹ کر میری لوتھ زمین پر اتاریں گے کچھ چٹے کی مالش شروع کر دیں گے کچھ ڈاکٹر کی طرف بھاگیں گے اور باقی کے ہر دلی کو تسلی دینے میں لگ جائیں گے۔

جب ہر دلی کے گوردوارہ صاحب سے واپس آنے کا وقت قریب آیا تو دان سنگھ واہگر وکانام لے کر پھانسی کے پھندے سے لٹک گیا اور لاش مار کو سٹول پر سے گرا دیا۔ ابھی اسے پھانسی پر لٹکے ڈیڑھ دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ ہر دلی کی جگہ دو سوت کرپو اپنی سیملی کو آوازیں دیتی ہوئی اندر داخل ہوئی۔ جب کرپو نے بھاپاتی کی ”لاش“ گوردے سے لٹکے دیکھا تو اس نے زور کی ایک چیخ ماری اور باہر بھاگ گئی۔ باہر جا کر کرپو نے نہ تو کوئی واویلا کیا اور نہ ہی دوسری چیخ مار کر لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ وہ آرام سے پھر کوٹھے کے اندر گئی اور بھاپاتی کی لاش کو دیکھنے لگی۔ بھاپاتی کی زبان باہر نکلی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ کرپو کی سے بندھے تھے اور دونوں ٹانگیں چپے کی طرح کھلی ہوئی تھیں۔ سرخ سرخ آنکھوں کے ڈھیلے اوپر کو چڑھ گئے تھے اور بھاپاتی کے ہونٹوں پر جھاگ کا ایک چھوٹا سا پھوسکا گیا تھا۔

کرپو نے جلدی جلدی ہر دلی کا سامان اٹھانا شروع کر دیا۔ شیشے کا جگ الماری میں رکھی ہوئی تلے والی پیسوں والی پٹاری اور بادام روغن نکالنے والی مشین۔ یہ ساری چیزیں جمع کر کے جب وہ فرش پر چادر بچھا کر ان کی گھڑی باندھ رہی تھی تو مستری دان سنگھ کو پھانسی پر لٹکے لٹکے بڑا غصہ آیا۔ اس نے گھڑی باندھتی کرپو کے چوتھوں پر زور کا ایک ٹھٹھا مارا اور ساتھ ہی اونچی آواز میں ماس کی گالی دی۔ لاش سے ٹھٹھا کھا کر اور ماس کی گالی سن کر کرپو اوندھے منہ فرش پر گری اور اس نے وہیں پران دے دیئے۔ تھانے والے مستری دان سنگھ کو گرفتار کر کے لے گئے اور اس پر کرپو کے قتل کا مقدمہ بن گیا۔

گرمیوں کی ایک جتنی دوپہر میں پرانی منصفی کے پاس بھجور والی گلی کے دہانے پر ایک نوجوان لڑکی نے میرا دستہ روک کر کہا ”وہ میرا ایک کام کر دے گا۔“ میں اس لڑکی کے قد بت، شکل و صورت اور موہنی چھپ کو دیکھ کر سکتے میں آ گیا اور اس کے سامنے یہ تو فوں کی طرح ہکلا نے لگا۔ اس نے پھر بڑی الجاست سے کہا ”میری بات مانے گا۔“

میں نے منہ پکا کر کے کہا ”کیا بات ہے بی بی؟“
کہنے لگی ”مجھے ماسٹر بالی سے ملا دے گا۔“

اپنے استاد کا نام اس خوبصورت لڑکی کے منہ سے مجھے بیٹھا بیٹھا سا لگا اور میں نے اعتدال بھرے لہجے میں کہا ”کیوں نہیں ضرور ملا دوں گا۔ تو ہر ایک سے مل لیتے ہیں۔“
اس نے کہا ”میں چنڈت شکر داس کی بیٹی ہوں اور میرا نام رجنی ہے۔ میں نے دیو کے بیاہ میں ماسٹر جی کو باجہ بجاتے دیکھا تھا اور ان کو پر نام بھی کیا تھا لیکن انہوں نے میرے پر نام کا جواب صرف سر ہلا کر دیا تھا کوئی بات نہیں کی تھی۔ تو میری ان سے بات کر دے گا؟“
میں نے کہا ”میں بات تو کرادوں گا پر تجھے یہ کیسے پتہ ہے کہ میں ان کو جانتا ہوں۔“
کہنے لگی ”میں نے تم کو اکثر ان کے پاس آتے جاتے اور ان کی میز چیاں چڑھتے دیکھا ہے۔ تم ان سے باجہ بجاتا سیکھتے ہو؟“
”باجہ نہیں“ میں نے چڑ کر کہا ”میں ان سے کلارنٹ سیکھتا ہوں۔ وہ باجہ نہیں بجاتے کلارنٹ بجاتے ہیں۔“ رجنی اپنی غلطی پر شرمندہ سی ہو گئی۔

میں نے کہا ”تم کب ان سے ملنا چاہتی ہو؟“
کہنے لگی ”جب بھی وہ ملنا پسند کریں۔“

”ان کے چوبارے میں آسکتی ہو؟“

”بازار میں آنا تو میرے لیے مشکل ہے البتہ انہیں کسی اور جگہ ضرور مل سکتی ہوں۔“

”کسی اور جگہ وہ آنا پسند نہیں کریں گے۔“

”تو پھر جو فی جگہ وہ پسند کریں وہاں آسکتی ہوں۔“

”تمہارے گھر والے تو ناراض نہیں ہوں گے۔“

”وہ تو ضرور ناراض ہوں گے اور اگر انہیں پتہ چل گیا تو میرا گھر سے لکھنا بھی بند کر دیں گے۔“

”پھر تو مشکل ہے۔“

”کیوں؟ مشکل کیوں ہے؟“

”مشکل اس لیے کہ شاید سرکار بھی اس کو پسند نہ کریں۔“

”اسی لئے تو میں نے تمہارے آگے واسطہ ڈالا ہے۔ تم چاہو گے تو سرکار ضرور پسند کر لیں گے۔“

میں نے کہا ”میں پکا وعدہ نہیں کرتا البتہ کوشش ضرور کروں گا۔۔۔۔۔ لیکن تم ان سے مل کر کیا کرو گی؟“

”میں ان کو دیکھوں گی۔“

”کوئی بات نہیں کرو گی؟“

”نہیں۔“

”پھر کیا فائدہ ادا کیے تو انہیں تم کہیں بھی سکتی ہو۔“

”اس دیکھنے اور اس دیکھنے میں بڑا فرق ہے۔ میں انہیں پاس سے دیکھنا چاہتی ہوں۔“

یہ کہہ کر وہ خاموش ہو گئی اور سر جھکا کر اپنے پاؤں دیکھنے لگی جس میں مبینہ سڑپ والی سبک سی چٹلی سی تھی اور انگوٹھوں کے پاس سرس کے پھولوں جیسے ادن کے دو پھل تھے۔ جب ادھر سے کرم دین کہہ رہے تھے کہ گھر پر نمودار ہوا تو وہ ہولے سے خستہ کہہ کر آگے کو روانہ ہو گئی۔

میں رات بھر دیوار سے ڈھونڈ کر اس لڑکی کے بارے میں سوچتا رہا جس کو کئی سال پہلے میں نے سکول سے آتے جاتے دیکھا تھا لیکن اس کے بارے میں کبھی سوچا نہ تھا۔ کسی سے گفتگو کرنے کے بعد آدمی اس کے بارے میں سوچنے بھی لگ جاتا ہے اور سوچ گھٹکے سے

بہت آگے بڑھ جاتی ہے۔ اس میں ایسی ایسی باتیں آ جاتی ہیں جو لمبی لمبی کہانیوں سے بھی طویل ہوتی ہیں اور جن پر سے سے بکے پلوں کی طرح سے گزرا جاسکتا ہے۔ نیچے خوفناک کہانوں والے گھرے گھرے غور پچاتے جھاگ اڑاتے دریا ہوتے ہیں اور گزرنے کے لئے ایک رس پائوں کے نیچے اور دوسرا ہاتھ سے پکڑنے کیلئے ہوتا ہے۔

میرا خیال تھا رجنی کو مجھ سے عشق ہو گیا ہے اور اس نے ماسٹر صاحب کا بہانہ ڈال کر مجھ سے تعلقات بڑھانے کی راہ نکالی ہے۔ اس کے چلتی میرے ابا جی کو بہت اچھی طرح جانتے تھے اور دونوں ہندوستان کی آزادی کے بارے میں ایک دوسرے سے تبادلہ خیال کیا کرتے تھے۔ چنڈت جی کشمیری چنڈت تھے اور غم سے پٹو کا کاروبار کرتے تھے۔ ان کی عورتیں جب شام کو میرے کیلئے باہر نکلتیں تو شہر کے ویران علاقے بھی کشمیر بن جاتے۔ وہ دراز قد بھرے ہوئے جسم سیاہ آنکھوں اور گوری رنگت کی عورتیں تھیں لیکن رجنی ان سب میں خوبصورت تھی۔ اس کے ماتھے پر ایک عجیب طرح کی سرخی تھی جو شام کو اور بھی نمایاں ہو جاتی اور دن کے وقت ہلکی چلی دھوپ کی طرح سر کے بالوں تک پہنچ جاتی۔ اگر کسی کو اس کے ماتھے پر چال رکھنے کا موقع میسر آتا تو اسے اس چلی دھوپ سے زعفران کی خوشبو بھی ضرور آتی

اس روز ماسٹر صاحب نے اپنی بندش کے جس کڑے کا مجھے درس دیا وہ کڑا کچھ اتنا اچھا نہیں تھا۔ جتنی باتیں انہوں نے کہیں دوسری میری پہلے کی سنی ہوئی تھیں اور صبح کے وقت آسا کی جو دارا انہوں نے بھائی اس میں رس کم تھا اور استاد کی زیادہ تھی۔ میں نے ان سے رجنی کی بات کرنا چاہی لیکن کسی نے میرا ہکا بھوک لیا اور میں ان سے بات کیے بغیر ہی واپس چلا آیا۔

جب سے میری رجنی سے ملاقات ہوئی تھی میرے دن اور رات صبحیں اور شامیں تبدیل ہو گئی تھیں اور میری ٹوشن میں رخنہ پڑنے لگے تھے۔ میں نے پرانی مصطفیٰ کے پاس کیکروں سے داتن توڑنے کے بہانے رجنی کی چلی کے چکر لگانا شروع کر دیے تھے لیکن اس کی صورت نظر نہ آتی تھی۔ ایک روز میں نے اس کے گھر کے دروازے سے اندر جھانک کر دیکھا۔ دوسرے سبکی لوگ موجود تھے مگر رجنی نہیں تھی۔ شاید اس کے گھر والوں کو علم ہو گیا تھا اور انہوں نے اس کا باہر لکھنا بند کر دیا تھا لیکن اگر سوچا جائے کہ گھر والوں کو کیا علم ہو گیا تھا تو کچھ بھی نہیں تھا۔ کوئی ایسی بات ہی نہیں تھی جس پر شک گزرتا کہ کسی پر اس کی توجہ ہے یا کسی کے ساتھ میل ملاقات

ہے یا کوئی اشارہ کنایہ ہے۔

دراصل میرے دل کے اندر ایک چور سا گھس گیا تھا جو نہ سامان اٹھا کر جاتا تھا اور نہ چوری کرنے پر آمادہ ہوتا تھا۔ میرے گھر کے اندر بیٹھا گھر کا ایک فرد سا بیٹا جا رہا تھا اور مجھ پر حکم چلا رہا تھا۔ میں ڈر کے مارے کسی کو اطلاع بھی نہ کرتا تھا کہ میرے گھر کے اندر ایک چور گھس آیا ہے اور گھر کا مالک بن گیا ہے۔ نکال اس لیے نہ سکتا تھا کہ اس کے چلنے کے بعد گھر کے ویران ہو جانے کا اندیشہ تھا۔ ایک عجیب طرح کی الجھن تھی جس نے مجھے بے حال کر دیا تھا اور میں خالی خالی سا ہو گیا تھا۔ ماسٹر صاحب نے کئی مرتبہ مجھ سے اس ویرانی اور بے سرو سامانی کا سبب پوچھا تو میں نے یہ کہہ کر نال دیا کہ میرا سزا بھانٹنے میں دل نہیں لگتا اور میں اس کام کو چھوڑ رہا ہوں۔ انہوں نے کہا ”ریاض کرنا چھوڑ دو لیکن ملنا ملنا تو رکھو۔ تم تو اب ملتے بھی نہیں ہو۔“

میرے لیے ایسے شخص سے ملنا ہی مشکل ہو گیا تھا جو میری راہ کا پتھر بن گیا تھا اور مجھی کو خوفزدہ کیے جا رہا تھا بھلا کوئی استاد اس طرح کا بھی ہو سکتا ہے جو اپنے ہی شاگرد کی بساط لپیٹ کے کونے میں رکھ دے اور اسے ہونے سے نہ ہونا کر دے۔

رجنی مجھے اچھی ضرور لگی تھی لیکن میں اس کے عشق میں مبتلا نہیں تھا۔ بیماری بیماری ضرور تھی پر میری محبوب نہ تھی۔ بے شمار خوبیوں کی مالک تھی لیکن اس کا یہ عیب بہت بھیانک تھا کہ وہ ماسٹر صاحب سے ملنا چاہتی تھی۔ ملتے میں بھی شاید کوئی خرابی نہ تھی لیکن وہ ان کی داسی بن کر رہنا چاہتی۔ رہنا کیا چاہتی وہ اندر ہی اندر ان کی داسی بن چکی تھی۔ اب یہ کوئی اچھی بات تو نہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کا غلام بن جائے۔ اس کی پوجا کرنے لگے۔ اس کے ہاتھ میں اپنی ذات کی مہار بکڑا دے۔ آخر خوداری بھی تو کوئی چیز ہے۔ خودی کا بھی تو ایک مقام ہے۔ یہ کیا ہوا کہ انسان ہو کر دوسرے انسان کے آگے ہاتھائی ٹیک دیا۔ اس کے آگے اپنا سب کچھ پامال کر دیا۔ آخر ایک حد ہوتی ہے ا

جب میں دس بارہ روز تک ماسٹر صاحب کے چوبارے پر نہ گیا تو ایک روز وہ مجھے گھر ملتے آ گئے۔ میں نے انہیں گھر کے دروازے پر ہی یہ کہہ کر نکال دیا کہ میرے گھر والے اس میل ملاقات کو پسند نہیں کرتے جس روز مجھے ضرورت ہوگی میں خود آ جاؤں گا۔ وہ میرے اس رویے سے دل برداشتہ ہو کر واپس چلے گئے اور پھر ہمیں نہ بھر میری ان سے ملاقات نہ ہوئی۔ ایک مرتبہ بازار میں ملے تو اوپر اوپر ہر کی باتوں کے بعد وہ اپنی راہ چلے گئے اور میں اپنے

گھر آیا۔

لیکن کبھی یہ ہو سکتا ہے کہ بیٹھے بٹھائے محبوب رقیب بن جائے اور راحت جاں کلفت جاں کا روپ اختیار کر لے۔ عشق بلا خیر کا ساگر سوکھ جائے اور زمین بیخ کر چڑیوں میں تبدیل ہو جائے۔ ٹھنڈی نرم ہوا کے جھوکے لودینے لگیں اور بدن کے اندر آبلے پڑ جائیں۔ ہنستے اتے گھر میں آجیں اور کراہیں داخل ہو کر سارے ماحول کو ماتم کدے میں تبدیل کر دیں اگر پہلے اس طرح سے کبھی نہیں ہوا تو میرے ساتھ ضرور ہوا حالانکہ رجنی سے نہ تو مجھے عشق تھا اور نہ میں اسے اچھی طرح سے جانتا ہی تھا۔

اپنے رویے پر نامور اور اپنے عمل سے شرمندہ جب ایک گہری شام میں رہ رہے ہوئے گلے اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ماسٹر صاحب کی سیڑھیاں چڑھا تو رجنی میرے والے موڑھے پر بیٹھی ماسٹر صاحب سے باتیں کر رہی تھی۔ اس کا چہرہ خوشی سے مہک رہا تھا اور سارا وجود تمیاش ڈوبا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر چپک کے بولی ”ویرانی آپ نے تو اپنا وچن پورا نہ کیا آج میں امت کر کے خود ہی آ گئی۔“

میں نے کہا ”میں ماسٹر صاحب سے بات کرنے والا ہی تھا لیکن تم نے مجھے مہلت ہی نہیں دی۔“

مہلت کا لفظ سن کر وہ خوب ہنسی اور مضار کر بولی ”آپ کی مہلت میں تو چاہے ہند امر ہی جائے۔ اتنی لمبی مہلت“ ماسٹر صاحب نے کہا ”یہ بادشاہ آدمی ہے اور بادشاہوں کی مہلتیں لمبی ہی ہوا کرتی ہیں۔“ پھر انہوں نے کرسی کی طرف اشارہ کر کے مجھے بیٹھنے کیلئے کہا لیکن میں بیٹھا نہیں اسی طرح کھڑا رہا۔

رجنی کہنے لگی ”سرکار ہم دونوں کا کچا ٹیشن ہے آج گورو پریم میں یہ بڑھا ہوا ہے کل میں اس سے بڑھ جاؤں گی۔“ ماسٹر صاحب دھیرے سے بولے ”پریم کا دعویٰ وہ کرے جسے باقی رہنا ہو۔ یہ سب تو بس کھیل تماشہ ہے۔ کھیل کھیلے تماشا کیا اور چلے گئے۔“

رجنی نے کہا ”کھیل بھی کوئی کوئی ہی کھیل سکتا ہے۔ گورو جی اور تماشا کرنا تو بہت ہی مشکل بات ہے۔ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔“

اس کی یہ فلسفیانہ بات سن کر میں چڑسا گیا اور خند میں آ کر بولا ”ہر کوئی تماشا کر سکتا ہے یہ کوئی مشکل بات ہے۔“ اور جب میں جانے کیلئے بلکا تو میری طرف دیکھ کر بولی ”ویرانی مجھے ساتھ لے کر اتنا۔ اکیلے جاتے ہوئے مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”اکیلے آتے ہوئے ڈر نہیں لگا تھا؟“ میں نے پوچھا۔
”نہیں۔“

”پھر جلی بھی اسی طرح چاند اسے میں کو ناسمندر پر مٹا ہے۔“

”ٹھیک ہے“ اس نے بے پروائی سے جواب دیا اور ماسٹر صاحب نظریں اٹھا کر میری طرف دیکھنے لگے۔ ان کے چہرے پر نہ کوئی خوف تھا نہ ملال۔ نہ ہی ان کو اس بات کا اندیشہ تھا کہ کوئی میز حیاں چڑھ آئے گا تو کیا کہے گا۔ اٹھے اور اٹھ کر اندر سے لاکھ کا ایک کنگن نکال لائے۔ رجنی کو دے کر بولے ”تم پہلی دفعہ آئی ہو تمہارے لئے کوئی سوغات تو ہونی چاہیے۔“

رجنی نے کنگن لے کر پہلے تو ماتھے سے لگایا پھر پیٹا اور آنکھوں سے لگا کر بولی ”یہ تو ماتھے کا جھومر ہے ہاتھ میں تو نہیں پائوں گی۔“

ماسٹر صاحب نے مسکرا کر کہا ”کچھ بھی نہیں فقیروں کا کڑا ہے۔ کڑا بھی کیا بس کھیل تھا شاہ۔ پہننے کی کوئی ضرورت نہیں۔“

میں ماسٹر صاحب کو ہاتھ سے بچھڑنے سے سلام کا اشارہ کر کے میز حیاں اتر گیا۔ نیچے لچھو اپنی دکان بڑھا رہا تھا اور پچھنے جو ڈر دروازہ بند کر رہا تھا۔

۳

اب مجھ پر اخلاقیات کا بھوت سوار ہو گیا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ رجنی جو ایک حالی نسب اور مہاپنڈت گھرانے کی لڑکی تھی اس طرح خراب و خوار ہوتی بھرے اور ایک بھستری کے عشق میں مبتلا ہو جائے۔ مجھے ماسٹر ہالی سے زیادہ اس اخلاقی لڑکی پر غصہ آتا تھا جو اپنے پر پوار اور لوک لالچ کی پروا کئے بغیر منہ اٹھا کر چوبارے پر آگئی تھی اور بے فکری سے ایسے باتیں کر رہی تھی جیسے اپنی موسیٰ کے گھر بیٹھی ہو۔

رات بھر میں انگاروں پر لو قمار ہا اور اٹھ کر پانی پیتا رہا۔ اگر وہ میرے گھرانے کی لڑکی ہوتی تو اب تک میں نے اس کا گلا گھونٹ دیا ہوتا لیکن وہ ایک غیر ذات اور غیر گھرانے کی لڑکی تھی اس لئے میں نے مناسب یہی سمجھا کہ اس کا گلا گھونٹنے کے بجائے اس کے گھر والوں کو اطلاع کر دی جائے اور ان کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔

میں نے کتابوں میں پڑھا تھا اور اپنے بزرگوں سے بھی یہی سنا تھا کہ مصیبت کے وقت دوسروں کی مدد کرنی چاہیے اور مشکل میں ان کے کام آنا چاہیے۔ ہمارے شہر میں دوسروں کی بروقت مدد کرنے والے اور بھی بہت سے لوگ تھے جن کا زیادہ تر یہی کام تھا کہ وہ لوگوں کو آنے والی مصیبتوں سے آگاہ کرتے رہتے اور ان کے گھر یلو مسائل سلجھاتے رہتے۔ یوں تو ہمارے قصبے میں چھ سات وکیل بھی تھے لیکن وہ فیس لے کر مسائل سلجھایا کرتے اور ان کی فیس کافی زیادہ ہوتی پر وہ لوگ جو بغیر فیس کے یہ ڈیوٹی سرانجام دیتے ان کے مقام دیکھوں سے بلند تھے اور ان کے درجے عام آدمیوں سے اونچے تھے۔ آدھا قصبہ ان کی وجہ سے عذاب میں مبتلا تھا۔

جب میں نے رجنی کے گھر جا کر اس کی ماں سے اس صحیحہ صورت حال کا ذکر کیا تو اس نے ہاتھ باندھ کر کہا ”تو میرے بیٹوں جیسا ہے اور مجھے انہی کی طرح پیارا ہے اس کا تذکرہ کسی اور

سے نہ کرنا نہ ہی چڑت جی کو بتانا میں یہ سارا کام خود سنبھال لوں گی۔" جب میں وعدہ کر کے چلے گا تو اس نے میرے سر پر پیار دیتے ہوئے کہا مگر پھر کبھی رجی اور عرصہ جائے تو فوراً آکر مجھے اطلاع کرنا اور اطلاع کرنے کیلئے کوئی بہانہ بنا کر آنا۔" میں نے سچے دل سے درگامی سے اس نیک کام کی ہائی بھری اور اپنے گھر چلا آیا۔ میرے سینے سے پہاڑ جیسا بوجھ کم ہو گیا تھا اور میں ایک انجانی خوشی سے ابابیل کی طرح فضاؤں میں تیرنے لگا تھا۔ کبھی کبھی کچھ نیک کام انسان سے ایسے بھی سرانجام ہو جاتے ہیں کہ اسے پتہ بھی نہیں چلتا کہ اس کے لئے جنت کا ایک دروازہ کھل گیا ہے اور اندر سے ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا آرہی ہے۔

اس ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا کے پیچھے گرمیوں کی چھٹیاں تیزی سے گزر رہی تھیں اور میرے کان جانے کا وقت قریب سے قریب تر آرہا تھا۔ ماسٹر صاحب سے سبق لینے اب میں نے پھر قاعدگی سے جانا شروع کر دیا۔ اس لیے نہیں کہ مجھے سبق میں کوئی دلچسپی تھی بلکہ ماسٹر صاحب مجھے اچھے لگتے تھے بلکہ صرف اس لیے کہ میں درگامی سے اپنے وعدے کا پالن کرنا چاہتا تھا اور اپنے وطن پر سختی سے قائم تھا۔

ایک مرتبہ جب ماسٹر صاحب نے قدرے ترشی سے کہا کہ ساری سکھائی ہوئی کاپی پڑھا نہیں ہے کہ آگے پیچھے مجموعہ کر دو تین دن میں یاد کر لیا۔ اس کے لئے محنت کرنی پڑتی ہے اور ساری عمر کا ریاض اپنا پڑتا ہے تو میں نے ہنس کر ماسٹر صاحب کو یقین دلادیا کہ میں اس کام کے لئے کچھ زیادہ سنجیدہ نہیں ہوں۔ یہ تو بس ایسے ہی میری وقت کئی کا ایک بہانہ ہے۔ ماسٹر بالی کو میری اس بات کا دکھ تو ہوا لیکن وہ خاموش ہو گئے۔ پلٹ کر کچھ کہا نہیں۔

چھٹیاں ختم ہونے سے کوئی ایک ہفتہ پہلے عید میلاد النبی کے روز ہم نوجوانوں نے جامع مسجد کے گرد سونے کے میزوں کو بالٹیوں سے پانی اچھال اچھال کر دھویا۔ مشکیں بھر بھر کر سارے ارد گرد کو خوشنواں کیا۔ پھر مسجد کے دروازے سے کوئی سو فٹ جگہ چھوڑ کر بہتر شاخوں اور کیلے کے تنوں کا دروازہ بنایا۔ اس پر سبز جھنڈیاں اور سنہرے پھول لگائے۔ مسجد کے باہری احاطے میں سٹیج بنا کر اور لوگوں کے گھروں سے دریاں اور کھیں منگوا کر زمین پر بیٹھے کا بندوبست کیا۔ انجی دنوں ہمارے شہر میں سڑک کو نئے کا انجن آیا تھا جو پرانی اور شکستہ سڑکوں کی مرمت پر مامور تھا۔ جب یہ انجن آگے پیچھے چلتا تو اس کے ہر لوگوں کا ایک بڑا ٹھوم ساتھ ساتھ حرکت کرتا۔ انجن ڈرائیور نذر حسین ٹھٹھریا لے ہالوں والا ایک عاشق مزاج نوجوان تھا جس کی کلائی سے موٹے نمبروں والی گٹ گھڑی بندھی تھی اور جو اپنے ہاتھ

بازو کی آستین بغل تک لپیٹ کر رکھتا تھا۔ نذر حسین کو سڑک پر سے گزرتی ہوئی عورتوں کے علاوہ سکول کی جوان لڑکیاں بھی رک کر دیکھتیں اور اس سے بات کرنے کی آرزو ساتھ لے کر چلی جاتی تھیں۔ دراصل نذر حسین میں اتنا کوئی کمال نہیں تھا سارا اس کی مشین کا چارو تھا جو عجیب گڑگڑاہٹ کے ساتھ آگے پیچھے چلتی تھی اور جس پر تین سے تینوں بچیوں پر لگا کر پانی چھوڑتے ساتھ ساتھ چلتے تھے۔ یہ سچے بھی ہمارے شہر کے جانے پہچانے سنے تھے لیکن مشین کے ساتھ کام کرنے کی وجہ سے ان کے اندر اپنی اہمیت کے قہقے سے روشن ہو گئے تھے۔ اپنی آسانی کیلئے آپ یوں سمجھ لیں کہ نذر حسین کو ایک جیٹ پامیل تھا جس کے کڑوں میں تین سچے شامل تھے۔ ان چاروں کی وجہ سے مشین چلتی تھی اور اس ایک مشین کی وجہ سے یہ چاروں زمین سے دودھ پاشت اوپر چل رہے تھے۔

اس روز نذر حسین نے انجن چلانے کی چھٹی کر دی اور سٹیج پر آکر جس خوش الحانی سے نعت پڑھی اس کے سامنے منظر سے منگوائے ہوئے دونوں نعت خواں ملے ہوئے۔ سڑک کو نئے کے انجن کا ڈرائیور ہونے کی حیثیت سے وہ ہیر و تو پہلے ہی تھا اب سب کی آنکھوں کا تارا ہو گیا۔ اب لوگ اس کے ساتھ ساتھ بھاگا کرتے تھے۔ سارے میں ایک عجیب سی کیفیت پیدا ہو گئی اور کچھ انجن کے ساتھ ہی طرح کا سا بندھ گیا۔ ہمارے قہقے نے پہلی مرتبہ ایک آرٹسٹ دریافت کیا اور اس کے دروہام نقارے لہریز ہو گئے۔

شام کے وقت مغرب کی نماز سے پہلے ماسٹر بالی اپنی کلف لگی شلوار قمیض پہنے، خس کا حشر لگائے، کالی سیاہ ریشمی نائی والی کالی سیاہ گرگالی پہنے جو بارے سے اترے اور آکر سیدھے مسجد کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ اس شاخوں، ٹہنیوں، پھولوں والے دروازے کے سامنے جس کے ساتھ کیلے کے بیڑ گاڑے ہوئے تھے۔ اس دروازے اور ماسٹر صاحب کے درمیان بس ایک سڑک تھی جس پر ٹریک رواں تھا۔ اس دروازے سے سوڑیڑھ سو فٹ پرے مسجد کا دروازہ تھا۔ مسجد کے دروازے سے تقریباً آٹھ سو فٹ پر ماسٹر صاحب کھڑے ہو کر خطبہ دیا کرتے تھے۔

سڑک کے اس پار مسر سبز شاخوں والے دروازے کی طرف اپنی کلارنٹ کا رخ کر کے ماسٹر بالی نے اپنی خوبصورتی کالی گرگالی اتاری اور اپنے دھلے دھلائے سبک سے پاؤں زمین پر رکھ کر عید میلاد النبی کی شان میں ہسنت بہار بھائی شروع کر دی اور تھوڑی دیر کے بعد بیخود

سے ہو کر دائیں بائیں بھٹکنے سے لگے۔ میں نے ان کو مشکل مشکل راگ اور پیچیدہ راگنیاں بجاتے سنا تھا لیکن ان کی ناک کا بانسہ جہاں ستواں ہو جاتا تھا وہیں رہتا تھا نہ سر کو جھنسن ہوتی نہ کندھوں کو نہ کہنیوں کے زاویے میں فرق آتا نہ چہرے پر کوئی اتار چڑھاؤ پیدا ہوتا۔ نہ آنکھیں بند ہوتیں نہ ان کے ڈورے سفید ہوتے۔ سارا بت جامد رہتا بس ایک انگلیوں میں حرکت ہوتی اور وہی سارے وجود کو زندگی اور حرارت عطا کئے جاتی۔ لیکن اب سارا ٹریک رک گیا تھا۔ لوگ اپنی اپنی جگہوں پر ساکت ہو گئے تھے۔ ایک ٹہک جو بھنگ پی کر اور سکوار نکال کر اٹھکیاں کر رہا تھا پتھر کے بت کی طرح ہاتھ باندھ کر قبیلہ رو کھڑا ہو گیا تھا اور تھوڑی تھوڑی دیر بعد "ست نام سری وانگورو۔ ست نام سری وانگورو" کی آواز نکالتا تھا اور پھر خاموش ہو جاتا تھا۔ ایک ایک چیز رک گئی تھی۔ لوگ 'ٹریک' زمین 'ہوا' وقت ہر شے ساکت ہو گئی تھی صرف ماسٹر بالی دائیں بائیں جھوم رہے تھے اور ہر لے ہر خالی اور ہر تان کے ساتھ لپک رہے تھے۔ اصل میں وہ قربان ہو جانا چاہتے تھے اور ہو نہیں پاتے تھے۔ غار ہونے کی کوشش کر رہے تھے اور ان سے جگہ نہیں بن رہی تھی۔ وہ اس کھیل میں مر جانا چاہتے تھے لیکن ذمہ کھڑے تھے اور قماش بنے ہوئے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ جی اپنے گھر سے نکلے پادس بھاگی آ رہی ہے۔ اس کے سر پر ایک موٹی سی پھلکاری تھی جس میں اس کا چہرہ تانبے کی طرح چمکتا ہوا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔ حالانکہ اس کا گھر مسجد سے کچھ ایسا دور نہیں تھا۔ وہ آئی اور آکر ماسٹر صاحب کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ اتنی نزدیک جیسے ایک ہی سنے کی دو شاخیں ہوں یا جیسے میاں بیوی ہوں بھائی بہن ہوں 'قریبی رشتہ دار ہوں' گورو دار چیلی ہوں!

مغرب کی اذان سے ٹھیک ایک منٹ پہلے ماسٹر صاحب نے قرآن ختم کیا۔ گرگانی پہنی بیٹھے ہوئے کلا رنٹ کو سر سے بندھا گیر دار و مال انہر کر صاف کیا اور جدھر سے آئے تھے اوھر کو چلے گئے۔

اگلے دن صبح سویرے ہمارے علاقے کی دو جھڑائیاں سردوں پر اپنے اپنے نوکرے اٹھائے کھتی جا رہی تھیں۔ "بامصوں کی بیٹی ہو کر مسجد کے سامنے یوں کھڑی تھی جیسے مسلمان بنی ہوئے۔"

۴

گر میوں کی چشیاں ختم ہو گئی تھیں اور میں دائیں اپنے کالج چاہتا تھا۔ گھر والوں سے رخصت ہو کر جب میں شیشن پہنچا تو ماسٹر صاحب پہلے سے وہاں موجود تھے۔ گو میں نے اپنی روانگی سے متعلق انہیں دن اور وقت سے آگاہ نہیں کیا تھا لیکن وہ ٹاپلی کی چھدری چھاؤں میں کھڑے اپنے چہرے کو بار بار رومال سے پونچھ رہے تھے۔ مجھے اپنی طرف آتے دیکھ کر انہوں نے ہاتھ اٹھا کر سلام کیا اور مسکرا کر بولے "آخر میں نے پتہ لگا ہی لیا کہ تم کس وقت جا رہے ہو۔" میں کھسیانا سا ہو گیا تو میری شرمندگی ٹالنے کیلئے کہنے لگے "وہاں صدر میں کبڑی بازار سے رکن الدین کبڑیئے سے ایک پرانا کلا رنٹ لے لیتا۔ میرا نام لینا اور قیمت کے بارے میں اس سے جھگڑا نہ کرنا۔" پھر انہوں نے اپنی جیب سے ایک پڑیا نکال کر کہا "اس میں دو چٹیاں ہیں۔ لگا کر پرنکس کرتے رہنا اور جب کوئی پی سوکھ جائے یا ٹوٹ جائے تو مجھے خط لکھ کر ایک پی اور منگوا لینا میں لفافے میں ڈال کر بھیج دوں گا۔ لیکن ریاض جاری رکھنا۔" میں نے ان کے ہاتھ سے پیوں کی پڑیا لے لی اور "اچھا جی" کہہ کر گاڑی کے ڈبے میں بیٹھ گیا۔

وہ اسی طرح ٹاپلی کی چھدری چھاؤں میں کھڑے تھے اور رومال سے اپنا چہرہ پونچھ رہے تھے۔

کالج ہمارے ضلع کے صدر مقام میں واقع تھا اور ضلع میرے شہر سے پورے پچاس میل کی دوری پر تھا۔ پچیس میل کے فاصلے پر چھوٹی گاڑی چھوڑ کر برائے گچ کی لائن اختیار کرنا پڑتی تھی اور دو گھنٹے کی مسافت کے بعد آدمی ضلع پہنچ جاتا تھا۔ ضلع اور چھوٹی کے درمیان تین میل کا فاصلہ تھا جو بڑے بزرگ اور مجرم تیس تاسیٹے میں طے کرتے تھے اور لو جو ان سائیکلوں پر آتے جاتے تھے۔ گورو پلشن کے باہر یونین چیک لبر لیا کرتا تھا جہاں دو ٹاپی چہرے پر مامور تھے۔ اس جینڈے کے سامنے سائیکل سے اتر کر چند قدم پیڈل چلنا پڑتا تھا پھر

سائیکل پر سوار ہونے کی اجازت تھی۔

کالج میں تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی شخصیت کو بنانے، سنوارنے اور ابھارنے کیلئے میرے سامنے تین راستے تھے۔ کوارنٹ نوازی میں مہارت پیدا کروں۔ علامہ عیش کی شاگردی اختیار کر کے شاعری میں نام پیدا کروں یا باطن کا سفر اختیار کر کے ایک صوفی اور یوگی کی دھارنہ ادا کروں۔ مہینہ بھر کی سوچ بچار کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے شاعر بننا چاہیے اور اختر شیرانی کو پیچھے دھکیل کر اس کے مقام سے آگے نکل جانا چاہیے۔ میں نے اپنی سائیکل نکال ایک نئی کاپی اور نئی پنسل خریدی اور شاعر بننے کیلئے علامہ عیش کے چال کی طرف چل دی۔ صدر بازار کے دہانے پر ساعتی کاتب خانہ تھا جو لوہی کتابیں بیچنے کے ساتھ ساتھ ٹائٹل اتار کر ایسی کتابیں کرانے پر بھی دیا کرتا تھا۔ میں نے اپنی سائیکل ساعتی کی دکان کے باہر کھڑی کی اور ساتھ والی گلی میں پوجیہ پنڈت رنگھو نندن جی کے آشرم میں چلا گیا۔

بوسیدہ یو واروں والے ٹھنڈے فرش پر ایک پرانی سی دری بھی تھی۔ دس چدرہ آدی چوڑی مارے گیتا کا پانٹھ من رہے تھے اور رنگھو نندن جی تین بڑے گاؤں کیوں کے چوہے میں کنول آسن جمائے گیتا بودھ پر بھاشن دے رہے تھے۔ پانچواں ادھیائے تھا اور پنڈت جی کہہ رہے تھے:

ھے ار جن اکرم سنیاں یعنی کرموں کا تیاگ اور کرم یوگ یعنی کرموں کا کرنا دونوں ہی خوب ہیں مگر دونوں میں سے کرم تیاگ افضل ہے۔

میں نے کچھ سمجھ بھیر جلدی جلدی یہ بھاشن اپنی کاپی پر لکھنا شروع کر دیا۔ یہ وہی کاپی تھی جو میں نے مشق خن کیلئے خریدی تھی اور جسے لے کر میں علامہ عیش کی درس گاہ میں جا رہا تھا۔

پوجیہ پنڈت جی اپنی رانوں پر رکھے ہوئے دونوں پاؤں کے ٹکڑوں پر ہوئے ہوئے ہاتھ مار کر کہہ رہے تھے: "ار جن اکرم سنیاں سے کینہ نہ رکھنے والا اور کسی سے کسی چیز کی خواہش اور اچھیا نہ رکھنے والا لکت ہو جاتا ہے۔ اسے سنیاں کہنا چاہیے، لیکن کرم یوگ کے بغیر سنیاں میں کامیابی محال ہے مگر کرم کرنے والا یوگی اپنے من کی شدھ ہی سے بہت جلد پار برہم کو پالیتا ہے۔"

ھے ار جن اندریوں کی لذت کو اپنا اور ان کی تکمیل کے بعد آئندہ حاصل کرنا دیکھ کا باعث ہیں۔ ایسی لذتیں عارضی ہوتی ہیں اس لئے گیانی ان میں محو نہیں ہوتے۔

پنڈت جی جو کچھ کہتے تھے میں لکھتا جا رہا تھا لیکن میری سمجھ میں خاک نہیں آ رہا تھا کہ اس کا مطلب کیا ہے۔ البتہ جب وہ اشوک کی تشریح کرتے تھے اور ساتھ مثالیں دیتے تھے تو بات آپ سے آپ بھلنے لگتی تھی۔ ان کا بیان اس قدر سحر انگیز تھا اور اردو ہندی الفاظ کی آمیزش ایسی دلکش تھی کہ میں نے شاعر بننے کا اور اختر شیرانی کو شکست دینے کا ارادہ ان کے آسن پر ہی ترک کر دیا اور یوگ ابھیاں کی سکھش کا پائن کر لیا۔ میں اپنی کاپی پر صرف اشلوک لکھتا تھا اور تشریح کیلئے ہر تین گوش ہو کر ان کی بات سنتا تھا۔ جب وہ اس اشلوک پر پہنچے کہ اندریوں کی کامنائوں کی تکمیل کے خیال کو ترک کر کے جو شخص اپنے ابرہوں کے درمیان دونوں آنکھوں کو بٹھا کر پران اور اپان دایو کو براہ رکھ کر پرانیام کرے اس کو نہ تو نیند کا ڈر رہتا ہے اور نہ ہی اس کا دل خواہشات کی طرف دوڑتا ہے اور پرانیام کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔

پھر انہوں نے "اوم" کی گونج میں اپنی دونوں آنکھیں بند کر کے "پرانیام" کا مظاہرہ کیا اور بڑی دیر تک چپ سا دھ کر پرانیام کی مشق بنائی۔ پہلے ان کے دونوں ابرہوں کے درمیان ایک رگ پھڑ پھڑائی اور پھر وہاں ایک گومڑا نمودار ہوا۔ اس گومڑے میں ایک چمک سی پیدا ہوئی اور آہستہ آہستہ یہ دل کی طرح دھڑکنے لگا۔ پھر اس میں تیزی کے آثار پیدا ہوئے اور جب یہ تیزی اپنے عروج کو پہنچی تو اس چڑھاؤ میں اتار آنے لگا اور دیکھتے دیکھتے یہ گومڑا بالکل زائل ہو کر ماتھے کی جلد کے ساتھ ہموار ہو گیا۔ انہوں نے آنکھیں کھول دیں۔ مسکرا کر لوگوں کو دیکھا اور مسکرا کر کے بولے: "پانچواں ادھیائے ختم ہوا کل اسی وقت چھٹے ادھیائے کا پانٹھ ہو گا۔ میری اور سے آپ لوگوں کو جاننے کی آگیا ہے۔"

جب لوگ چلے گئے تو میں کھسکتا کھسکتا پنڈت جی کے سامنے آکر بیٹھ گیا اور سر جھکا کر بولا "مہاراج میں مسلمان ہوں اور پرانیام کی مشق کرنی چاہتا ہوں کیا مجھ کو اس کی اجازت مل سکتی ہے؟" انہوں نے بڑی خند و پیشانی سے اپنی شفقت کا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور کہا "اس میں دین و دھرم کی کوئی قید نہیں بابا۔ یہ تو من کو شانت کرنے کا اور بھگوان سے ملنے کا ایک مارگ ہے۔ پر ہے بڑا کشن اور اس کیلئے ابھیاں کی ضرورت ہے، پر تو یہ ابھیاں دوسری قسم کا ہے۔ تم سے ہو گا نہیں۔"

میں نے کہا "مہاراج میں بڑا خدی اور بیلا انسان ہوں جس کام پر آ جاتا ہوں اس کو پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔ آپ مجھے اس کا پیہ بھاؤ نکالیں میں پورا کر لوں گا۔"

انہوں نے مسکرا کر کہا "یہاں خمد اور ہٹ کا کام نہیں ہے اور نہ ہی یہاں کو شش کے کارن کچھ بنتا ہے۔ اس میں تو بس ایک ٹیم کرنے کی ضرورت ہے اور وہ مشکل ہے۔" میں نے کہا "میں ارسلے کا بھی بہت پکا ہوں اور جو ٹیم ایک مرتبہ کر لیتا ہوں اس کو پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔" کہتے گئے "پھر اس کے لئے تمہیں مرنے کا ٹیم کرنا ہو گا۔ جب تک مرد گے نہیں اس ساگر میں تیر نہیں سکو گے۔ تو تھ تیرے کی زندہ آدمی ڈوب جائے گا" لیکن اس کا مجھ بھاؤ ہے۔

مرنے کا حکم سن کر میں کچھ خوفزدہ سا ہو گیا اور ان کی بات میری سمجھ میں نہ آئی۔ کہتے گئے "تم ایک ڈرے ہوئے اور سبے ہوئے منٹس ہو اور ہر ڈر اور ہر بھٹے کی بنیاد ایک ہی ہے۔ موت! اگر تم اپنے ڈر کے اندر گہرا غوطہ لگا کر پاتال تک جاؤ گے تو وہاں اپنے ڈر کا ایک ہی کارن پاؤ گے۔ موت! اور جب تم موت کو جگ اور ست مان لو گے تو ہر طرح کا خوف دور ہو جائے گا۔ جب تم یہ مجھ جھاؤ گے کہ موت ہی جیون کا راستہ ہے اور موت ہی جیون کا ستر مجید ہے اور تم جتنے ہی موت میں پراہت ہو چکے ہو۔ پھر تم میرے پاس آنا۔" میں ان کی یہ بات سن کر خاموش ہو گیا اور اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر وہ اپنے آسن سے اٹھتے ہوئے بولے "اس منٹار میں ایک ہی کچ ہے اور وہ ہے موت! باقی ساری چیزیں بے وشاش ہیں۔ ہو سکتا ہے ہوں ہو سکتا ہے نہ ہوں۔ ہر موت کے بارے میں تم ایسا نہیں کر سکتے۔ جب یہ ہے اور اوش ہے تو پھر ہر طرح کا خوف اور بھٹے دور ہو جائے گا۔۔۔۔۔ سوچ لو اور فیصلہ کرو اور موت کو اچھی طرح سے جان کر اس سے یاری دوستی کر لو۔ اس سے پرہیز کر لو۔ اس کے دھیان میں گہرے اتر کر اس سے میل ملاپ کر لو۔ پھر تم کو اپنے اصل کا حال معلوم ہو جائے گا اور تمہارا اصل روپ تمہارے سامنے آ جائے گا۔ صوفی لوگ اسی کو مراقبہ موت کہتے ہیں۔"

چند تہی کے منہ سے مراقبہ موت کی ترکیب سن کر میں حیران بھی ہوا اور اس کے ساتھ ساتھ میری پریشانی میں بھی اضافہ ہو گیا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ موت سے شاعری بہتر ہے۔ سر جھکا کر انہیں پر نام کیا اور علامہ عیش کے تال پر چلا گیا۔

جب میں نے ضلعی مشاعرہ میں پڑھنے کے لئے اپنی پہلی غزل علامہ عیش کی خدمت پیش کی تو انہوں نے اسے بغور دیکھ کر اپنے میلے عجبے کے نیچے رکھ لیا اور فرمایا "کل اسی وقت آکر لے جانا اصلاح کروں گا۔" لیکن اگلے روز جب میں وقت مقررہ پر ان کی خدمت میں

حاضر ہوا تو انہوں نے عجبے کے نیچے ہاتھ بچیر کر کاغذ نکالا اور غزل میرے حوالے کر دی۔ لیکن یہ میری غزل نہیں تھی۔ علامہ صاحب نے میری حوصلہ افزائی کے لئے اپنی طرف سے ایک غزل لکھ دی تھی جس میں صرف میرا تخلص موجود تھا۔ جب میں نے معذرت بھرے انداز میں کسی اور کی غزل مشاعرے میں پڑھنے سے انکار کر دیا تو انہوں نے غصے میں آکر کہا "شاعری کرنا تمہارے بس کار وگ نہیں ہے۔ اگر تم سو سال تک بھی اس میدان میں جھک مارو گے تو کامیاب نہیں ہو سکو گے۔ تمہاری طبیعت موزوں نہیں ہے اور تمہارا ذہن وزن کی باریکیوں کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ تم کوئی اور کام کرو۔"

میں نے وہیں کھڑے کھڑے فیصلہ کر لیا کہ شاعری سے راگداری بہتر ہے۔ علامہ عیش کو سلام کیا اور رکتے کباڑیے کے یہاں بوزی کا ایک سیکنڈ ہینڈ کلا رنٹ خریدنے چلا گیا۔ یونیورسٹی کے امتحانات کے قریب جب ہماری سینئر کلاسوں کی الوداعی پارٹی ہوئی تو لڑکیوں کے کورس کے بعد سٹیج سکرٹری نے میرا نام لے کر پکارا۔ میں اپنا کلاسیاہ ٹیکل سے چمکایا ہوا کلا رنٹ لے کر سٹیج پر چڑھا اور سارے مجھے کو ایک فاتح کی طرح سر جھما کر دیکھا۔ ماؤ تھ جیس کو منہ میں ڈالنے سے پہلے میں نے مجمع کو مخاطب کر کے کہا "میں آپ کی خدمت میں اپنے استاد ماسٹر ہالی کی ایک بندش پیش کروں گا جو انہوں نے میاں کی ٹوڈی کے مدغم روپ میں تیار کی ہے اور جس کے سارے سر کو مل باندھے ہیں۔"

جب میں نے ماؤ تھ جیس میں پھونک لگائی تو پتی ہاڈی کے ساتھ چمٹی رہ گئی اور ہوائنگلی میں سے سیدھی ستر گزر گئی۔ دوسری اور تیسری پھونک کے بعد میں نے پتی کو لعاب دہن سے تھپیرا تو ہوا کا گزر بالکل ہی رک گیا۔ سامعین اوسے اوسے کر کے ہوٹ کر رہ گئے اور چند ایک نے منہ میں انگلیاں ڈال کر بیٹیاں بھی بجا ئیں۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے ان کو منع کیا۔ پتی باہر نکال کر اسے لب لگا کر ترکیا اور پھر ایک پھر پور کو شش کی لیکن کلا رنٹ کو نہ بچا تھا نہ بچلے سارے ہال میں تالیوں 'سیٹیوں اور بہہ جا بہہ جا کا شور اٹھا اور میں شر مندہ ہو کر سٹیج سے اتر آیا۔ اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے فیصلہ کیا کہ راگداری سے پڑھائی بہتر ہے اور مجھے ایف اے کرنے پر پوری توجہ دینی چاہیے۔

ٹھیک ڈیڑھ دو مہینے بعد ہمارے کالج میں پرچہ لگا کہ ماسٹر ہالی شہر میں آئے ہوئے ہیں اور آج شام سیشن جج اشرف چشتی کی کوٹھی پر اپنے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ چشتی صاحب کی بیٹی کی شادی پر دو صرف اپنے کلا رنٹ سے برات کا سواگت کریں گے اور شہر

کے معززین اور انگریز افسران کے فن سے لطف اندوز ہوں گے۔ میں اس محفل میں جانے کے لئے بیقرار تھا لیکن میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ نہ میں معزز شہری تھا اور نہ انگریز افسر۔ نہ ہی میری سیشن جج کے عملے سے کوئی واقفیت تھی کہ کسی کلرک کے ساتھ مل کر برات کے خادموں میں اپنا نام درج کروا لیتا اور لوٹا جاگ لے کر اوپر ادھر گھومنے والوں میں شامل ہو کر اس محفل میں شرکت کر سکتا۔ اسی مایوسی کے عالم میں جو شل جا کر اپنا کرو بند کیا اور گہری نیند سو گیا۔

سہ پہر کے وقت میرے دروازے پر دستک ہوئی اور ساتھ ہی پتھر سنگھ کی کراخت آواز نے مجھے جگا دیا۔ میں نے اٹھ کر دروازہ کھولا تو سامنے پتھر سنگھ اپنے کیسوں پر دہائی لگائے کھڑا تھا اور اس کے ہاتھ میں سونا سا ایک ڈنڈا تھا۔ اس کے پیچھے ماسٹر بالی کھڑے تھے جن کے ہاتھ میں ماسٹر پر سبز رنگ کا ایک روشنی والی بندھا تھا۔ پتھر نے کہا ”لے بھی سنبھال اپنا پروہن میں ہو شل سے کتے بھگانے جا رہا ہوں۔ سالوں نے بڑا تنک کر رکھا ہے۔“

ماسٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ میں نے جلدی جلدی کتابیں اٹھا کر ان کے لئے کرسی خالی کی اور خود ان کے سامنے چارپائی پر بیٹھ گیا۔ مسکرا کر بولے ”تمہیں بے وقت چکا دیا۔ اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یہ وقت تمہارے سونے کا ہے تو میں کسی اور نام آ جاتا۔“

میں نے کہا ”بالکل نہیں سر کار آپ کے آنے سے تو جاگرتی ہو گئی ہے سونا کیسا۔“ میرے منہ سے سرکار کا لفظ سن کر ان کو تھوڑی سی حیرت ہوئی اور انہوں نے پلٹ کر میز سے کلارنٹ اٹھا لیا۔ کہنے لگے ”اچھا داندے، مشت کرتے ہو؟“

میں نے کہا ”دو تین دفعہ کوشش کی تھی لیکن مجھ سے تو یہ بھائی نہیں۔ ماؤ تمہیں کھو چلا ہے ہو اڑے جاتا ہے۔“ انہوں نے کلارنٹ کو الگ الگ کیا۔ چابیوں کی زد دیکھی۔ پتی کو اتار کر پھر اپنی جگہ پر لگایا اور کلارنٹ جوڑ کر منہ سے لگا لیا۔

اسے اتفاق کیسے یا کشف۔ انہوں نے میرا کوٹوڑی کی وہی بندش بھائی شروع کر دی اور اس میں ایسی ایسی مینڈھیں بھریں کہ اس سے پہلے کبھی نہ سنی تھیں۔ کوئی پانچ منٹ تک یہ بندش بنانے کے بعد انہوں نے کہا ”بڑا سر بلا دانہ ہے کتنے میں ملا؟“

میں نے قسمت بتائی تو وہ اور بھی حیران ہوئے اور پوچھنے لگے ”اس کا کیس بھی ہے؟“ میں نے کہا ”جی ہے۔“

کہنے لگے ”اس کو میز پر نہیں رکھا کرتے۔ کھول کر، کیس میں بند کر کے الماری کے

اندر رکھا کرتے ہیں۔ گرمی سے اس کے جوڑوڑ لے ہو جاتے ہیں۔“ پھر انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے کیس طلب کیا۔ کلارنٹ کھول کر اس کے اندر رکھا اور میرے حوالے کر دیا۔ میری پڑھائی کے بارے میں دیکھی سی گفتگو کرنے کے بعد انہوں نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور گلوگیر لہجے میں بولے ”تم نے میری ذات پر جو احسان کیا ہے اس کا بدلہ میں عمر بھر نہیں دے سکتا۔“

میں اپنے کمرے پر دل ہی دل میں پہلے ہی شرمندہ تھا ان کی یہ بات سن کر زمین میں گر گیا۔ نہ کچھ کہہ سکتا تھا نہ بول سکتا تھا اور نہ ہی معافی مانگنے کا یا برا تھا۔ اسی طرح پتھر کا بت بنا کھڑا رہا۔

کہنے لگے ”رجنی کی شادی ہو گئی اور خدا کے فضل سے ایک بیٹے کے اندر اندر ہو گئی۔“

”کہاں؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

فرمایا ”یہ پتہ نہیں کہاں ہوئی ہے البتہ اس کی بارات بھاسر سے آئی تھی اور ادھر ہی کو اسے پناہ کر لے گئے ہیں۔“

میں نے کہا ”ماسٹر صاحب وہ آپ سے دیوانوں کی طرح محبت کرتی تھی اور ہر گھڑی آپ ہی کے خیال میں رہتی تھی۔“ ”اسی لئے تو میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم نے عین وقت پر میری جان بچا دی۔ میرے دل میں بھی کچھ ویسی ہی محبت کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔“

میں نے کہا ”آپ کو پتہ ہے کہ میں اس کی ماں سے ملا تھا۔“

”اس نے خود مجھے بتایا تھا۔“ ماسٹر صاحب بولے۔

”اس کی ماں نے؟“

”نہیں خود رجنی نے وہ تم سے ناراض تھی لیکن کچھ اتنی بھی نہیں جس قدر اسے ہونا چاہیے تھا۔ بس خفا خفا ہی تھی۔“

”آپ سے پھر بھی ملتی رہی؟“ میں نے پوچھا۔

”تمہارے جانے کے بعد صرف ایک مرتبہ ملاقات ہوئی لیکن بڑی بھرپور۔ شادی سے پہلے اس نے اپنی ماں سے کہا کہ اگر مجھے برات کے ساتھ بھیجنے کی خواہش ہے تو مجھے ماسٹر بالی سے آخری ملاقات کرنے دے ورنہ بھول جاؤں گا کہ میں بھاسر کے چند توں کے گھر جاؤں گی۔“

”پھر وہ اپنی؟“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”اس کی ماں خود اسے میرے چوہارے پر چھوڑنے آئی اور صبح پانچ بجے واپس اپنے ساتھ لے گئی۔“

”ساری رات“ میں نے سوچ کر کہا۔

”ساری رات۔“

”لیکن ماسٹر صاحب وہ ایسی تو نہیں تھی۔“

”وہ ایسی بھی نہیں تھی جیسی تم سمجھ رہے ہو اور وہ اس طرح کی بھی نہیں تھی جیسے میں سمجھتا رہا تھا۔ وہ بس کچھ اور عی چیز تھی اگر کچھ دیر اور تخت پور میں رہتی تو میں زندہ رہتا۔“

”لیکن وہ اپنے سرسرا سے آتی بھی تو رہے گی۔“

”بھلے آتی رہے اب کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ اب وہ مجھ پر حملہ آور نہیں ہو گی۔“

”حملہ آور!“ میں نے گھبرا کر پوچھا تو وہ سر جھکا کر کہنے لگے ”وہ شکتی کا روپ تھی جو لاکھ برس کا یگ بنانے کے بعد کسی روپ متی کے پردے میں اترتا ہے۔ پھر کسی طے شدہ رات کے اندر ایک مرگ کا خون پی کر واپس اونٹاشی میں چلا جاتا ہے۔“

”تو اب وہ واپس چلا گیا“ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”چلا گیا۔“

”اور خون پی گیا؟“

”ٹنٹ کے پی گیا میرے ہو کے پی گیا کئی تھیلیاں لگا گیا۔“

”آپ نے خود اسے خون پیتے ہوئے دیکھا؟ شکتی کے روپ کو؟“

”دیکھا اور بہت قریب سے دیکھا لیکن اسے کوئی کوئی سہارا سکتا ہے۔ ایسا کوئی جس کے ساتھ کسی کی دعا ہو کسی کی پرار تھنا ہو اشیر واد ہو۔“

”آپ کے ساتھ کسی کی دعا تھی ماسٹر صاحب؟“

”میرے ساتھ رجنی کی اشیر واد تھی اور اسی کی پرار تھنا تھی۔“

”اور وہی شکتی کا روپ تھی!“

”وہی شکتی کا روپ تھی بلکہ وہی شکتی تھی۔“ انہوں نے خوف سے نکلتے ہوئے کہا اور

اپنے دونوں ہاتھوں میں میرا ہاتھ پکڑ کر بولے ”تم نے مجھ پر بڑا احسان کیا ہے جو اس کی ماں سے مل کر ساری صورتحال واضح کر دی۔ ایسا نہ کرتے تو مجھے روز جینا پڑتا اور روز مرنا اور صرف مرنے کے لئے ہر روز جینا پڑتا ہی کٹھن کام ہے۔“

تھوڑی دیر بعد انہوں نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا اور چپک کر بولے ”آج شام فکشن پر آ رہے ہوں“ میں نے کہا ”حضور میں کس طرح آسکتا ہوں میرے پاس تو کوئی دعوت نامہ ہی نہیں۔“

”دعوت نامہ!“ انہوں نے حیرانی سے کہا ”دعوت نامہ! تمہیں تو سیشن جج کی کبھی ہو سٹل سے لینے آئے گی تم وقت مقررہ سے پہلے تیار رہنا۔“

میں نے کہا ”آپ نے تو کبھی کسی بیاد شادی پر پر فارمنس نہیں دی یہاں کیسے مان گئے۔“

رازدارانہ لہجے میں بولے ”اپنے پاروان سنگھ کا کیس اسی سیشن جج کے پاس ہے اور جج نے میرے ساتھ وعدہ کیا ہے کہ اسے اگلی بیٹھی پر رہا کر دوں گا بشرطیکہ میں اس کی رہائی سے پہلے ہی جج کی کوشش پر شادیانے بجا دوں۔“ میں بھونچکا سا بیٹھا رہا تو میرا کندھا ہلکا کر بولے ”کوئی مہنگا سودا ہے شغالی؟“

مستری دہان سنگھ رہا ہو کر واپس تخت پور پہنچ گیا۔ راجی تخت پور سے بھاکسری چلی گئی۔ چوک کے فوارے کو پانی کا نکشن مل گیا۔ شہر میں بجلی آگئی۔ بجلی کے ساتھ چھ گھروں میں ریڈیو سیٹ آگئے۔ ریڈیو پر شام کے وقت برلن سے خبریں سنی جانے لگیں۔ انگریزوں سے نفرت بڑھ گئی۔ لوگ فوج میں بھرتی ہونے لگے۔ معززین شہر نے بیکار جوانوں کو دس دس روپے دے کر ان کی بھرتی دینا شروع کر دی اور ہر رات گھروں کے بدلے انگریز سرکار سے سرٹیفکیٹ لے کر فائل میں لگانے لگے۔ ڈپٹی کمشنر کے دربار میں پروٹوکول تبدیل ہو گیا۔ جس کے پاس بھرتی کرانے کے زیادہ سرٹیفکیٹ ہوتے ان کو اگلی قطاروں میں جگہ ملتی اور جنہوں نے پچاس سے اوپر جوان فوج میں بھرتی کرائے ہوتے انہیں دہلی دربار میں وائسرائے سے ہاتھ ملانے کا موقع بھی عطا کیا جاتا۔

رومیل عرب دنیا کے ریگستانوں میں لڑ رہا تھا۔ جاپانی برما پر کئی حصے کر چکے تھے۔ امریکہ جنگ میں داخل ہو چکا تھا اور سچاوش چندریوس غائب ہو چکے تھے۔ جاپان کی طرف سے ایسی خبریں آرہی تھیں کہ نیتاجی نے انڈین نیشنل آرمی کی بنیاد رکھ دی ہے اور وہ چندی روز میں ہندوستان فتح کر کے اسے آزاد کروا رہے ہیں۔

مستری دہان سنگھ کی رہائی کی خوشی میں ماسٹر صاحب نے اپنے چوبارے پر چار چرائی چوکھیا جلائے تھے اور نوچندی جمہرات سے لے کر اگلی نوچندی تک مہینہ بھر تک اس کا التزام کیا تھا۔ دوسری جمہرات انہوں نے دوبار صاحب میں اکھنڈ پانچ بھی کر لیا تھا اور اس کے سارے اخراجات خود برداشت کئے تھے۔ نہر کے جنگل سے میرے کالج ٹیلی فون کر کے دو دن کے لئے مجھے بھی بلا لیا اور جب ہم سروں پر رومال باندھ کر دہان سنگھ کے ساتھ

گورو گرنہ صاحب کو سلام کرنے اندر داخل ہوئے تو میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ ماسٹر صاحب نے دو گھنٹے زمین پر ٹیک کر اور دونوں ہتھیلیاں فرش پر لگا کر اپنا سر گورو گرنہ صاحب کے آگے بہت ہی بچا کر کے جھکا دیا۔ وہ پورا مانتا تھا لیکن تو نہیں تھا کابلتہ ایک طرح کا سجدہ ہی تھا۔ میرے دل میں ذرا سی گھبراہٹ پیدا ہوئی اور میں دو قدم پیچھے ہٹ گیا جہاں دہان سنگھ سنگ سرمر کے فرش پر مانتا ہے۔ رو رہا تھا اور اس کا بدن مسلسل ہلکیوں کی وجہ سے پرلپی لاری کی طرح شارت ہو کر کانپ رہا تھا۔

جب تک ماسٹر صاحب اپنے سجدہ کی رکوع سے برآمد نہ ہوئے میں اور دہان سنگھ ہاتھ باندھ کر گورو گرنہ صاحب کے سامنے کھڑے رہے۔

اکھنڈ پانچ کے بعد ماسٹر صاحب میرے ساتھ ضلع آگئے اور ایک دن مہناور پالہ کے نگران شکر داس کے یہاں گزار کر اگلے دن مجھے ہر پٹھ کے میلے پر جالندھر لے گئے۔ اس میلے نے مجھے اپنی زندگی سے اکھیر کر ایک اور ہی دنیا سے وابستہ کر دیا اور میں ان خیالوں میں رہنے لگا کہ خوب کی دنیا خاص طور پر رات ڈھائی بجے سے صبح پانچ کی دنیا ہی اصل دنیا ہوتی ہے باقی سب دھوکا اور سراپ ہے۔

ہم عملی طبیب نواز کے ڈیرے پر ٹھہرے تھے جس کی کل کائنات طبیبوں کی ایک جوڑی تھی۔ کلے کا ایک میلا چیکٹ تعویذ اور پیشل کا ایک تالوٹ تھا۔ وہ تالوٹ میں ڈوڑے ڈال کر سارا دن انہیں ملتا رہتا اور شام کے وقت اپنا عمل کر کے بیٹک میں جب طبیب بجاتا تو میرے سرکار زمین پر بیٹھ کر اس کے دونوں پاؤں پکڑ لیتے اور جب تک وہ طبیب بجاتا ہی طرح بیٹھے رہتے۔ بہت سے لائبرین اس کے ڈیرے پر جمع ہو جاتے اور پھر اتنی بھیڑ ہو جاتی کہ لوگوں کے جھوم میں دم گھٹنے لگتا۔

ایک دوپہر عملی نے ڈوڑے سسلے ہوئے مجھے بتایا کہ میرے استاد ماسٹر بانی کا باپ طفیل خان اور عملی دونوں شام چوراسی کے رہنے والے تھے اور گھر سے دوست تھے۔ دونوں جوڑی بجاتے تھے اور استادوں کے ساتھ سنگت کرتے تھے۔ میرے استاد ماسٹر بانی کی ماں بغدادی بانی اپنے اکلوتے بیٹے اقبال خاں کو چھوڑ کر ہیرے ناہانی کے ساتھ بھاگ گئی تھی اور طفیل خاں اپنے بیٹے کی انگلی پکڑ کر شام چوراسی سے مدراس چلا گیا تھا۔ آخری عمر میں وہ پھر تاپہرا اور دھکے کھاتا تخت پور پہنچ گیا اور ڈھول گئے میں ڈال کر بھرا یوں کا کام کرنے لگا۔ عملی نے ڈوڑے سسلے ہوئے چہرہ اوپر اٹھا کر کہا "طفیل خان بڑا گنی آدمی تھا پر قسمت

نے اسے چلی سے بھرائی بنا دیا۔ مرنے سے چند مہینے پہلے اس نے چٹھی لکھ کر مجھے شام چوراسی سے بلوایا اور بالی خاں کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے کر کہا "اب اس کا والی وارث تو ہے چاہے تو اپنے ساتھ شام چوراسی لے جا اور مناسب سمجھے تو اسے کسی دربار میں نوکر کر دے۔ میرا کھیل تماشا ختم ہے اور میری بس ہے!"

عملی کہنے لگا میں تیرے استاد کے باپ کی موت کے بعد تین مہینے تک میں تخت پور میں رہا لیکن تیرا استاد میرے ساتھ شام چوراسی جانے پر رضامند نہ ہوا۔ پھر میں نے مہاراجہ فرید کوٹ کے دربار میں اس کی نوکری کا بندوبست بھی کیا لیکن یہ نہیں مانا اور ایک ہی ضد پر اڑا رہا کہ تخت پور میں میرے باپ کی قبر ہے اس کو چھوڑ کر نہیں جاؤں گا سو نہیں گیا۔

میں نے کہا "اور ان کی والدہ بغدادی بی بی؟"

بول "زندہ ہے مگر بہت بوڑھی ہو گئی ہے۔ کانوں سے اونچا سنائی دیتا ہے اور آنکھوں میں موتیا نظر آتا ہے۔ لوگ بڑے استاد کی بیوی جان کر برا مانا اور کرتے ہیں پر بیٹے کو بہت یاد کرتی ہے۔"

"ان کو پتہ نہیں کہ ان کا بیٹا کہاں رہتا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں" عملی نے ایک ڈوڈے کو تالوٹ سے نکال کر دیکھتے ہوئے کہا "نہیں اس کو پتہ ہے اور نہ ہی میں بتاتا ہوں۔"

"اور وہ بالائی؟"

"وہ بیچارہ لدھیانے میں فوت ہو گیا۔ ریلوے لائن کر اس کر رہا تھا اور پر سے گاڑی آگئی وہیں ختم ہو گیا۔"

جائیداد میں قیام کے دوران میرا مریض دل چاہا کہ ماسٹر صاحب سے ان کی والدہ کا اور ان کے شہر کا تذکرہ کروں لیکن مجھے حوصلہ نہ ہوا۔ کچھ ایسے لگتا تھا کہ اگر میں ان سے اس بات کا تذکرہ کروں گا تو وہ مجھ سے قطع تعلق کر لیں گے اور دوبارہ ان سے ملنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس اندیشے نے ایسے اہم تاریخی واقعے کو میرے ذہن سے بالکل محو کر دیا اور میں جلد ہی اپنی ہرمل حالت کی طرف لوٹ گیا۔

۲

ہر بلحہ سے واپسی پر میرا اندر باہر راگ رنگ سے بھگ گیا تھا اور ہر دے میں ہر وقت جلتی رنگ سا بھجا رہتا تھا۔ ہو مثل بچھ کر میں نے اپنا کارنٹ نکالا جوڑوں پر دھاگا لپیٹا۔ چابیوں کو صاف کر کے سپرنگوں کو سنگر کا تیل دیا۔ ڈھکیوں کو دلا چھ صابن کے سلوشن سے صاف کیا اور باڈی پر کھوپرے کا تیل مل کر اسے لٹکایا۔ ہاتھ پیس کو پانی میں ڈوبا دے کر تر کیا اور سیلی پتی کو لب لگا کر جب میں نے سرگم بھایا تو یوں لگا جیسے یہ آواز کہیں اور سے آئی ہو۔ کسی گھپا کے اندر سے یا زسلوں کے جنگل سے۔ میں نے ایک پاؤں کر ہی پر رکھ کر اور دوسرے پر پورا بوجھ دے کر اپنے استاد کے انگ میں تلک کا سودا کی نقل شروع کر دی۔ مجھے اس کی تین تال کی سرگم تو یاد تھی پر اس کی خاص تان پانی سارے گاسا۔ سارے گاسا سارے گاسا بچھ میں پلانا کھا جاتی تھی۔ بھانے بھانے کبھی اس کی شکل دیس کی بن جاتی تھی اور کبھی تلک کے آس پاس بچھ جاتی تھی۔ سمجھ کم تھی صرف گھوٹا لگایا ہوا تھا۔ ادھر سے ادھر نکل جاتا۔ ادھر سے کچھ اور ہی شروع ہو جاتا لیکن کیفیت کمال کی تھی۔ غلط سلاط بجاتا رہا اور بجاتا ہی گیا۔ بعد میں مجھے احساس ہوا کہ کچھ بھی نہیں تھا نہ کوئی راگ تھا نہ سرگم درست تھا۔ بس اک شجی سی تھی اور چند راگوں کے نام یاد تھے۔ لیکن اس شجی کا ایک فائدہ ضرور ہوا کہ میں نے باقاعدگی سے ریاض شروع کر دیا اور اپنے بھانویں خود کو اگلے ہر بلحہ کے لئے تیار کرنے کا پروگرام بنالیا۔

بین پو گئی بانسری کلارنٹ جہاں بھی جیتی ہے وہاں کچھ نمودار ضرور ہوتا ہے ارد گرد کچھ بھی نہ ہو۔ بس خالی اور سپاٹ ہو۔ دور دور تک کوئی آثار نہ ہو۔ نہ ویران ہو نہ مسلمان نہ زمان ہو نہ مکان نہ ہوتا ہو اور نہ ہو سکتا تو اس کے درمیان ہو یا ہو جاتا ہے۔ اصل میں تو کوئی درمیان بھی نہیں ہو تا بس ہستی ہی مل کھا کر ہو یا ہو جاتی ہے۔ لوگ ہر مل کھانے والی چیز کو سانپ سمجھ لیتے ہیں حالانکہ وہ سانپ نہیں ہوتا۔ بین کی آواز پر ہو یا ہو جاتا ہے لوگ ہو یا

کو سانپ کہنے لگ جاتے ہیں!

ایک دو پہر میں اپنا کروا چھی طرح سے بند کر کے کالانٹ بجارہا تھا اور کوئل سروں پر رک رک کر زبردستی اپنا بدن لہرا رہا تھا ساتھ ساتھ کلا رنٹ کوئین بجی ہوئیوں کی طرح گردش بھی اسے رہا تھا کہ میرے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دک کر کان آہٹ پر لگائے تو پھر کسی نے دھب دھب میرا دروازہ بجایا۔ کلا رنٹ چارپائی پر رکھ کر میں نے دروازہ کھولا تو سامنے رجنی کھڑی تھی۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور پھر گردن گھما کر اپنے ساتھی سے آواز کہا:۔۔۔ اور اندر داخل ہو گئی۔ سر سے چادر اتار کر میری چارپائی پر بٹھکتے ہوئے اس نے اپنے گریبان کو چٹکی سے پکڑ کر اس میں دو تین بار ہوا بھری اور پھر کہنے لگی "ہم فیروز پور آئے تھے سوچا تم سے بھی ملے چلیں۔ یہ میرے پتی ہیں۔ ہائے آج کتنی گرمی ہے۔" میں نے اس کے پتی سے ہاتھ ملایا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے ہاتھ سبز کائی والے جوہر کا مینڈک آگیا ہو۔ وہ چھوٹے قد کا ایک کم زور اور بے یقینا شخص تھا جس نے سر پر پہلے رنگ کی پگڑی باندھی ہوئی تھی اور ماتھے پر سرخ رنگ کے قیشے میں چادر کا ایک دانہ چھنا ہوا تھا۔

میں نے اپنی کرسی اسے پیش کرتے ہوئے خندہ پیشانی سے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور وہ کچھ کہنے سے بغیر دھب سے اس میں بیٹھ گیا۔ رجنی کہنے لگی "ان کے قالے کے اپنے باغ ہیں اور منڈی میں آڑھت کی دکان ہے۔ میرے سسر کے اکلوتے بیٹے ہیں اور سارا کام انہوں نے ہی سنبھالا ہوا ہے۔"

اسے دیکھ کر مجھے پہلی مرتبہ اپنے ظلم کا احساس ہوا کہ میں نے کیوں رجنی کی بات سے بات کی اور کیوں اسے آڑھت کے کونٹوں میں دھکیلا۔

رجنی امید سے تھی اور بڑی بے تکلفی کے ساتھ میرے بستر پر نیم دراز تھی۔ میں پابندی کی طرف بیٹھا تھا اور اس نے میرا ہاتھ اور کھنکھس ملا جلا کر ایک گلاؤ بھری سا بتایا تھا جس سے ڈھونڈ کر وہ پہلو کے بل یوں لیٹی ہوئی تھی کہ اس کی ایک تہہ شدہ ٹانگ تو بستر پر تھی اور دوسری کا پاؤں ابھی تک زمین پر ٹکا ہوا تھا۔

میں نے اس کے خاوند کی طرف منہ کر کے کہا "آپ لمبی ہیں گے کہ چائے؟" رجنی نے اس کے جواب سے پہلے منہ بھاڑ کر کہا "یہ بھی کوئی موسم ہے چائے کا لمسی دنگوؤ۔"

جب میں تک شاپ پر لمسی کا آرڈر دینے کے لئے اٹھا تو اس کے پتی نے منہی آواز میں

پوچھا "رہو یا کون ہے؟"

رجنی نے جھڑک کر کہا "یہاں سبھی ہندو کر بھاری ہیں پنڈت جی آپ مریم ناں کچھ نہیں بھرشت ہوتا۔" اس نے دیکھی مریم آواز میں کہا "میں نے تو ایسے ہی پوچھا تھا۔" جب میں تک شاپ کے لڑکے سے منی اٹھا کر دو گلاس جھاگ والی لمبی ہوا کر لے آیا تو رجنی نے چھوٹے ہی کہا "اور تمہارا گلاس؟"

میں نے کہا "میں نے ابھی چائے پی ہے اس لیے اوپر سے ٹھنڈی لمبی نہیں پی سکتا۔" پھر میں نے پنڈت جی کو سنانے کی غرض سے لڑکے کا نام اونچی آواز میں پکار کر کہا "شعبو! گلاس ذرا بھر کر لے جانا۔" اور جب وہ چلے گا تو میں نے کہا "شکر سے کھنا دو گلاس ہی لکھے ایک اور نہ ڈال دے میرے نام۔"

شعبو "اچھا جی" کہہ کر چلا گیا تو میں نے دیکھا کہ رجنی دو ہی بڑے بڑے گھونٹوں میں آدھا گلاس ختم کر گئی تھی اور اس کا پتی برف کی ڈلیوں سے ڈرڈر کر اپنا منہ بار بار گلاس سے اٹھا لیتا تھا۔

رجنی نے کہا "اس طرح سے جو تریک رہے ہو تو باہر جا کر ساری ڈلیاں ایک ایک کر کے انگلی سے نکال آؤ اور آکر آرام سے بیو۔"

وہ چابی والے گڈے کی طرح اٹھا اور ڈلیاں گلاس سے نکالنے باہر چلا گیا۔ رجنی نے گلاس میری طرف بڑھا کر کہا "اوتے دفع ہونے تو بھی پی لے۔ بڑی مزیدار ہے۔" میں نے گلاس لے کر ابھی دو گھونٹ ہی پئے تھے کہ اس نے جھینا ہار کر گلاس پھر اپنے ہاتھ میں لے لیا اور پھر لمسی پئے لگی۔

اس کے پتی نے باہر سے آکر بتایا کہ انگلی میڑھی کر کے بھی ذلی بڑی مشکل سے پکڑی جاتی تھی۔ چار تو نکل گئیں ایک ابھی بھی اسی طرح سے تیر رہی ہے۔

"رجنی نے کہا "کوئی بات نہیں اب یہ تم کو تنگ نہیں کرے گی۔ اس کو سمجھا دیا ہے۔" لمسی پیتے ہوئے اور گریبان میں ہوا دیتے ہوئے رجنی نے مجھ سے میرے گھروالوں کی بات پوچھا۔ میری پڑھائی اور امتحانوں کے بارے میں فکر مندی کا اظہار کیا اور اپنے خاوند کو بتایا کہ میں مرلی بہت اچھی بجاتا ہوں۔ کلا رنٹ کی جگہ مرلی کا نام سن کر مجھے اپنے آپ سے اور اپنے کلا رنٹ سے ہنگ کی سی بو آنے لگی۔ میری اس بیزارگی کو بھانپ کر وہ ہولے سے فسی اور کہنے لگی "ذرا دکھاؤ تو پنڈت جی کو اپنی مرلی۔"

میں نے بادل کا خواستہ نگار نہ اٹھایا اور اسے چنڈت، جی کے سامنے پیش کر دیا۔ انہوں نے اسے ایک نظر لٹنی والے گلاس کے اندر سے دیکھا اور گلاس سمیت اثبات میں سر ہلادیا۔
 رجنی نے کہا ”ریاض کرتے ہو؟“

میں نے کہا ” پہلے تو میں نے چھوڑ دیا تھا پر اب پھر سے شروع کر دیا ہے۔“
 ” چھوڑ کیوں دیا تھا؟“ اس نے ہیڈ مسٹر کیس کے لمبے میں پوچھا۔
 میں نے کہا ” بس ایسے ہی ”من نہیں لگتا تھا۔“

کہنے لگی ”سن لگانے والی کے آنے میں تو ابھی کافی دیر ہے جب تک اس سے اور پڑھائی سے دل لگانا پڑے گا۔“ چڈت جی نے لسی کا گلاس ختم کر کے میز پر رکھا تو رجنی بولی ”اپنے استاد سے سبق لینے جاتے ہو؟“

میں نے کہا؟؟؟ برہ کے ماروں کا سبق لینا کیا۔ اور میرا استاد اور ہر میں بیچ میں دکھ کا گہرا ساگر۔ لہذا فاصلہ لہذا راستہ..... مجھ کو کون جھلائے۔“

میری بات سنی ان سنی کر کے بولی "کوئی ایسا کلا رنٹ بچا سکتا ہے جیسا مسجد کے باہر اس روز بچا تھا؟"

پھر خود ہی کہنے لگی ”کوئی نہیں بجا سکتا۔ دیوتا بجا سکتا ہے“ پر دیوتا بار بار پر تھمی پر تو نہیں آتے۔ آسکتے ہیں؟“

”کیوں نہیں آسکتے“ اس کے پتی نے مردانہ آواز میں کہا ”وہ شکستی، مان دیو ہوتے ہیں جب چاہیں آجائیں پر نوان کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔“

”بھرا ایک بار تو وہ آچکے ہیں“ رجنی نے کہا ”پر اب کوئی خاص امید نہیں ہے۔“

میں نے کہا "کیوں نہیں جی! ان کی مہرج ہے چاہیں تو پھر آجائیں نہ چاہیں تو کبھی نہ آئیں۔"

”اور کھیتیاں سوکھی رہ جائیں“ ترجمانی نے بات کاٹ کر کہا۔

”سو کھی کیوں نکھیتیاں تو سر سبز ہیں“ میں نے کسی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ تو رجنی بولی ”جہاز جھکاؤ، بڑی بوٹی اور سر کٹے کے تیز کھیتی نہیں ہوتے ایسے ہی پھیلنے جاتے ہیں۔“

تھوڑی دیر تک ہم خاموش رہے۔ پھر میں نے چور آنکھوں سے رجنی کی طرف دیکھا۔ مگر بھد کی وجہ سے وہ جسمانی طور پر خوبصورت نہ ہو سکی تھی لیکن اس کی آنکھوں میں وہ چمک اور بالوں میں وہ مہک نہیں تھی۔ اس کو شاید اچھی طرح سے معلوم تھا کہ میں اس کی ماں سے ملا

تھا اور میں نے ہی اس کی زندگی میں نہ ختم ہونے والا کھٹوتہ ڈالی تھی۔ لیکن اس کے رویے سے اندازہ ہو چکا تھا کہ اپنے سر پر خاک اور خاکستر ڈالنے والے کو دودل سے معاف کر چکی ہے۔ تھی تو یا نہیں پر اٹھبدر کی اصل مسلمان تھی۔

جب وہ اٹھ کر جانے لگے تو میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے ایک روپیہ نکال کر رجی کو دیتے ہوئے کہا ”تو پہلی سرحد میرے گھر آئی ہے یہ تیری نذر ہے۔“ اس نے روپیہ لے کر ہاتھ سے لگایا اور اپنے گریبان کے اندر رکھ لیا۔ میرے پاس کوٹی کے جیمز آئل کی ایک بند شیشی تھی جو میں نے ججپاتی کی خدمت میں پیش کی۔ انہوں نے ڈھلکا کھول کر اسے سونگھا پھر خوش ہو کر بولے ”بڑی سوادشت سنگدھ ہے۔“

میں انہیں تانگے میں بٹھا کر لاریوں کے ٹوے تک چھوڑنے گیا۔ جیاجی کے پیچھے لاری میں داخل ہوتے وقت رجنی نے میرے بازو میں اتنے زور کیا چٹکی کاٹی کہ میں درد سے بلبل اٹھا۔ جیاجی نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو رجنی کہنے لگی "قیس اتارو قیس اتارو۔ اس میں ضرور کوئی بھڑکھس گئی ہے اتارو گے نہیں تو پھر کاٹے گی۔"

میں نے قیصر کے بازوؤں کو اور اس کے دامن کو زور سے چھو لیا اور مسکرا کر کہا ”نگل
مٹنی ہے۔“

رجسٹر یوں 'مکمل' تھی کہ پہلی دفعہ ہونی^{۱۸}

میں نے کہا "مٹی جلی تھی" کالی اور پیلی۔"

شیخ جہانگیر یو لے ^{۱۷} پھر توڑ دینو ہو گا مابقی بھونڈ۔^{۱۸}

میں نے کہا "ہاں کچھ ایسا ہی تھا۔ ادھر کو اڑ گیا ہے۔"

و جتنی اپنی سیٹ پر بیٹھ کر ہنسنے لگی اور کھڑکی سے منہ نکال کر بولی "کافی بلاؤں اور کیڑے پتنگوں کا وہ حیان رکھا کرو۔ پردیس میں رہتے ہو اگر کچھ ہو گیا تو ہم اتنی دور سے آ بھی نہیں سکیں گے۔" پھر وہ شرارت سے ذرا الٹی آواز میں ہنسنے لگی اور ہنسی ہنسی میں لاری اشارت ہو گئی۔

جب میں لاریوں کے اڈے سے آہستہ آہستہ چلتا واپس اپنے ہوٹل آ رہا تھا تو مجھے مستری دان سنگھ یاد آ گیا۔ دراصل وہ یاد نہیں آیا اس کی کہانی یاد آگئی۔ وہ کہانی ہم نے اس سے اتنی مرتبہ سنی تھی کہ زبانی یاد ہو گئی تھی اور میں اور میرے استاد اسے ہر ابائی پیر ایک دوسرے کے آگے پیچھے اسی تسلسل میں سناتے تھے جس طرح دان سنگھ سنایا کرتا تھا۔

مستری دان سنگھ میں دو خوبیاں تھیں ایک تو وہ کاتھ کے کام کا بہت ہی اونچا فنکار تھا اور اس تخلیقی صلاحیت نے اسے اعلیٰ درجے کا کیت جوڑ اور قافیہ داں شاعر بنادیا تھا اور اس کے طریقہ اور کچھ یہ کیت کسی پر گراں نہیں گزرتے تھے دوسرے وہ جب بھی اپنے اڈے پر پاؤں کے بل یا سرین کے بل بیٹھ کر کام کرتا تو آدھا ننگا ضرور ہوتا۔ کچھہرے کی موہری میں سے کبھی بچے پائے اور کبھی کبھے پائے اس کی برنگی ضرور عیاں رہتی اور وہ اپنی لگن کے ساتھ کار کئے جاتا۔ اس کا ننگ ایک چھوٹے بچے کا ننگ تھا جو اس کی ذات کا ایک اہم حصہ تھا۔ اس میں فٹس اور عریاں انسانوں والا قصہ نہیں تھا۔ نہ ہی اس کی نشست عموماً آتش ہوتی تھی۔

ماسٹر ہالی جب بھی اس سے مل پری کی کہانی سننے کی فرمائش کرتے تو وہ گردن کے پیچھے کیسوں میں کھڑی انگلی پھیر کر کہتا "تو نہ بھی کہتا ہوں ماسٹر تو میں نے یہی بات سنائی تھی۔ کیوں بھلا؟۔۔۔ وہ اس واسطے کہ مجھے دوسری کوئی کہانی آتی ہی نہیں۔

"لو جناب آج سے دور اگلے زمانے اور پرانے وقتوں میں بلکہ اگلے سے بھی اگلے زمانے میں بہت ہی پہلے اک سردار 'جاگیر دار' شاہ وریام اپنے رقبے پر بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے ہنسی خوش رہتا تھا اور اپنے کئی کمین ہو گئے حرا سے بڑے کاسے کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ ان کے

ان پانی کیڑے لے لے اور رست رہائش کی ہر مہینے کی چوڑھویں تاریخ کو جا کر آب پڑتا کرتا۔ جس شے کی ضرورت ہوتی کاغذ پر لکھ کر ساتھ لے جاتا اور حویلی سے اپنی کھچی میں یا گڈ میں رکھوا کر فوراً بھجوا دیتا۔ سارے بڑے بڑے غلام، تیلی ناکی، موچی بھرائی، کپھار چار، میرے جیسے ترکھان لوہار، ساکس لاگری چوکیدار، ماشکی ٹھیکوڑ سارے اس کو دن رات سہیں دیتے تھے اور اس کے جس گتے تھے۔

لو جناب ایک ہی ایک سردار کا بیٹا اور چھ سو مربع زمین۔ اٹھل جیسے کھیت، ہریاں کالیاں، پھلیاں، سب آباد سب شاداب، اپنے موگے اپنا سوا اپنے تاکے، چھٹے، چھٹے انچ بور کے بارو ٹیوب ویل (یہاں سے مستری دان سنگھ قصہ گو نیا اور پرانا زمانہ ایک کر دیتا) دس ٹریکٹر سولہ ٹرائیساں، دو تھر پیٹر، سو اوپر میں جوڑیاں ناگوری اور دھنی بیلوں کی۔ پچاس گڈے، ستر ہن، ایک اسٹبل دیسی گھوڑوں کا ایک میں ولایتی ریس کے گھوڑے، پچاس بھینسیں کالی بھوری راوی پار کے علاقے کی اور میں گاؤں ولایتی جن کے اوپر گورے نوکر مشینوں کے ساتھ دودھ نکالیں اور ایک ایک گائے من من سوا سوا من دودھ دے۔ چار ولایتی موٹریں ایک جرمن لینڈ رو گاڑی۔ یہ اگلے زمانے کی بات ہے اس وقت ایسی ہی گاڑیاں ہوتی تھیں لینڈ رو اور کھلی چھت والی۔۔۔ حویلی کے اندر باہر چاروں طرف باغ ہی باغ، میوے ہی میوے، بلبلوں، لالیوں، موروں، چکوروں سے بھرے باغیچے، ہرنوں، چیتلوں، پاؤںوں اور جھگیاڑوں سے بھرے رکھ اور جنگل۔ بڑا زمانہ تھا۔ بڑا سامان تھا۔ اچھے لوگ تھے، بھائیاں، راجے، مہر مند رعایا۔ شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے پر یہ اگلے زمانوں کی بات ہے جب ابھی کل جگ کا راج نہیں آیا تھا۔

لو جناب! ایک ہی ایک سردار کا بیٹا۔ سوہنا اور من موہنا۔ دیکھے سے بھوک مٹے درشن کرنے سے روگ کئے۔ چلے تو ایسے ساون بھادوں کی پھوار اترے۔ بات کرے تو پھول پتھڑیوں سے دھرتی بھر جائے۔ ہنسے تو اس کی آواز سے اندھیرے گھروں میں چائنا ہو جائے۔ ظلم کا ایک مہاسا کر کہ بڑے بڑے گیمانی رووانی اس سے سبق لینے آئیں۔ دیا لو اپنے باپ جیسا اور سلگھنا لاجی ماں سے بھی دو قدم آگے۔ بڑے شہر کے بڑے کالج میں پڑھتا تھا۔ بڑی بڑی گوری میسیں اس سے اکھ مٹکا لگانے کی خواہش مند پر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے۔ سیدھا کالج جائے اور کالج سے واپس اپنی کوٹھی آجائے جو اس کے باپ نے خاص طور پر آٹھ کنال کے اندر اس کو بنا کر دی تھی۔ اندر تائی، دھوئی، اندر ہی پیرے

خانہ سے اندر ہی اشان کرنے کا تالاب اور اندر ہی گیند بلا کھیلنے کا میدان۔ جس کسی کو ملنا ہو باہر ڈیوڑھی پر نام لکھانے پرچی کٹوائے ٹیلیفون پر آواز لگائے پھر اندر جائے۔

لو جناب! گرمیوں کی چھٹیوں میں ایک بار جب سرد در زادہ شہزادہ گھر واپس آیا تو سارے علاقے میں ڈھول بجے شہنائیاں کو کیں۔ رات کو آتش بازی چلی، سود گئیں چاولوں کی چالیس دال کی اور ساتھ دھنیں بیٹھے چاولوں کی چکیں۔ دور دور کے غریب غریبا کھینوں چو جھوں میں گھڑیاں باندھ کر پوش پوش کرتے اپنے اپنے گاؤں لے گئے۔ خود بھی کھایا دوسروں کو بھی کھلایا۔ روزے رکھے بغیر ہی عیدیں ہو گئیں۔

لو جناب! ایک دن کرناؤنگور دچی سرکار کا کیا ہوا کہ صاحبزادہ کتاب لے کے حویلی کے باغیچے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ اس کی نظر سامنے پڑی۔ ایک چھوٹے سے کچے کچے گھر کے برآمدے میں ایک لڑکی سولہ سترہ سال کی کچے پٹ کی پھلکاری باندھے اور ملل کی کرتی پہنے صاحبزادے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چو پنڈے بھرے بھرے گول سینہ ابھرا ہوا۔ گردن میں سیپ کے چٹکوں کا گھو بند لیکن آنکھ میں میڑھ۔ دانتوں کے درمیان چوڑی درل اور ماتھے کے اوپر بائیں طرف ایک منہ۔ صاحبزادہ اس مورٹی کو دیکھ کر پڑھنا پڑھنا بھول گیا۔ کتاب گودی سے نکل کر گھاس پر گر گئی۔ اینڈی پن کھلے کا کھلا رہ گیا۔ پران آنکھوں میں آگئے۔ اپنی جگہ سے اٹھا۔ چربوٹوں میں ڈالے تھے کھلے چوڑے اور سیدھا مورٹی کی طرف یوں چلا جیسے منتر کھل کر بلارہا ہو۔

لو جناب! لڑکی کے سامنے جا کے صاحبزادے کی سانس سکت ختم ہو گئی۔ پہلے تو کھڑا اسے دیکھتا رہا پھر آگے بڑھ کر چری کے پوٹے کی طرح لڑکی کو اپنی بانہوں میں اٹھالیا اور سینے سے لگا لیا۔ لڑکی نے جب اپنا سر اس کے چو پنڈے پر رکھا تو کچے پٹ کی پھلکاری میں اس کی ٹانگیں کیلے کے کچے پٹے کی طرح جھولا جھول گئیں۔ صاحبزادہ کچھ سوچے سمجھے اور پوچھنے لگے بولے بھاس کو اٹھا کر حویلی کے باغیچے میں چلا رہا اور سیدھا اپنی فتن کے پاس پہنچ گیا۔ لڑکی کو سامنے والی سیٹ پر بٹھایا اور خود دوسری طرف سے ہو کر راسیں سنہنہال کے اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ گھوڑے کو سائدار اتو وہ کھڑے چروں پر بجلی کی طرح چمکا اور ہوا ہو گیا۔ اسے تو آج تک کسی نے پھول بھی نہیں مارا تھا سامنے کی تڑپ نے بے قرار کر کے سموں میں بجلیاں بھروں۔

لو جناب! گھوڑا سنہنہالے سنہنہالے اور راسیں کھینچتے صاحبزادے کے ہاتھ لہو لہاں

ہو گئے پر اس نے فتن پر کنٹرول نہ چھوڑا۔ گھٹنوں کا رستہ منٹوں میں طے کر کے مورٹی کو سیر کرانے دریا پر لے گیا۔ بیاس جوان جوگی کی طرح مہسن گھیریوں کی خیاں بہنسیاں اور گنگن پہنے جھاگ اڑاتا ہے چلا جا رہا تھا مویشی چوپائے جانور کچھ بکھیر و کناروں سے دور ہو گئے تھے۔ لہرس اٹل اٹل کر اور گرد چھپے مار رہی تھیں۔ صاحبزادے نے کنارے سے دور فتن روکی۔ چٹانگ مار کر نیچے اترا اور مورٹی کی اور جا کر اپنی بائیں اس کی طرف پھیلا دیں۔ مورٹی بیٹھی کی بیٹھی جھوم کر اس کے ہاتھوں میں آگئی اور وہ اسے کچے کھاد کی بھری کی طرح گود میں اٹھا کر ایک اونچے کنارے کے پاس آگیا۔ بڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کے سنگ موہنڈے سے موہنڈا ملائے باتیں کرتے رہے اور جب صاحبزادہ نے کھڑے ہو کے اس کی گات کے نیچے ہانہ ڈال کر اسے اٹھا تو مورٹی اس کے ہاتھ سے یوں نکل گئی جیسے چڑی والے کچے کیلے کے چٹکے سے اس کی گلی نکل جاتی ہے۔ صاحبزادے کے ہاتھ میں کچے پٹ کی پھلکاری رہ گئی اور اس نے پانی میں گرتی ہوئی اپنی معشوق کے گول اور بھاری کو لمبے دیکھے جس کے نیچے مچھلی کا دھڑ تھا اور اس پر سونے جیسے رنگ کے جگ جگ گرتے چائے تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں چائے سندھوری بجلی کی طرح چٹکے اور پھر پانی میں غائب ہو گئے۔ صاحبزادے نے فریادی تان میں اونچے اونچے اپنی محبوبہ کو پکارا اور بین کرنے لگا۔ جل پری دو تین مرتبہ پانی کی سطح سے اوپر ابھری اور پھر نیچے چلی گئی۔

لو جناب! صاحبزادہ نے واپس کالج جانے سے انکار کر دیا۔ سوٹ بوٹ اتار کر میروا ابرن پہن لیا اور حویلی کے اندر جوگ دان لے لیا۔ ماں باپ روتے کراتے آنکھوں سے لاپچار اور حال سے بے حال ہو گئے۔ جن کا ایک اکیلا سوہنا پتر گھر میں رہتے سہتے بن پاس لے لے ان ماں باپ نے تو جیتے جی ہی مر جانا ہے کہ..... ہوئی کے آگے کوئی پیش نہ چلی تو ماں باپ دیواروں سے ڈھونڈ کر موت کی انتظاری کرنے لگے۔ پورے تیس سال چھ سو مربعوں کا مالک اور محل مازیوں کا راجہ پانگلوں اور مجنوں کی طرح اپنی جل پری کو تلاش کرتا رہا۔ وہ جج سویرے منہ اندھیرے دریا کنارے پہنچ جاتا اور شام تک اس جگہ بیٹھا رہتا جہاں اس کی محبوبہ اس کے ہاتھ سے نکل کر دریا میں کود گئی تھی اور پھر تین مرتبہ ابھر کر اپنے آخری درشن دے کر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غائب ہو گئی تھی۔

لو جناب! پورے تیس سال اور ایک مہینے بعد بیٹھ کی اسی تاریخ اور شام کے ٹھیک اسی وقت جب مرن بار صاحبزادہ دریا کنارے سر جھکائے بیٹھا تھا اس کی جل پری معشوقہ نے پانی

سے سر باہر نکالا اور آہستہ آہستہ لہروں کو چیرتی اس کے پاس کنارے کے قریب آگئی۔ اس کی شکل اب وہ پہلے والی نہیں رہی تھی۔ میڑھی آنکھ کے بھیجے پنا سے آنکھوں کے دونوں ڈھیلے اور قریب آگئے تھے۔ گہری نیلی آنکھیں سیپ کی طرح سفید ہو گئی تھیں۔ دانتوں میں دو تین نئی درمیں پیدا ہو گئی تھیں۔ ماتھے کا مسہ مونا بھی ہو گیا تھا اور چھوٹے سے سونڈ کی طرح آگے کو بھی بڑھ آیا تھا۔ سر کے بال کم ہو کر جھارسی بن گئے تھے اور نیچے کا خوبصورت شہزادہ جس کے اوپر سرین کا گول گنبد تھا اب ستولا گیا تھا اور پرانی بالائی کی طرح نظر آنے لگا تھا۔ صاحبزادے نے رو کر کہا "میری جان محبوبہ باہر آ جاؤ اور میرے ساتھ چلو" میں نے تمہارے بغیر زندگی کے تیس سال غنیمتوں پر انوں کو ایک طرف رکھ کر گزارے ہیں۔ اب میں زندگی کے آخری دن تمہارے بازوؤں میں گزارنا چاہتا ہوں۔ مجھ پر دیا کرو باہر آ جاؤ" میرے ساتھ چلو اور میرے اندھیرے گھر میں جاننا کرو۔

صاحبزادہ کی بچی سن کر جل پری نے انکار میں سر ہلایا اور رونے لگی۔ روتے سارے اس کی ہمت بھی بندھ گئی اور ہچکیوں سے اس کے کندھے ہلکے سے ہلکے رہنے لگے۔

صاحبزادے نے تڑپ کر کہا "میری جان تم مجھے اس وقت بھی پیاری تھیں جب تمہارے دانتوں میں درد تھی اور تمہارے ماتھے پر مساخالی تھا اور اس وقت بھی تم میری جان کا ٹکڑا اور میرے دل کا دارمان ہو۔ اس کی پروا نہ کرو کہ تمہارا چہرہ لک گیا ہے۔ تمہارے دانت نوٹ گئے ہیں اور تمہارے چانے کا لے پڑ گئے ہیں۔ میں اب بھی تم سے دیرانی پریم کرتا ہوں اور تم کو اسی طرح سے چاہتا ہوں۔"

صاحبزادے کی بات سن کر جل پری کی سسکیاں آہوں میں تبدیل ہو گئیں اور پھر ان آہوں سے کراہیں نکلتے لگیں۔ صاحبزادے نے رو کر کہا "بتاؤ میری جان۔ بتاؤ میری سندری۔ میری بچی۔ من موہنی تم نے مجھے قبول کیوں نہ کیا۔ مجھ میں کیا عیب تھا۔ کیا برائی تھی۔ کیا خرابی تھی؟"

جل پری نے زار زار روتے ہوئے کہا "خرابی تم میں نہیں تھی میرے محبوب میرے سوہنے راجکمار۔ خرابی مجھ میں تھی۔ تم ایک جاگیر دار کے ایک سردار کے ایک دریاہ کے بیٹے ہو اور میں تمہارے مزارع حسو تلی کی بیٹی ہوں۔ میری دوسری سادی خرابیاں تو دور ہو سکتی تھیں پر اس بیماری کا کوئی علاج نہیں تھا کہ میں ایک کئی کمین کی بیٹی ہوں میں کیا کرتی اور تمہاری شان کس طرح مٹی میں ملائی؟"

لاریوں کے اڑنے سے لے کر اپنے ہوٹل تک میں دان سنگھ کی یہ کہانی لفظ بہ لفظ بکھانا آیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ نہ تو رجنی حسو تلی کی بیٹی ہے اور نہ ہی جیہا جی کوئی کم برہمن ہیں پھر رجنی کی ساری شان مٹی میں کیوں مل گئی۔ وہ زندگی کے رستے پر چلتی چلتی کال کی ٹیکس میں کیوں داخل ہو گئی۔ کیا یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ اس کی پریت کے کارن ہوا۔ ماسٹر بالی کی بدولت ہوا یا پھر نکمے لکھائے لکھ کی پوتھی آکاش سے اتری اور اس نے رجنی سے اندھیا رہے کے پیچھے لے لے لے!

بیرد شیم اور ناگاساکی پر یکے بعد دیگرے دو عدد ایٹم بم گرائے جاپانکے تھے اور دوسری جنگ عظیم اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ ساری دنیا جنگ کے خاتمے پر خوشیاں منا رہی تھی اور ہر اتحادی ملک میں اور اس کے بھی خواہ ممالک میں اپنے اپنے طرز کا چراغاں ہو رہا تھا۔ امریکہ میں جگہ جگہ خوشی کے شادیانے بجا رہے تھے اور تھوڑے تھوڑے وقتوں بعد ان شادیوں کو روک کر بیرد شیم اور ناگاساکی کے بچے کچے لوگوں کیلئے اظہارِ ہمدردی کی تقریریں بھی ہوتی تھیں۔ ان تقریروں میں ہیومن رائٹس، آزادی اظہار اور بنیادی انسانی حقوق کا تذکرہ ہوتا اور بیرد شیم اور ناگاساکی کی صفحہ ہستی سے مٹ جانے والی مخلوق کے لئے دعائیں بھی مانگی جاتیں۔ جشن کے جلوسوں میں پادری ساتھ ساتھ چلتے تھے اور نیست و نابود ہو جانے والوں کے لئے مغفرت کی دعا کرتے تھے۔

فتح کی خوشی میں سکولوں، کالجوں اور سرکاری محکموں کو چھٹیاں دی گئیں۔ جگہ جگہ برطانوی جہندوں کی سلامیاں اٹھائی گئیں۔ شاعروں نے تہنیت نائے لکھے۔ اخباروں و رسالوں نے خصوصی نمبر شائع کئے چھوٹے چھوٹے علاقوں میں بھی مشاعروں اور قوالوں کا اہتمام کیا گیا۔ شہر بہ شہر نورنگ ڈرائے گھمائے گئے جن میں ہلر مسیح یعنی اور بیرد ہتوکا کا دارا دارا کرنے والوں پر جو توں نردووں، ہلکی سزی سزیوں کی بارش کی جاتی۔ میں ایسے ڈراموں میں تھیلا بھر کر پلپے بٹکین لے جاتا تھا کہ ان کا نشانہ خوب لگتا تھا اور ان کا لمبہ آسانی سے اترتا نہیں تھا۔

ماسٹر بالی کو اس فتح کی ذرہ بھر خوشی نہ ہوئی تھی۔ ذہنی کشر صاحب نے انہیں ضلع کے فنکشن کے لئے بلایا تو بیمار ہو گئے۔ مقامی ڈاکٹر نے بموجب ارشاد جناب ڈپٹی کشر صاحب انہیں چیک کیا تو واقعی شدید پیش اور مروڑ کے مریض نکلے، انہیں دو ایچ جی تو الٹا اثر ہوا۔ مرض نے شدت اختیار کر لی اور وہ مرتے مرتے بچے۔

میں نے ان سے اس فتح عظیم سے کنارہ کشی کر کے لیٹے رہنے کی بابت پوچھا تو ایک سردی آہ بھر کر بولے "کیسی فتح اور کیسی شکست یہ سب کھیل تماشا ہے۔ کچھ اوپر والے نے رچا رکھا ہے۔ کچھ ان مورکھوں نے وقت کاٹنے کو اپنا لیا ہے۔ فتح اس کو نہیں کہتے۔"

"تو پھر کس کو کہتے ہیں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

انہوں نے دو تین مرتبہ مقامِ قلب پر زور زور سے ہاتھ مارا اور بولے "اسے فتح کرنے کو فتح کہتے ہیں بندے مارنے کو نہیں۔"

چونکہ ان کا علم محدود تھا اس لیے میں نے آگے بولنا مناسب نہیں سمجھا۔ بھلا بندے مارے بغیر کوئی کس طرح سے فتح حاصل کر سکتا ہے اور دشمن کی پسائی کے بغیر کیسے اعلان کیا جاسکتا ہے کہ فتح حاصل ہو گئی ہے۔ بد مقابل کو نیست و نابود کئے جانا فتح کا احساس کیونکر ہو سکتا ہے اور بد ذن حریف کا قلع قمع کئے کس طرح سے فتح کی خوشی منائی جاسکتی ہے۔

ماسٹر صاحب کئی دن تک بیمار رہے اور بچی دانے کا لعاب اور گوند کثیر پیتے رہے۔ فتح کی خوشیاں منا سکتے کے چند ہی دن بعد ہندوستان بھر میں سیاست کا بازار گرم ہو گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ نے ایک دوسرے کے سامنے پرے جمائے اور ان کے درمیان نظریات کی جنگ شروع ہو گئی۔ ہمارے تخت پور میں گوہندو سکھ آبادی نوے فیصد کے قریب تھی پھر بھی مسلم لیگ ختم ٹھونک کر ان کے مقابل آگئی اور اس نے اپنے حقوق کا علم بلند کر دیا۔ مسلمان تعداد میں کمی، دولت میں صفر، ملازمت میں قلیل اور تعلیم میں برائے نام ہونے کے باوجود ایک طاقت بن کر ابھر رہے تھے۔ وہ ایک طاقت بن کر کیوں ابھر رہے تھے اور اتنی ساری کمزوریاں مل کر ایک بڑی کمزوری کے بجائے طاقت میں کیوں منتقل ہو رہی تھیں ایک راز تھا جس کی سمجھ نہ مسلمانوں کو تھی اور نہ ان کے حریفوں کو۔

مسلمانوں کے حریف زیادہ چڑھے لکھے زیادہ دوتند زیادہ تربیت یافتہ اور سیاست میں بہت ہی آگے بڑھے ہوئے تھے۔ ان کے پاس حالات کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ جدوجہد میں وہ مسلمانوں سے بہت آگے تھے۔ ایثار، اخلاص، قربانی اور وطن پرستی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ زمانہ ان کے ساتھ تھا۔ انگریز انہیں ہر طرح کی رعایت دے رہے تھے اور ان کی مدد پر کمر بستہ تھے۔ برطانیہ کانگریس کو ہندوستان کی واحد نمائندہ جماعت سمجھتا تھا اور کانگریس اپنی کہنہ مشق کی بنا پر ہوا کے گھوڑے پر سوار تھی۔ بالی طاقت کے علاوہ ان کی عددی قوت ایک واضح اور جان بوجھ کی ترجمان تھی۔ لیکن یہ سارے

حوال مل کر فیصلہ مسلم لیگ کے حق میں دے رہے تھے اور کانگریس کے سارے نمائندہ ہندو سے ضرب کھا کر جواب مسلم لیگ کے حق میں نکال رہے تھے۔ ہندو سے ہندو کے تھے حاصل ضرب مسلمان کے کھاتے میں کریڈٹ ہو رہا تھا۔ پانسہ کانگریس پیچھلکی تھی مگر مسلم لیگ کے گھر کی طرف پگ رہی تھی۔

مسلم لیگ کی اس رقص کناں پیش قدمی پر سب سے زیادہ غصہ ان مسلمان رہنماؤں کو آتا تھا جو قیام پاکستان کے دل سے مخالف تھے اور پاکستان کے لفظ کو برداشت نہیں کرتے تھے۔ نہ تحریریں نہ تقریریں نہ ان دونوں کے درمیان کسی اور صورت میں الٹیں پاکستان کی منزل و غمناکی ہوئی اپنے آرزو مندوں کی طرف بڑھ رہی تھی۔ بالکل اس شیش کی طرح جو ڈاک گاڑی میں چپ چاپ بیٹھے مسافروں کی طرف بڑھتا رہتا ہے۔ مسافر نہ کوشش کر رہے ہوتے ہیں نہ جہد مسلسل میں مصروف ہوتے ہیں نہ ڈبے کے اندر اچھل کود کر شیش کو آوازیں دیا کرتے ہیں نہ ہم سفر کو ساتھ ملا کر منزل کی طرف بھاگ رہے ہوتے ہیں۔ بس بیٹھے ہوتے ہیں۔ چپ چاپ خاموش کچھ اونگھتے ہوئے کچھ سوئے ہوئے کچھ ان دونوں کے درمیان تختوں کے ساتھ ڈھول گائے ہوئے۔ بس ان کی ایک مشیز کہ آرزو ایک مستحق خواہش اور ایک سانچھی اچھا ہوتی ہے کہ شیش پر پہنچنا ہے اور شیش خود بخود گھٹنوں کی منزل منوں میں طے کرنا ان کی طرف لپکتے لگتا ہے۔ وہ خود منزل کی طرف نہیں بڑھتے منزل ان کی مستحق خواہش کی دُور سے بندھی اپنے آپ ان کی جانب تھپتھپتی لگتی ہے۔

تخت پور کے لوگوں میں اب وہ پہلے والی مصنوعی محبت اور جھوٹے منہ کا بھائی چارہ نہیں رہا تھا۔ حقیقتیں کھل کر سامنے آگئی تھیں اور دوست دشمن کے پرے ایک دوسرے کے مد مقابل کھڑے ہو گئے تھے۔ رات کے وقت اپنی اپنی بستیوں سے اپنے اپنے نعرے بلند ہوتے اور دن کے وقت لوگ ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کھرا کر کئی کاٹ جاتے۔

راولپنڈی اور لاہور سے خربار تھیوں کی نقل مکانی شروع ہوئی تو ہم کو احساس ہو گیا کہ اب ہم تخت پور میں نہیں رہ سکتے۔ اب اس جگہ کو چھوڑ کر جانا ہی پڑے گا۔ چودا گت کی رات فحک بارونج کر ایک منٹ پر جب آل انڈیا ریڈیو لاہور سے پاکستان براڈکاسٹنگ سروس کی لٹاؤ سمعہ ہوئی تو تخت پور کے درو دیوار پاکستان زندہ باد اور اللہ اکبر کے نعروں سے گونج اٹھے۔ صبح اک قیامت کا سماں تھا۔ ہمارے محلے کے ایک کونے میں کہادوں کے گھروں کو آگ لگا دی گئی تھی اور لوگ جیٹیں مارتے تالہ و شیبون کرتے اندر کے بچے مکانوں اور بچی

گیوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

میں حوصلہ کر کے کسی کو بتائے بغیر گھر سے نکلا اور سیدھا بازار پہنچ گیا۔ کچھ دکانیں بند تھیں اور چند ایک کھلی تھیں۔ بازار میں لوگ موجود تھے لیکن بازار کی رونق نہیں تھی۔ میں کچھو بساطی کی میز حیاں چڑھ کر سیدھا مسٹر صاحب کے پاس پہنچ گیا۔ وہ اپنے کورے گھرے کے پاس فرش پر اکڑوں بیٹھے گلاس میں پانی اٹھیل رہے تھے۔ میں نے فرش پر زور کا پاؤں مار کر تالی بجا کے بجزنگ ملی کا نعرہ مارا تو وہ اسی طرح بیٹھے گلاس بھر رہے تھے نہ لڑے نہ پیچھے مڑ کر دیکھا نہ پہلو بدلا۔ سر و قد اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور پانی پینے لگے۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا ”چلے میرے ساتھ میں آپ کو لینے آیا ہوں۔“

”کہاں؟“ انہوں نے گلاس گلاس سے ہٹا کر پوچھا۔

”میرے گھر ہمارے محلے۔“

”لیکن کیوں؟“

”لیکن کیوں اس لئے کہ یہاں اب آپ کا رہنا خطرے سے خالی نہیں آپ کو میرے

ساتھ چلنا ہوگا۔“

”پھر انہوں نے پوچھا۔“

”پھر یہ کہ کل قافلے کے ساتھ ہم پاکستان روانہ ہو رہے ہیں۔“

”بسم اللہ ضرور جاؤ۔ سبھی بسو۔ پر میں تخت پور نہیں چھوڑ سکتا۔“

”وہ کیوں؟“ میں نے چیخ کر کہا۔

”وہ اس لیے کہ تخت پور تخت پور ہے اور میرا سب کچھ یہاں ہے۔“

”لیکن یہ لوگ آپ کو مار دیں گے۔“

”مار دیں۔“

”پھر آپ کے پاس کون رہ جائے گا۔“

”پہلے میرے پاس کون رہتا تھا انہوں نے ہنس کر کہا۔“

”آپ یہ بہادری چھوڑیں اور انھیں اسی وقت“ میں نے چڑ کر کہا۔

”میں نے کب بہادری کا دعویٰ کیا تھا؟“ وہ مسکرا کر بولے ”ہم تو گانے بجانے

والے لوگ ہیں اور بہادری سے بہت دور رہتے ہیں۔“

میں نے خوشامد اند لہجے میں کہا ”سرکار یہ باتیں کرنے کا وقت نہیں آپ کو میرے

ساتھ چلنا پڑے گا۔“

کہنے لگے ”میرا سب کچھ تو ادھر ہے، میں ادھر جا کر کیا کروں گا؟“

”کیا ہے آپ کا ادھر سب کچھ؟“ میں نے غصے سے پوچھا ”زمین۔ مکان۔ جائیداد۔ مرے بچے؟“

ماسٹر صاحب تھوڑی دیر خاموش رہے۔ پھر سر جھکا کر بولے ”ادھر میرے باپ کی قبر ہے۔ وہ بیچارہ ساری عمر اکیلا رہا اور اکلایا ہے، میں ہی مر گیا۔ اب ایک مرتبہ پھر اسے اکیلا چھوڑ جاؤں، بہت پریشان ہو گا اور گھبرا جائے گا، چڑیا بٹال ہے اس کا۔“

میں نے کہا ”آپ کا خیال ہے یہ قبریں باقی رہیں گی؟ یہ ڈھیریاں؟ اسی طرح اور اسی حالت میں ’بولے‘ یہی تو قائم رہنے والی چیز ہے۔ انسان بیچارہ تو فانی ہے، آج مرا کل دوسرا دن۔“

مجھے ان کی اس بات سے کوئی حیرانی نہ ہوئی۔ حالات ہی اس قدر سنگین تھے کہ انہوں نے سب کے ذہن ماذن کر دیئے تھے اور ہر ایک کی سوچ گڑباز دی تھی۔ خوفزدہ لوگ، اللہ جلّول باتیں کرنے لگے تھے۔

ماسٹر صاحب نے ایک الاچی منہ میں ڈالتے ہوئے کہا ”یہ جو تقسیم ہوئی ہے ناں غلط ہوئی ہے، یہ اس طرح سے رہے گی نہیں“ مجھے ان کی یہ کافرانہ بات سن کر بہت غصہ آیا، منہ سے تو کچھ نہ بولا، بس بیچ تاب کھا کر رو گیا۔

انہوں نے الاچی کا چھلکا آہستگی سے منہ سے نکالا اور کہنے لگا ”یہ بابے بڑے طرفدار لوگ ہوتے ہیں الگ الگ نہیں رہ سکتے۔ زندہ لوگ الگ الگ ہو سکتے ہیں ایک دوسرے سے جدا ہو کر زندگی بسر کر سکتے ہیں پر یہ بابے بڑے قسمی ہوتے ہیں۔ یہ نہ تو اپنی نسبت چھوڑ سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے پیاروں سے بے تعلق ہو سکتے ہیں۔ یہ اپنے سلسلے کے اندر رکی رہتے ہیں۔ تم لوگوں نے بڑی غلط لکیر کھینچ دی ہے، یہ رہے گی نہیں۔“

اگر وہ میرے استاد نہ ہوتے تو شاید اس خطرناک لمحے میں میرا ہاتھ ان پر اٹھ جاتا۔ وہ اپنی دھن میں بولے جا رہے تھے ”وہ کچھ شغنائی داتا اپنے پیارے اجمیری سے کتنی دیر الگ ہو کر رہ سکتا ہے۔ اس پیارے سے جس نے ان کے قدموں میں پیٹھ کر چلے گا اور مراقبہ کیا۔ بابا فرید یہاں پانچویں میں اس کا بائیکاٹ نام دین دلی میں، یہ کب تک ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں گے۔ کیسے جبر کی خفیں کاٹیں گے۔ دوبار صاحب امرتسر میں اس کی بنیاد رکھنے والے

میاں میر لاہور میں دوبار صاحب کب تک اپنے بابا مستری سے الگ رہے گا۔ یہ تو سورکھ لوگوں کی کم عقلی ہے۔“

میں نے کہا ”سرکار یہ تو سکھوں کا اپنا فیصلہ ہے اور انہوں نے اس فیصلے کے ساتھ تلواریں بھی گھما دی ہے۔“

میں نے کہنے لگے ”جلدی انہیں یہ تلواریں گھمانی پڑ جائے گی۔ آج نہیں پچاس سال اور سبکی۔ پچاس سال بعد نہ سبکی سو سال بعد سبکی دو سو سال بعد سبکی لیکن اس فیصلے پر نظر ثانی ضرور ہوگی۔ جب تک اجمیر اندر نہیں آئے گا سکون نہیں ہوگا۔ یہ بابے بڑے طرفدار اور جائیداد لوگ ہوتے ہیں اپنوں کو نہیں چھوڑتے!“

اب ان کی ایسی احمقانہ بات کا کیا جواب ہو سکتا تھا۔ میں پاس ادب سے بولا نہیں اسی طرح کھڑا رہا، نیچے سکھوں کا ایک جھنڈ جو بولے سو نہال مت سری نکال کے نعرے مارتا کہ پائیں لہر انا چوک میں آکر ٹھہر گیا۔

ماسٹر صاحب نے کہا ”بیٹھ جاؤ اور اس لہر کو گزر جانے دو۔“

جب ہمارا قافلہ رات کے ایک بجے تخت پور سے نکلا تو ہمارے ساتھ بلوچر جمنٹ کے صرف پانچ سپاہی تھے اور ان کے ٹرک پر برین سمن لگی ہوئی تھی۔ قافلے میں تخت پور کے سارے مسلمان تھے سوائے ماسٹر ہالی کے!

ہم اپنا آبائی شہر چھوڑ کر لاہور آ گئے تھے اور لاہور میں میرا دل نہیں لگتا تھا۔ لاہور ایک بڑا سا شہر تھا۔ اس میں بڑے بڑے لوگ تھے۔ بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ بڑے بڑے راستے تھے اور ہر شخص اپنے آپ کو نیچو مار دیکرے نیست سمجھتا تھا۔ صفاں والے چوک کے جس اجڑے ہوئے گھر میں ہم آکر ٹھہرے وہ آدھا جلا ہوا تھا۔ نیچے کے تین کمرے دھونے ہوئے تھے اور اوپر کا چوبارہ اکھ کا ایک ڈھیر تھا جس کے گارڈر آگے ترچھے ہو کر دوسرے گھر کی دیواروں کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ ابائی کا خیال تھا کہ ہمیں چند روز یہاں قیام کرنا ہو گا پھر جب یہ مار دھاڑ ختم ہو جائے گی اور امن و سکون ہو جائے گا تو ہم واپس تخت پور چلے جائیں گے اور اپنا بند کیا ہوا گھر کھول کر اس میں پھر سے آباد ہو جائیں گے۔

ابائی کو انگریز پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ اس کو منصف، منظم اور اصول پرست قوم سمجھتے تھے اور ہر معاملے میں اس کی تعریف کیا کرتے تھے۔ لیکن گور و اسپور کو ہندوستان میں شامل کرنے کے بعد ان کا ماتھا ٹھنکا اور وہ خاموش ہو گئے۔ پھر کشمیر کی جنگ شروع ہو گئی اور انگریز کی اصول پرستی کا بھانڈا عین چور ہے میں پھوٹ گیا۔ تخت پور واپس جانے کا خیال ہوا میں تحلیل ہو گیا اور ہم نے بازار سے نئی چارپائیاں خرید کر زمین سے اپنے بستر اٹھائے اور اس گھر میں آباد ہو گئے جس کا آدھا حصہ جلا ہوا تھا۔ جس روز ابائی عارضی مستقل الاٹمنٹ کی چٹ لے کر آئے تو ہم نے تخت پور کا خیال اپنے دل سے مستقل طور پر نکال دیا اور لاہور کے ہو کر رہ گئے۔

میرے بھائیوں نے گھر کا خرچ چلانے کو چھوٹے چھوٹے کاروبار شروع کر لئے۔ لیکن یہ کاروبار کچھ پیمیری کھانے کی نوعیت کے تھے۔ تھیلے بھائی جب دوپہر کے وقت ٹھنڈا دودھ پینے گھر آتے تو ان کی سائیکل پر بہت سے ڈبے اور پیکٹ ہوتے جنہیں وہ ایجنسی کے ڈپو میں

پر سپلائی کرتے تھے اور رسید یک سے رسیدیں کاٹ کر دیا کرتے تھے۔ بڑے بھائی ٹرکوں کی ریزو اشریں تیار کرنے کی ایک "ٹیکٹری" میں ملازم ہو گئے تھے جو ان کے کسی دوست کی تھی۔ وہ دوست ان کو دوسروں پر لاہور دیتا تھا اور دوپہر کے وقت کھانا بھی اپنے ساتھ کھلاتا تھا۔ ابائی زیادہ وقت مسجد میں گزارتے اور مغرب کے بعد گھر آتے۔

جس گھر میں ہم رہتے تھے اس میں بجلی نہیں تھی۔ پہلے تھی لیکن گھر کو آگ لگ جانے کی وجہ سے کچھ تاریں جل گئیں تھیں اور باقی کی کاٹ دی گئی تھیں۔ ایک لائٹیں مستقل رسوئی میں رہتی اور دوسری ضرورت کے مطابق کمروں میں گھومتی رہتی۔ تھیلے بھائی نے دو تین مرتبہ بجلی کا کنکشن حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ان کو کامیابی نہ ہوئی۔ سفارش کنندہ ان سے گیارہ روپے لے کر بھی یہ کام نہ کر سکا اور شرمندہ ہو کر غائب ہو گیا۔ ابان نے مجھے بے مصرف، بیکار اور آدھ گرد فوجیوں سمجھ کر یہ ڈیوٹی میرے ذمہ لگا دی کہ میں ہر روز بجلی کے دفتر جایا کروں اور کنکشن حاصل کرنے کی کوشش کیا کروں۔ میں ان کے حکم کے مطابق صبح ناشتہ کر کے گھر سے نکل جاتا اور سڑک کنارے لٹی ہوئی کتابوں کے انبار سے لفٹ اندوز ہو کر شام کے وقت واپس گھر آ جاتا کہ آج کام نہیں بنا۔ کل شاید کوئی واضح صورت نظر آ جائے۔ کوئی ہفتہ دس دن تک مجھے اس بات کا علم بھی نہ ہو سکا کہ بجلی کا دفتر ہے کہاں اور کنکشن حاصل کرنے کے لئے کیا کیا جاتا ہے۔ اصل میں میں نے یہ علم حاصل کرنے کی رحمت ہی گوارا نہ کی۔ سڑک کنارے ایسے اچھی اچھی اور اتنی سستی کتابیں دستیاب تھیں کہ دن گزرنے کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔

ایک شام جب میں بڑے بھائی کی جرح پر اپنے مشن کا کوئی شافی جواب نہ دے سکا تو اچھی صبح ریگل چوک پر لٹی ہوئی کتابوں کی نئی کھپ سے آنکھیں بند کر کے آگے گزر گیا۔ بجلی کا دفتر میکوڈر وڈ پر صنوبر سینما کے سامنے واقع تھا اور اس کے ایک کنارے پر کچے قیے کی نکلیاں تلنے والے کا بڑا سا توہلکا ہلکا حوال اور تیز تیز خوشبو چھوڑ رہا تھا۔ پہلے تو میں نے اس سے دو نکلیاں اور ایک نان لے کر دوبارہ ناشتہ کیا پھر بسم اللہ پڑھ کر دفتر کے احاطے میں داخل ہو گیا۔

دفتر کے اندر ضرورت مندوں، امیدواروں، سائیکلوں اور اینٹوں کا ایک جم غفیر تھا۔ کچھ لوگ عریضیاں لکھ رہے تھے کچھ لکھوا رہے تھے۔ کہیں سودے طے ہو رہے تھے اور کچھ لوگ درختوں کی چھاؤں تلے سو رہے تھے۔ میں نے ایک بزرگ سے بجلی کا کنکشن حاصل

کرنے کی بابت پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اگر ایگزیکٹو انجینئر سے کوئی واقفیت ہے تو یہ کام ہو سکتا ہے ورنہ مشکل ہے۔

میں اپنی مشکل کو ساتھ لے کر بڑی دیر تک ادھر ادھر گھومتا رہا۔ اب ہم دو ہو گئے تھے۔ ایک میں اور ایک میری مشکل۔ جدھر جاتا میری مشکل دم ہلاتی میرے پیچھے پیچھے چلی آتی۔ بیٹھ جاتا تو میرے ساتھ میرے قدموں کے پاس بیٹھ جاتی۔ اٹھ کر چلنے لگتا تو پھر دم ہلاتی میرے پیچھے پیچھے بھاگنے لگتی۔ مشکل کا ساتھ ہو تو آدمی اکیلا نہیں رہتا۔ اس کو کوئی اور دکھ ہو تو ہوا کا پے کا روگ نہیں رہتا۔ جیسے کوئی برات میں شامل ہونے کے لئے اکیلا گھر سے آئے اور اسے انجان لوگوں کے گروہ میں ایک ایسا پرانا دوست مل جائے جو کوئی نہیں اکیلا کھڑا ہو۔ خجائی سے نجات حاصل کرنے کے لئے مشکل کا ساتھ سب سے پاکیزہ پیارا خوشگوار اور مخلص ساتھ ہوتا ہے اس لئے خجالی لوگ اپنا دل لگانے کے لئے کوئی نہ کوئی مشکل ہر وقت اپنے ساتھ لگا رکھتے ہیں۔ کچھ اننگی پر ہٹا کر کچھ اس کے گلے میں پڑھا لیا کرا

ایگزیکٹو انجینئر کے دروازے پر ایک زبردست قسم کا چر اسی کھڑا تھا جس کا کام سائیکلو کو اندر جانے سے روکنا تھا۔ میں آگے بڑھا تو اس نے مجھے بھی اندر جانے سے روکا۔ میں نے اونچی آواز میں انگریزی زبان میں کہا مجھے صاحب سے ملنا ہے اور ایک ضروری کام سے ملنا ہے۔ اس نے پنجابی میں ہاتھ آگے بڑھا کر میرا دستہ روک دیا۔ میں نے اور اونچی انگریزی میں اندر جانے کیلئے زور لگایا تو اس نے پنجابی میں دونوں ہاتھ پھیلا کر مجھے پیچھے دھکیل دیا۔ میں نے بایاں ہاتھ اوپر اٹھا کر اپنی انگریزی کا دلیلیو اور اونچا کر دیا۔ پوچھتا اس کے کہ وہ پنجابی میں ایک زوردار لڑ میرے منہ پر مارنا صاحب کی گھنٹی بجی وہ اندر چلا گیا۔

بہت سے لوگ میرے ارد گرد جمع ہو گئے تھے اور مجھے چر اسی کے ساتھ فل ہاس لڑائی پر اکسا رہے تھے۔ میں اپنی بوٹی ہوئی انگریزی کی گرامر پر غور کر رہا تھا جس میں مصلوں، حرفوں اور فعلوں کی بیشمار غلطیاں سرزد ہو گئی تھیں اور ان لوگوں کی شکلیں دیکھ رہا تھا جو مرعوب صورت بنائے اور عقیدت کے ساتھ سر جھکائے میرے ارد گرد حلقہ باندھے دو ٹروں کی طرح کھڑے تھے اور مجھے ایک عظیم ہیرو سمجھ رہے تھے۔

چر اسی جتن اٹھا کر اور سر جھکا کر باہر نکلا تو اس نے ہاتھ کے اشارے سے کہا "چلو" صاحب اندر بلا تے ہیں "لوگوں نے خوشی کا ایک نعرہ مارا اور میں صاحب کے دفتر میں داخل ہو گیا۔

صاحب ایک بڑے سے آنسو میز کے پیچھے ایک مضبوط سی کری پر براجمان تھے اور چائے پی رہے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے ایک بے تکلف دوست دانے دار چینی لگے بسکٹ چائے میں بھگو بھگو کر کھا رہے تھے۔ ایگزیکٹو انجینئر صاحب نے مجھے کری پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور میں نے بجلی کے کنکشن کی عرضی ان کے سامنے ڈال دی۔ انہوں نے چائے کی ایک پیالی بنائی پرچ میں کچھ بسکٹ رکھے اور میری طرف بڑھادی۔ عرضی پڑھنے کے بعد انہوں نے کمال مہربانی سے فرمایا کہ ہمیں آپ کے گھر کی دائرنگ دیکھ کر کنکشن دینا ہو گا۔ اگر تو دائرنگ ٹھیک ہے پھر تو آج ہی کنکشن مل جائے گا اور اگر دائرنگ میں کوئی نقص ہے یا جمل جگہ ہے یا شارٹ سرکٹ ہے تو پھر آپ کو چند دن انتظار کرنا پڑے گا تاکہ آپ دائرنگ درست کرالیں اور ہم سے سرٹیفکیٹ حاصل کر لیں۔

میں اپنی دائرنگ کی صحیح صورت حال کا نقشہ کھینچنے ہی والا تھا کہ انہوں نے پیش بندی کرتے ہوئے کہا "میں اپنے آدمیوں کو آپ کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ یہ موقع دیکھ کر اصل صورت سے مجھے آگاہ کر دیں گے اور آپ کا کام ہو جائے گا۔" چائے پی کر اور انجینئر صاحب کا شکریہ ادا کر کے جب میں باہر نکلنے لگا تو انہوں نے گرجوٹی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا "کنکشن ملتے ہی آپ کو ایک مرتبہ پھر میرے دفتر آنا پڑے گا تاکہ چند ضروری کاغذات پر آپ کے دستخط ہو جائیں۔" پھر انہوں نے مسکرا کر کہا "ایسا نہ ہوا تو آپ کا کنکشن پھر کٹ جائے گا اور آپ ویسے کے ویسے رہ جائیں گے۔ میں نے اپنے چر اسی سے کہہ دیا ہے "آیو آپ اس سے پوچھتے بناسیدھے میرے کمرے میں آجایا کریں گے۔"

جب میں صاحب کے کمرے سے باہر نکلا تو چار آدمیوں کا ایک گینگ چھوٹے سے ٹرک میں بیڑھی پوڑی اور دوسرا سارا سامان لگا کر میرا منتظر کھڑا تھا۔

ایس ڈی او صاحب مضبوط بدن کے گندمی رنگ اور درمیانے قد کے ایک شریف سے انسان تھے۔ کالی سیاہ چمکدار ڈاڑھی، اعلیٰ درجے کا سلک سوٹ، پچھن دار نیلی اور سرخ ٹائی۔ پاؤں میں بیٹنٹ لیدر کے قیمتی جوتے اور کھونٹی سے لکتا ہوا نپا سولو بیٹ ان کے گینگ نے دو دن لگا کر سارے گھر کی نئی دائرنگ کر دی تھی ہولڈر اور سوچ لگا دیے۔ ڈبے میں بند ایک نیا سوچ بورڈ دیوار پر فٹس کر دیا اور جب میں نے ان سے اخراجات کا بل مانگا تو انہوں نے بتایا کہ ایس ڈی او صاحب نے خود ساری پے منٹ کر دی ہے۔

ہمارے گھر بجلی چالو ہو گئی تو ضروری کاغذات پر دستخط کرنے کی غرض سے میں

ایس ڈی او صاحب کے دفتر گیا۔ دفتر میں کچھ سائیکل جمع تھے۔ ایس ڈی او صاحب نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور سائیکلوں کے تھامنے بیٹھنے لگے۔ جب کمرہ خالی ہو گیا تو انہوں نے چہرہ اسی کو بلا کر حکم دیا کہ ابھی کسی اور کو اندر آنے نہ دینا۔ پھر تھوڑی دیر بغور میری طرف دیکھتے رہے اور آہستگی سے بولے ”آپ کے ایک دوست تھے فلوٹ بجانے والے۔“

میں ان کی یہ بات سن کر منانے میں آگیا اور بڑی دیر تک گم صدمہ بیٹھا رہا۔ انہوں نے پھر پوچھا ”آپ کے ایک دوست تھے بانسری بجانے والے۔“

میں نے کہا ”وہ میرے دوست نہیں تھے میرے استاد تھے ماسٹر بائی۔ اقبال حسین کلارنٹ نواز۔ وہ فلوٹ نہیں بجاتے تھے کلارنٹ بجاتے تھے۔“

”وہ کہاں آباد ہوئے ہیں؟“ انہوں نے پوچھا۔

”وہ تخت پور سے ہمارے ساتھ نہیں آئے وہیں رہ گئے ہیں۔“

”وہیں؟“ ان کی چیخ سی نکل گئی۔ ”ان کو تو مار دیا ہو گا۔“

”نہیں دو ہیں تو زندہ لیکن ان کی کوئی تازہ خبر مجھے معلوم نہیں۔“

”جب ان کی کوئی تازہ خبر معلوم نہیں تو پھر آپ کس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ زندہ ہیں۔“

”کوئی مہینہ بھر پہلے میرے خط کے جواب میں ان کا ایک کارڈ آیا تھا۔“

”بہت ممکن ہے اب تک ان کو شتم کر دیا گیا ہو۔“

”ممکن ہے آپ ٹھیک کہتے ہوں لیکن میرا دل کہتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔“

”آپ نے پھر نہیں لکھا۔“

”پھر تو نہیں لکھا“ میں نے کہا۔ ”لیکن کل پرسوں تک پھر لکھنے کا ارادہ ہے۔“

”اب کی بار خط لکھیں تو ان کو میرا سلام ضرور عرض کر دیں۔“

میں حیرت سے ایس ڈی او صاحب کا چہرہ دیکھنے لگا۔ کچھ خدو خال ایسے تھے جو مانوس ضرور نظر آتے تھے لیکن سارے چہرے کے چوکھٹے میں ڈنڈا ہو کر جھانکیں مائیں سے کرنے لگتے تھے۔ جب میں بڑی دیر تک ان کے چہرے کو اسی طرح تنکٹا رہا تو انہوں نے مسکرا کر کہا ”آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔“

”جی نہیں۔ بالکل نہیں“ میں نے اعتراف کیا۔

کہنے لگے ”میں وہی شخص ہوں جس نے بھائی گور بخش سنگھ کی دکان سے قرآن شریف چرایا تھا اور پھر آپ لوگوں نے اس کا بدلہ ادا کر کے مجھے چھڑ لیا تھا۔“

میں پتھر کا بت بنا بیٹھا تھا اور ایس ڈی او صاحب کہہ رہے تھے۔ ”اس روز لوگوں نے مجھے بہت مارا تھا اور اگر آپ دونوں میری مدد کو نہ پہنچتے تو شاید مار مار کر وہ مجھے مار ہی دیتے۔ مار نہ دیتے تو تھامنے ضرور لے جاتے۔ میرا والد ایک غریب کلڑہار تھا جو بیکار درخت خرید کر ان کا پندھن بنا کر بیچا کرتا تھا۔ لیکن اس سے اس کو کوئی خاص آمدنی نہیں ہوتی تھی۔ گھر میں ایک دقت چو لہا جاتا اور کاشٹھ کا کام کرنے کے باوجود ہم کھانا پر نہیں سوتے تھے۔ اگر آپ میری مدد نہ کرتے اور لوگ مجھے تھامنے لے جاتے تو میرے والد نے شرم سے مر جانا تھا۔ وہ بڑا غیرت مند بابا تھا۔“

کشمیر کی جنگ شدت اختیار کر گئی اور پاکستانی افواج نے افغان مجاہدوں کی مدد سے کشمیر کا بہت سارا علاقہ بھارتی قابضوں سے آزاد کرانے کا کام آزاد کشمیر رکھ لیا تھا۔ آزاد کشمیر میں ایک پراسنے ٹرانسمیٹر کو جوڑ جاؤ کراؤ تالیس اعشاریہ چار میٹر پر ایک چھوٹا سا سٹارٹ ویو ریڈیو سٹیشن قائم کر دیا گیا جہاں آزادوں کے ترافوں کے ساتھ ساتھ حریت پسندوں کے انٹرویو۔ سرینگر سے بھارتی پراپیگنڈے کے دندان شکن جواب۔ جذبہ حب الوطنی کے فیر اور چھوٹے چھوٹے ڈرامے بھی نشر ہوتے تھے۔ اس ریڈیو سٹیشن پر آل انڈیا ریڈیو کے نامور صد کلند محمد حسین تریخ نور اور امیر خان جیسے باکمال لوگ جمع ہو گئے تھے اور ان کو فیڈ کرنے کے لئے یوسف ظفر ’مستز مفتی‘ اعجاز یالوی اور ممتاز ملک جیسے سکرپٹ رائٹر آستین چڑھائے ہر وقت مستعد رہتے تھے۔

تخت پور کے زمانے میں ہمیں نے چنا افسانے ادبی دنیا کے لئے لکھے تھے جن پر مولانا صلاح الدین نے اپنے مشفقانہ نوٹ چڑھا کر کچھ اس طرح سے شائع کیا کہ میں ذرا وقت سے پہلے اور ضرورت سے زیادہ ادبی حلقوں میں متعارف ہو گیا تھا۔ جب اعجاز یالوی آزاد کشمیر ریڈیو چھوڑ کر ولایت گئے تو ان کی جگہ کانٹریکٹ پر مجھے عارضی نوکری مل گئی۔

پہاڑوں سے میرا تعارف آزاد کشمیر ریڈیو کی بدولت ہوا اور میں ان کے جادو سے ایسا مسحور ہوا کہ میرا سارا ماضی ان کے سامنے بے معنی سا ہو کر رہ گیا۔ ریڈیو سٹیشن پہنچ کر سکرپٹ لکھنا اور پھر سارا وقت پہاڑوں کے ارد گرد اوپر نیچے آگے پیچھے گھومنا اور مسلسل گھومنا۔ اس سحر آلود زندگی نے مجھ پر کچھ ایسا اثر کیا کہ میں نے ماہر پالی کو دو تین خط لے لے اور تاثیر سے بھرے لکھ کر روانہ کئے۔ جن میں ادب کی چاشنی بھی تھی اور سکرپٹ رائٹنگ کا کمال بھی تھا۔ ان کے جواب میں استوا کا ایک مختصر سا خط آیا جس میں میرے کمال فن کی دلو بھی تھی اور میرے ادیب بن جانے کی سراہنا بھی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے تخت پور کے

حالات بھی لکھے تھے جن میں اداسی کا عنصر نمایاں تھا۔ ان کے جواب کے تیسرے روز ممتاز مفتی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا کہ تھانے سے ایک سفید پوش الپکار آیا تھا جس نے میری بابت مفتی سے کچھ استفسار کیا تھا۔ وہ کسی خط کا تذکرہ بھی کر رہا تھا جو مجھے ہندوستان سے آیا تھا اور جس سے میرے بھارت کے ایک نے نواز سے تعلقات کا پتہ چلا تھا۔ مفتی نے کہا ”اس نوکری پر وہ کریم دشمن ملک کے لوگوں سے خط و کتابت نہیں کر سکتے۔ یہ بڑا سرلیخ انکس مقام ہے جنہیں خطا رہنا ہو گا۔“

میں نے استوا مکرم سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع کر دیا اور پہاڑوں کے طواف میں شدت پیدا کر دی ڈکوال روڈ پر جمیکا گلی سے بہت آگے ایک چھوٹی سی سطح مرتفع پر بابا سنگل شاہ کی کنیا تھی جس میں ایک محکم شیم جٹا وھاری جولان من ڈیڑھ من وزنی موٹے موٹے سنگل پہن کر اونچے اونچے کوک فریاد کیا کرتا تھا۔ لاریاں اور ٹرک اس جگہ رک کر بابا سنگل کی سلامتی اتارتے تھے اور ڈائریور اپنے کلیئر کو موسم کے میوے دے کر کنیا تک بھیجا کرتا تھا۔ کلیئر زائباے خور دی کنیا سے بہت دور رکھ کر اپنے پاؤں واپس بھاگ آتا کہ بابا گالیاں بھی دیتا تھا اور پتھر بھی مارتا تھا۔ یہ بابا انسانوں اور انسانی رشتوں کا دشمن تھا اور ہر ہر رشتے کا نام لے کر اونچے اونچے گالیاں بکتا۔ خاص طور پر بھائی کا نام آجانے پر اسے زور سے چلاتا اور اس قدر چیخا کہ چیزتہ کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پہاڑی کو بے بھی اپنا ٹھکانہ چھوڑ کر ولوی میں پھیل جاتے تھے۔ بڑے زور زور سے سنگل کھڑکا تھا اور بھائی کو ماں بہن کی گالیاں دیتا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے اس کی کنیا سے دور کھڑے ہو کر اس کا چیخنا چلنا اور گالیاں بکنا مزے لے لے کر سنا کرتا۔ اس کو بھی اس بات کا احساس ہو گیا تھا کہ کوئی باقاعدگی سے آکر اس کا دوا دلا سنا ہے اور دوا دیتا ہے۔ جب میرا حوصلہ اور اس کا انکساف بڑھا تو ہم ایک دوسرے کے قریب ہونے لگے۔ پہلے یہ قریب صداکاری سے بڑھی۔ ادھر سے دو گالی دیتا ادھر سے میں کھرج میں تان اٹھاتا۔ وہ بھائی کو گالی دیتا میں بھائی کے بھائی کو گالی نکالتا۔ دو خاموش ہو جاتا تو میں طرح طرح سے کہتا تھا وہ گرجتا تو میں چند فنٹ اور کھسک کر کنیا کے قریب ہو جاتا۔

ایک روز اس نے مجھے بہن کی گالی دے کر اونچی آواز میں کہا ”سور دیا پچھانیزے آجا۔“ میں اس کے بیڑے آگیا تو اس نے سنگل کا ایک سرا کھڑکا کر کہا ”ہور نزدیک آجا۔“ میں ہور نزدیک ہو گیا تو مجھے دیکھ کر ہنسنے لگا۔ اس کی ہنسی کافی غلیظ اور فحش قسم کی تھی۔ اپنی دونوں ٹانگیں کھول کر اور گودی طرف اشارہ کر کے بولا ”یہاں آجا میں تجھے گھوڑے کی سیر

کراؤں۔ "ہمارے گھر میں تخت پورہ گھوڑے تھے مگر میں نے کبھی ان کی سواری نہ کی تھی۔ مجھے گھوڑے کے قد اور سائز سے ویسے ہی خوف آتا تھا اس لیے میں بابا سنگل کے گھوڑے سے خوفزدہ ہو کر واپس آ گیا۔

اب ریڈیو سٹیشن پر کام کافی بڑھ گیا تھا۔ نظامی صاحب نے دو نئے فیڈر شروع کر دیے تھے جن میں سے ایک کی پوری ذمہ داری مجھ پر ڈال دی تھی۔ سکرپٹ لکھنا کامیاب کر دانا میری سہولت لینا اور شام کو اپنی نگرانی میں براڈکاسٹ کر دانا تقریباً سارا دن لے لیتا تھا۔ میری سریں اور کوہ نور دیاں یک فلم موقوف ہو گئیں اور میں صرف دفتر کا ہو کر رہ گیا۔ پہاڑوں کے وہ لمبے لمبے راستے جنہوں نے زندگی کو وسعت عطا کی تھی محدود ہو کر ریڈیو سٹیشن کی تنگ داوی میں گھر گئے تھے اور میں کام کرنے سے کچھ گھبراتے اور کسی حد تک کھرانے لگا تھا۔

ایک شام میں نے بابا سنگل شاہ کو عقیدت مندوں کے گروہ میں آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کشمیر پوائنٹ کی طرف آتے دیکھا تو میں سڑک کنارے ایک پتھر سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھکا گئی کی جانب سے اسی طرح لٹم پٹم چلتا اور سنگل کھڑکا تا یہاں تک پہنچا تھا اور اس کے عقیدت مند سینوں پر ہاتھ باندھے اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے۔ جب وہ میرے قافلے میں پہنچا تو رک گیا۔ پھر اونچی آواز میں ہنسا۔ میری طرف اشارہ کر کے ایک کڑک دار ماں کی گالی دی اور بولا "اُوئے دنیا دار کتیا" کامیا کر وہ حیا فقیر کے پاس آنے سے ڈر گیا پھر دنیا پکڑ لی۔ پھر دھو تو کا ہو کر رہ گیا!

پتہ نہیں اس کو کیسے معلوم ہو گیا تھا کہ میں دھو تو کی ملازمت کرتا ہوں اور میری نوکری نے مجھے پہلے کے مقابلے میں اور زیادہ مصروف کر دیا ہے۔ میں نے اس کی بات کا تو کوئی جواب نہ دیا البتہ اس کے قریب جانے کا پھر سے حوصلہ نکال لیا۔

بابا سنگل شاہ کی عمر 38 برس کی تھی اور اس کا نام محمد الیاس تھا۔ وہ فتح گڑھ چوڑیاں کے ایک کھاتے پیتے زمیندار گھرانے کا فرزند تھا اور جوانی میں ہی اس کی اللہ سے لوٹ گئی تھی۔ وہ خدا کی تلاش میں گھر سے نکلا اور گھاٹ گھاٹ کا پانی پی کر خالی ہاتھ گھر واپس آ گیا۔

بابا اپنی کنیا کے باہر کچھ اس سنجیدگی سے باتیں کر رہا تھا کہ مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا یہ وہی گالیاں دینے اور گند کھنے والا انسان ہے۔ اس کی ہیئت کڈائی دی تھی لیکن اس پر مسکراہٹ کی ایک سفید بدلی سایہ قلمن تھی۔ اس کے سنگل اتنے ہی مونے اور ویسے ہی غلیظ تھے لیکن ان کے آنکڑوں میں ریشم کی لہلاہٹ پیدا ہو گئی تھی۔ اس کے لہجے میں ایک

دھقان کی سختی تھی لیکن اس میں گالیوں کا نفخ نہیں تھا۔ اس نے میرے سامنے پیلی پیلی بازوئیں اور سیاہ آلو بخاروں کا ایک چمکور کھا ہوا تھا اور بار بار کھانے پر اصرار کر رہا تھا حالانکہ میں دونوں چیزیں تو اتر کے ساتھ کھا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر سکون اور طمانیت کے وہی آثار تھے جو غریب الوطنی میں دوہم وطنوں کے قریب آنے پر پیدا ہو جاتے ہیں۔ وہ میرے اس قدر قریب آ جانے پر بہت خوش تھا اور میں اس کے نزدیک مولے کی طرح مختلط سا بیٹھا تھا۔ الیاس بہت دلچسپ بہت پیار اور بچہ ملنسار شخص تھا اور محبت اس کے اندر چولہے چڑھتی ہٹیا کی طرح ہر وقت جوش مارتی اور کھد کھد کرتی رہتی تھی۔ وہ ہر وقت اپنے رب کی صفت شاہ میں مصروف رہتا اور جب فراغت کا کوئی لمحہ آتا تو منہ بند کر کے اندر حمد اور ورد کرنے اور باہر مانپ کی طرح اہرانے لگتا۔ پھر اس پر جنون کی ایک کیفیت طاری ہو جاتی۔

الیاس فرسٹ ڈویژن میٹرک جنجوہ جات، ہیر وارث شاہ کا حافظ، کبڑی پاپیر، نعت خواں اور شرمیلے نیوں والا جوان تھا۔ ان ساری چیزوں کو آپس میں ضرب دے کر اس نے "عشق" کا حاصل ضرب نکالا ہوا تھا اور عشق اس کو صرف خدا کی ذات سے تھا اور خدا سے نہ ملا تھا نہ ملنا تھا اور نہ ہی اس کے ملنے کی کوئی امید تھی۔ اس کے پیر نے اونچی آواز سے کہہ دیا تھا جا الیاس عشق کر اس ذات کے ساتھ جس نے ساری عمر ہاتھ نہیں آنا۔ جلوہ نہیں دکھاتا، صلح نہیں مارتی، میز سے ہو کے لنگھ جاتا ہے پرت کے نہیں دیکھتا۔

جب میں نے اس سے اس کے پیر کی بابت پوچھا تو ہنس کر کہنے لگا "میرا اندر ہی میرا پیر ہے کوئی باہر والا تو نہیں۔ مجھے اندر سے ہی یہ آواز آتی تھی، ٹھیک ہے؟"

اب میں اسے کیسے بتاتا کہ "ٹھیک ہے۔" مجھے تو نہ کبھی اندر سے آواز آئی اور نہ ہی کسی نے باہر سے اس زور سے پکارا تھا پھر میں کس طرح سے اس کی تصدیق کرتا۔ بس مسکراتا رہا اور اس کی باتیں سناتا رہا۔

الیاس ایک بہت بڑا فراڈ تھا اور اس کو بالکل علم نہیں تھا کہ وہ ایک فراڈ ہے۔ وہ اس شاعر کی مانند تھا جو غریبوں کو کھیاڑوں، سنگدستوں اور کم ہایہ لوگوں پر نظریں لکھ کر ظالموں، مرہایہ داروں اور ستم کشوں کو دار پر کھینچا کرتا ہے اور اس کو بالکل علم نہیں ہوتا کہ وہ خود بھی ایک اجتہاد سب کا لالچی، حریص، خود غرض اور موقع پرست انسان ہے۔ وہ بڑی نیک نیتی اور خلوص دل کے ساتھ شاعری کئے جاتا ہے اور ظلم کو لاکھ بار بتاتا ہے۔ وہ شخص بہ یک وقت اچھا بھی ہوتا ہے اور نہیں بھی ہوتا۔

جب میں ایک ہفتہ کی چھٹی پر لاہور آیا تو مجھے اپنے استاد کے دو خط ایک ساتھ ملے۔ یہ انہوں نے لاہور کے پتہ پر لکھے تھے اور میری غیر موجودگی میں آئے تھے۔ ایک میں تفصیل کے ساتھ تخت پور کے حالات درج تھے اور بڑا سا خط تھا۔

لکھا تھا رجنی کے ہاں بیٹا پیدا ہوا ہے اور وہ اپنے شوہر سے لڑ کر تخت پور آگئی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اس کے سسرال والوں نے خود اسے گھر سے نکال کر وہاں اسے بھیج دیا ہے، لیکن اصل بات کسی کو بھی معلوم نہیں سوائے میرے۔ میں رجنی سے ملا نہیں اور نہ ہی میں نے اس کو کہیں دیکھا ہے۔ نہ ہی مجھے کسی نے اس کا کوئی پیغام دیا ہے، لیکن مجھے معلوم ہے کہ وہ بہت دکھی ہے اور ہر وقت روتی رہتی ہے۔۔۔۔۔ تم پوچھو گے کہ مجھے یہ سب کچھ کیسے معلوم ہوا تو سنو کہ آدھی رات کے وقت اس کا گھر والا میرے چوبارے میں آکر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور روتے ہوئے بولا رجنی کو بچاؤ نہیں تو وہ درد و کراہے پر ان دے دے گی۔ تمہارا تو کچھ نہیں جائے گا میرا سہارا اجڑ جائے گا۔ وہ تم سے پریم کرتی ہے اور ہر گھڑی تمہاری یاد میں ڈوبی رہتی ہے۔

میں نے اس کو خط پانی پلایا۔ مونڈھے پر ٹھایا۔ کندھے پر ہاتھ رکھا۔ تسلی دی اور پوچھا ”تم ہی بتاؤ اس سلسلے میں تمہاری یاد رجنی کی کیا ہو کر سکتا ہوں۔“

اس نے کہا ”تم بھی اس سے اتنا ہی پریم جتنا وہ جانتی ہے۔“ تم بھی اس کو اتنا ہی یاد کرو جتنا وہ کرتی ہے، جیسے خیالوں میں وہ ڈوبی رہتی ہے ایسے ہی تم بھی رہو۔“

میں نے ہنس کر کہا ”یہ کیسے ہو سکتا ہے چڑت جی۔ وہ تمہارے پاس بھاکر میں یہاں تخت پور میں۔ اس کو کیسے یقین دلاؤں کہ میں ہر وقت اس کے چاروں میں ڈوب رہتا ہوں اور اس سے پریم کرتا ہوں۔“

اس نے رو کر کہا ”رجنی نے دھرم ٹاش کر لیا ہے اور وہ مسلمان ہو گئی ہے۔“ اس کا بردے کے سے اٹک گیا ہے اور اس کے اندر سے کئے دینے کی ناپ آتی ہے، میں نے اس کے سینے سے کان لگا کر خود سنی ہے۔“

میں نے کہا ”یہ تمہارا وہم ہے ایسی کوئی بات نہیں، بعض اوقات خیال کے زور پر ایسی آوازیں آنے لگتی ہیں۔“ لیکن اس نے میری بات نہیں مانی اور اپنے کہنے پر اڑا ہاکہ رجنی کے اندر ناو ملی بھتی ہے۔ میرا خیال ہے اس کا دماغ پھر گیا ہے اور وہ اپنی جگہ سے مل گیا ہے۔ اگر تم یہاں ہوتے تو مجھے بڑا سہارا ملتا لیکن اب میں بالکل اکیلا ہو گیا ہوں۔ سارا دن اپنے کمرے میں لیٹے رہتا۔ شام کو نہاد سو کر پھر لیٹ جاتا۔ صبح اٹھ کر منہ ہاتھ دھونا۔ مسواک کرنا اور پھر لیٹ جاتا۔ شام کو اگر طبیعت ہل جائے تو تھوڑا سا ریاض، نہیں تو پھر اسی طرح سے درد پورا کر گھورتے گھورتے رات تک بیٹھ جاتا۔

میرے استاد ماسٹر بانی بات تو خوب کرتے تھے لیکن میں نے ان کی تحریر اس سے پہلے ایسی نہ دیکھی تھی۔ تنہائی نے ادا اسی اور مجھوری نے اور انسانوں کے ایک بڑے سمندر میں بالکل الگ تھلک ہونے کی وجہ سے ان کی تحریر میں ایک اور طرح کی سوچ ابھر آئی تھی اور وہ اچھے خاصے لکھک بن گئے تھے۔

خط میں لکھا تھا کہ لکھو بساٹھی مر گیا ہے اور اس کے بیٹے گوراں دتے نے دکان سنبھال لی ہے۔ دکان سنبھالنے کے بعد سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ میرے چوبارے کا کرایہ پانچ روپے بڑھا دیا ہے۔ میں خوش ہوں کہ اس نے پانچ روپے ہی بڑھائے زیادہ بڑھا دیتا تو میں اس کا کیا بکاؤ لیتا۔ تخت پور میں چنڈی اور ٹنگمری کے بہت سے شرنا تھی آگئے ہیں اور انہوں نے سارے شہر کو گندا کر دیا ہے۔ کچھ نئی دیواریں اٹھائی ہیں کچھ غرق بن چکی ہیں۔ اب یہاں وہ پہلے والی بات نہیں رہی۔

کرموں بننے کے بننے نے اپنے باپ کے ہاتھوں جگ آکر پستول سے خودکشی کر لی۔ بننے کا بیٹا تھا ساری عمر پستول کی شکل تک نہ دیکھی۔ چلانے کا ڈھنگ معلوم نہ تھا۔ نشتانہ چوک گیا خود بھی گر اور پستول بھی ہاتھ سے چھوٹ کر پرے جا پڑا۔ تھانے والوں نے گرفتار کر لیا۔ اقدام خودکشی کا پرچہ تو نہیں ہوا البتہ بنالا سنس پستول رکھے کا مقدمہ بن گیا۔ اب چھ مہینے قید با مشقت کی سزا ہو گئی ہے۔ خوش ہے کہ کرموں کے ظلم و ستم سے نجات ملی خواہ چھ مہینے کے لئے ہی سہی!

خط کے آخر میں اس حسرت کا اظہار بھی تھا کہ رجنی کا بچہ دیکھنے کو بڑا دل چاہتا ہے پتہ نہیں کہ کیا ہے۔ شکل و صورت کیسی ہے اور کس پر گیا ہے۔

ان کے اس طویل خط کو پڑھ کر طبیعت بشاش ہو گئی۔ دل ان کی زیارت کو مچلنے لگا۔ پتہ نہیں اب ان کی شکل و صورت کیسی ہو گی اور کس طرح کے دکھائی دیتے ہوں گے۔

دوسرا خط کھولا۔ اس پر دس دن بعد کی تاریخ تھی۔ لکھا تھا: گور پر بھد کے روز کڑا ہ چھک کر اور کڑا بچن کر و اگور و کا خالصہ بن گیا ہوں۔ نام میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی۔ آئندہ خط اس پتہ پر لکھنا۔ ماسٹر بھائی اقبال سنگھ۔ کلارنٹ نواز۔ چوہدرہ لکھو بسا ملی۔ چوک بزار۔ تخت پور۔

اس مختصر سی عبادت کو پڑھ کر مجھے ایک چکر سا آیا اور میں قریبی چار پائی پر بیٹھ گیا۔ ماں نے قریب آکر میرے ماتھے پر ہاتھ رکھا اور گھبرا کر بولی ”کیا بات ہے تیرا پتہ تو بالکل برف ہو گیا ہے!“

میں نے ماں کا ہاتھ پرے دھکیل کر منہ موڑ لیا لیکن ادھر بھائی اقبال سنگھ کھڑا تھا۔

11

آزاد کشمیر ریڈیو واپس پہنچ کر کام تو شروع کر دیا لیکن اندر ایک صوت ہی واقع ہو گئی تھی۔ دل میں ہر وقت ایک پھوڑی سی چٹھی رہتی۔ خیالات آتے اور پر سادے کر چلے جاتے۔ کبھی کبھی کوئی پرانا بزرگ ساسفید ریش خیال آتا تو اس کے گلے لگ کر رو بنے لگتا۔ یوسف ظفر کو یقین ہو گیا تھا کہ مجھے کسی سے عشق ہو گیا ہے اور اس نے میری محبت کے ہاتھ کو اپنے دامن سے جھٹک دیا ہے۔ محمد حسین بہت ہی جذباتی اور مشفق قسم کا انسان تھا۔ وہ مجھے چھوٹے ہو غلوں پر چائے پلاتا۔ ساتھ گھماتا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بار بار کہتا ”اپنے اندر کی بات ایک مرتبہ تو بتا دے۔ اپنے دکھ کا اظہار کر کے تو دیکھ۔ ہم تیرے دوست ہیں۔ نا کرنی بھی کر کے دکھا دیں گے۔ جان بھی لڑا دیں گے۔ ہر مشکل میں تیرا ساتھ دیں گے کہ ہم بھاگ جانے والوں میں سے نہیں لیکن تو کچھ کہہ تو سکی۔“

اب میں اس سے کیا کہتا اور کیا جانتا اور کدھر سے کہانی شروع کرتا کہ وہ میرے غم میں شریک ہو کر میرے دکھ کا دوا کرتا اور ماسٹر بانی کے سنے پتے میں اس کا نام پرانی املا پر لونا دیتا۔ بڑا بوجھ تھا جو دن پر دن بڑھتا ہی چلا جاتا تھا۔ سارا دن خاموش رکھتا اور شام کو ہونٹ کے کمرے میں لے جا کر آنسوؤں میں بھگو دیتا۔ میں کوئی ایسا خاص مسلمان بھی نہیں تھا خاص کیا ایک عام سا مسلمان بھی نہیں تھا نہ مذہب کے بارے میں کچھ پڑھا تھا اور نہ ہی سوچا تھا۔ پھر پتہ نہیں کیوں استلو کی اس تبدیلی مذہب نے میرے دل پر آری سی چلا دی تھی۔ چلا کیا دی تھی ہر وقت چلتی رہتی تھی۔ بار بار میں دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا اور بار بار رک کر پیچھے کی طرف منہ کر کے کھڑا ہو جاتا۔ جب تک میرا دوسرا حصہ آدھا کٹا ہوا وجود آگے بڑھ کر مرے قہقہے سے واسطہ نہ ہو جاتا میں اسی طرح کھڑا رہتا۔ یہ میری مجبوری تھی۔ اس آدھے حصے کو پیچھے چھوڑ کر آگے کیسے بڑھ سکتا تھا۔

سائیں بابا سنگل شاہ، محمد الیاس پنجوہ، اب بھی انسان کو اور انسانی رشتوں کو گالیاں دیے جاتا تھا۔ جب تھک کر طر حال ہو جاتا تو منہ اوپر اٹھا کر خدا کو طعنے دینے لگتا کہ اچھی کری ہمارے ساتھ بیماری بھی لگائی اور پاس بھی نہیں آئے۔ پاس بھی نہیں آئے اور کوئی پیغام بھی نہیں بھیجا۔ پیغام بھی نہیں بھیجا اور اپنی بولی بھی نہیں سنائی۔ بولی نہیں سنائی تھی تو کوئی رازی بنا دیتے۔ رازی بتائی مشکل تھی تو جلوہ ہی دکھا دیتے۔ جلوے میں بیہوشی کا ڈر تھا تو کوئی روپ بنا کر جھاٹھر پکن کے جھومر ڈال کر ہی آ جاتے۔ اتنی عورتیں روز یہاں سے گزرتی ہیں پاپیادہ، ٹٹوں پر لاریوں میں موٹروں پر کسی ایک میں اتر کر آ جاتے، ہمیں درشن ہو جاتے سواری کو سوا آ جاتا۔ وہ چل پڑتی ہم دیکھتے رہتے ہم بیٹھے بیٹھے وہ چلتی بھلی۔

جس روز میں نے اپنے دل کا درد سنگل شاہ کو سنائے کا تہیہ کیا اس نے میرا چہرہ بھانپ کر اپنی راسم کہانی شروع کر دی کہ ایم اے او کالج امر قسر میں دو سال برباد کرنے کے بعد میں ایف اے کا امتحان دیے بغیر ہی وائس گاؤں آ گیا۔ میری تیار اچھی تھی۔ پچھلے امتحانوں میں نمبر بھی ٹھیک ٹھاک لیے تھے۔ پروفیسر حضرات میری ہائی سیکنڈ ڈویژن مان کر کالج کے پاس پرنسپل کا حساب نکالتے تھے اور میں کم از کم بی اے ضرور کرنا چاہتا تھا لیکن میں مجبور ہو کر سالانہ امتحان سے پانچ دن پہلے گاؤں واپس آ گیا۔ دراصل میرے دل پر جلوے اترنے لگے تھے اور میرے اندر اتنی روک ٹوک ہو جاتی تھی کہ باہر کے لوگ میرے رنگ و ریختے ہڈیاں اور ہڈیاں دیکھ سکتے تھے۔ جب کبھی کوئی جلوہ اترتا میں گھبرا کر کلاس روم سے یا ہوٹل کے کمرے سے باہر نکل آتا اور بظلموں میں ہاتھ دبا کر تیزی سے بھاگنے لگتا اس تیزی سے بھاگنے کی بنا پر ارد گرد کے لوگ میرے وجود کے روشن اور منور شوکیں کو اچھی طرح سے دیکھ نہ سکتے۔ وہ مجھے ”کیا ہو گیا الیاس؟“ کہہ کر گزر جاتے جلوہ سامانی کی یہ کیفیت اس وقت تک جاری رہتی تھی جب تک میں گھاس کے کسی ٹکڑے پر دو قبلہ جھٹ نہ جاتا اور اپنا سر پیچھے نہ ڈال دیتا۔

سنگل شاہ نے کہا ”یہ بکھیرا کوئی ایک آدھ دن کا ہو تا تو میں اسے برداشت بھی کر لیتا لیکن ایسا تو ہر دوسرے جوتھے ہونے لگا تھا۔ میں کب تک بھاگتا اور کہاں تک گھاس کے قلعے دریافت کرتا۔ مناسب سبکی جانا کہ واپس چلا جائے اور آرام سے گھر میں قیام کیا جائے۔ چنانچہ میں گزشتہ چوڑیاں آ گیا اور پرسکون ہو گیا۔

میں اپنے عشق کے دروازے پر کھڑا تھا اور میرے سامنے منظور شدہ ملکوتی وجود اپنی اپنی باری پر باب قبول میں داخل ہو رہے تھے۔ چوہدار نے پر چیاں بھر دیتے ہوئے ایک پرچی

پر میرا نام دیکھ کر کہا ابھی تمہارا نمبر دور ہے، لیکن تم کو نئے عشق میں اترنا چاہتے ہو اس کا خانہ تک نہیں ہول دیکھ لو اور سوچ لو اور کل تک مجھے چار دو دونوں ایک جیسے طاقتور ہیں۔

میرے اندر ایک ہی تانت بچ رہی تھی اور اس نے ایک ہی الپ اٹھایا ہوا تھا۔ رب کے عشق کا اور اسم ذات کی نگوں کا۔ عشق حقیقی کا اور عشق کیا ب کا۔ ایسی طبیعت ہو گئی تھی کہ عرش فرش مال و دولت، زمین جائیداد، کھیت سر بے لکھنا پینا اور حنا بھونا کچھ بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس ایک ہی تار بندھا تھا اور اس پر ایک ہی نام گونج رہا تھا حق! حق! حق!!!

شام کے وقت اچانک ہمارے گھر ساتھ کے گاؤں کے بہت سے مہمان آ گئے۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ بچے بھی اور جوان لڑکیاں بھی۔ تین اونٹوں اور پانچ گھوڑوں کے مسافروں سے ہمارا گھر بھر گیا۔ اندر باہر لوگ کام پر جت گئے۔ میری ماں نے مجھے ایک دھلا دھلیا مجنوں نکال کر دیا اور کہا ”جلدی سے لالو تھیری کے تندور سے پچاس روٹیاں لگو الپ“ جب میری ماں مجھے مجنوں دے کر یہ سمجھا رہی تھی کہ وہاں سے ہلنا نہیں۔ وہ کہے بھی خود بھجوا دوں گی پھر بھی وہیں کھڑے رہنا روٹیاں خود لانا پانچ تھالیں برابر کی لگوا کر دھیان سے مجنوں میں لپیٹتی ہیں۔ پولی گانٹھ باندھ کے گھڑی لٹکا کے لاتی ہے کندھے پر یا سر پر نہیں دھرتی۔ کوئی کہے بھی کہ چودھری صاحب میں چھوڑ آتا ہوں تو اس کو نہیں دینی خود لے کر آتی ہے۔ ”جب میری ماں مجھے یہ ہدایت دے رہی تھی تو مہمانوں کی ایک لڑکی رابعہ بھی ہمارے پاس کھڑی تھی اور میری ماں کی باتیں سن سن کر ہنس رہی تھی۔ اس نے ڈبیوں والا سوٹ پہنا ہوا تھا۔ بیروں میں کالی گرگالی تھی آنکھوں میں کابل اور ہونٹوں پر سرخی تھی۔ ماتھے کے بالوں کو پٹ کر کے اوپر اٹھایا ہوا تھا اور ناک میں سونے کی تیلی تھی۔ اس لڑکی کی کراچی چھوٹی تھی کہ میرے بڑے بھائی سلطان کی ایک مٹھی میں آ سکتی تھی۔ رابعہ کی دونوں گتیں اس کے سینے پر سے ہو کر قمیص کے واسن تک لٹک رہی تھیں اور دونوں پر اندوں میں سفید گونے سے مڑھے چار بڑے بڑے چٹکے جھول رہے تھے۔ لٹکتی ہوئی گتوں اور اس کے پیٹ کے درمیان کوئی فٹ ڈیڑھ فٹ کا فاصلہ تھا۔ اس نے ہنستے ہوئے کہا ”چاچی! بھالیا اس پچاس روٹیوں کا گھڑ کس طرح لٹکا کر لائے گا اس کے ساتھ کوئی بردا بھیج دے“ کہیں آج رات ہم بھوکے ہی نہ رہ جائیں۔ ”وہ پھر ہنسنے لگی اور اس کی ہنسی میں میری ماں بھی شامل ہو گئی۔

لالو تھیری کام تو اب بھی کرتی تھی پر تندور کے سامنے بیٹھ کر روٹیاں نہیں لگاتی

تھی۔ اب یہ کام اس کی بیٹی عشتی کے ذمے تھا جو اپنے دونوں کانوں کے پیچھے لہریاؤں پہ اڑس کر شور میں روٹیاں لگاتی تھی اور ہر جڑ اٹھانے سے پہلے ایک کبھی کا مسح ضرور کرتی تھی۔ تندور میں جھک کر روٹی لگاتے ہوئے یاروٹی اتارتے ہوئے دوسرا ہر لکال کر اپنے کانوں کے آؤیزوں کو کوٹھڑے میں انگلیاں ڈبو کر ٹھنڈا ضرور کرتی تھی۔ پتھاری کے پاس سبکی ایک زبور تھا وہ بھی پتھل کا۔ گھڑت اچھی تھی اور جو کیوں کے مندروں سے ملتی تھی۔ لالو تھوڑی کے جگر میں وزم آگیا تھا اور وہ زیادہ وقت چارپائی پر ہی گزارتی تھی۔ چارپائی پر رات رکھ کر آنا گوندھ لیتی۔ وہیں پیٹھی پیٹھی بیڑے بناوتی۔ گرم روٹیاں کندوری میں لپیٹ کر الگ الگ چھایوں میں رکھ دیتی۔ پرانے آٹے میں سے سری بین لیتی۔ لینے لینے چودھریوں کے نواسوں پوتوں کے لئے آٹے کے شیر چڑیاں اور بکریاں بھی جلاتی۔ دونوں ماں بیٹی کا کام تو اچھا تھا پر ان کے سر پر کوئی مرد نہیں تھا۔

جب میں پچاس روٹیوں کا ٹھنڈا لگا کر اندر داخل ہوا تو راجہ نے ٹپک کر وہ گٹھا میرے ہاتھ سے لے لیا۔ میں نے کہا ”رہنے دو بہت بھاری ہے۔“ تو وہ آنکھیں جھلا کر بولی ”میں تو اس کے ساتھ لائے والے کو بھی اٹھا سکتی ہوں یہ کیا بوجھ ہے۔“

اس نے گٹھا اٹھا تو لپا پر بیٹگی کی طرح کم بوجھ والی سائید پر چلتی چلی گئی۔ اٹھا کھینے کے بعد سنگھ شاہ خاموش ہو گیا اور اپنی گود میں بیڑی ہوئی موسے سنگھ کی ایک لٹ سے کھیلنے لگا۔ میں اس کی کہانی کی کھٹی بڑھتی لہروں کے تجسس میں ڈوب رہا تھا ابھر رہا تھا اور مجھ کو تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ وہ خاموش ہو گیا تو میں بھی خاموش رہا۔ پھر اس نے زور کا ایک نعرہ مارا اور بھائی کے رشتے کو ایک گندی گالی سے یاد کیا۔ میں نے نگاہیں اٹھا کر اس کی جانب غور سے دیکھا تو اس نے سر جھکا لیا اور ایک لمبی سی ہونہ کے ساتھ بولا ”برادران یوسف ازل سے ایک طرح کے رہے ہیں اور اب تک اسی طرح سے رہیں گے۔۔۔ میرے بائیں کان میں احمد باجہ بیٹے لگا تھا اور میں ہر وقت سرحدی گیت کے لوج میں ڈوب رہا تھا۔ یہ آواز ایک سنگھ اور گزریاں کی ملی جلی آواز تھی۔ کبھی مدھم ہو جاتی اور کبھی استے زور سے اڑتی کہ میرا سارا بدن چھٹے لگتا۔ جیسے جیسے میں اس سے لا تعلق ہوتا اس کی لے اور بڑھ جاتی۔ میرے غلاب کے دن قریب آگئے تھے اور میں داخل ہونے والا تھا کہ ایک شام مجھے لالو جھیر ری کی بیٹی عشتی کھیتوں میں مل گئی۔ اس نے بہت سا سائید صحن اکٹھا کر کے ایک بڑا سا گٹھا ہاتھ لیا تھا اور کسی اٹھوانے والے کی رلہ دیکھ رہی تھی۔ میں نے آگے بڑھ کر گٹھا اٹھا لیا تو

میرا ہاتھ پھسل گیا اور گٹھا اس کے سر سے نیچے گر گیا۔ میں اس کا بازو پکڑ کر اسے کھنی کے کھیت میں لے گیا اور جب میں نے اس کی قمیص کا دامن اٹھا کر اس کی گرم گرم چھاتیوں پر اپنا چہرہ رکھا تو وہ ہنسنے لگی اور میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولی ”اپنے اپنے گھرانے کی ریت بالکل ایک سی ہوتی ہے تو بھی اپنے بھائی جلال جیسا ہی ہے۔“ میں نے چہرہ اٹھا کر اس کی طرف غور سے دیکھا تو وہ میرے بالوں میں انگلیاں پھیر کر کہنے لگی ”جس کام کے لئے تو مجھے کھنی کے کھیت میں لایا ہے تیرا بھائی بھی میرے ساتھ یہی کام کر چکا ہے۔ وہ بھی بہت اچھا ہے اور وہ بھی تیری طرح دلیر ہے۔“ اس دن سے مجھے سارے انسان سارے رشتے ماں باپ بہن بھائی عزیز رشتہ دار الگ ساک نہ ہر گز لگنے لگے۔ میں گھریا بہن بھائی اڑدوس پڑوس یاد رکھتا ہوں سب کو چھوڑ کر رات کے وقت گاؤں سے نکل گیا اور جنگلوں پہلوں میں گھومنے لگا۔ دن کے وقت درگاہوں پر حاضری دینی اور راتوں کو کبھی ٹپک لگا کر کبھی سیدھے پدھرے لیٹ کر وقت گزار دیتا۔ احمد باجہ کی جھکا بند ہو گئی تھی اور میں نے پاؤں میں ٹھنڈا دھاتھ لے لیا۔ بابا شاہ طربام کے عرس پر مجھے سدا سہانوں کی ایک ٹولی مل گئی اور میں ان کے ساتھ شامل ہو گیا۔ زلفیں بڑھائیں۔ ہاتھوں میں چوڑیاں پہن لیں تاکہ میں تنھیں اور کانوں میں ڈنڈیاں ڈال لیں۔ پیلا گھاگر اور سر پر لال چڑی لے کر میں ترچھا ناچنا چنے اور گول جھومر ڈالنے لگا۔ میری کوک سن کر لوگ چھکڑے رپڑے روک کر اور دکائیں کھلی چھوڑ کے ہزاری منڈی کے گرد جمع ہو جاتے اور بت بین کر ہمیں جلی ڈالتے دیکھتے۔ ہم جلیاں ڈالتے لوگ فریاد کرتے ناچنا چنے ایک عرس سے دوسرے عرس پر پہنچتے اور ہمارا سال ختم ہو جاتا۔ پورے پانچ سال اور تین مہینے میں نے نہ تو اپنی تنھیں بدلی اور نہ سر ڈاڑھی کے بال منڈوائے۔ جلی ڈالنے جھومر بھرنے ہاکاں مارنے اور کوک پکار میں چوڑیاں البتہ ٹوٹ جاتی تھیں سو عرسوں پر دنگاں ڈالے اور مہار نہیں ہمارے ہاتھ پکڑ پکڑ کر غنی چوڑیاں خود چڑھا دیتے تھے۔

کانوں والی سرکار کے میلے پر پہنچا تو لہاری نے مجھے سوار دھپے اور لٹروں کا ایک لفافہ دلاں کیا اور میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے اسے دھنچ دور کر کے دھکا دیا۔ وہ رونے لگی تو میرے ایک ساتھی ”سہاگن“ نے زور سے اس کی کمر میں ایک دھموکا مارا۔ وہ کھٹکھٹا کر ٹپکی اور اوڑھنی سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے بولی ”ایک مکالگ گیا ایک کا کامل گیا۔ دو لگ جاتے تو دو مل جاتے۔“ اس نے اپنی کمر اور سرین میری طرف کر کے کہا ”اڑیا ایک مکا تو بھی مار دے ایک کا کاتیری شکل صورت کامل جائے گا۔“ میں نے مکا ہوا میں لہرایا اور اس کی

کر دیکھتا رہ گیا۔ پھر ہم جلی ڈالنے لگے اور نرت دور سے کرنے لگ گئے۔ لوگ کہتے تھے میری بچی کی مردہ اور میری کلائیوں کی چمک دکھنی عورتوں کی ہاتھ پھرت سے بھی سندر تھی۔ یہ تو خیر میں نہیں جانتا پر میرے پردوں کی شکار میرے ساتھ سہانگوں میں سب سے بھلے والوں سر دپ دھار تھی۔

جس کالی دھند راتری میں آدمی رات کے وقت مجھے انتر بھید کی روشنی ملی میں اپنی منڈلی چھوڑ کر اس جوت کے پیچھے چلا چلا حق اور سج سے واصل ہو گیا۔ بیو لوہاری اپنے گھر کے دروازے پر گہنوں کی پوٹلی باندھے بیٹھی تھی۔ رات کے اندھیرے میں ہم اس کے گاہوں سے بہت دور نکل گئے۔ میرے پاؤں کے تھکھرے اور ہاتھوں کی چوڑیاں بہت پیچھے رہ گئیں اور ہم سورج نکلنے سے پہلے پلکھونا پار کر گئے۔

تین دن اور تین راتیں ہم نے لنڈا بازار کے ایک ہوٹل میں گزاریں اور پھر مجھے چو کے دیکھی شوہر کا خیال ستانے لگا۔ منڈی مزید کے کے ایک بے آباد اور دیران گھر میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر روٹا اور کر لانا۔ بیو لوہاری مجھے تسلیاں دیتی میرے آنسو پونچھتی اور میرا سر اپنے لوہے جیسے سینے سے لگا کر مجھے لوریاں دیتی پر میری سسکیاں ختم نہ ہوتیں اور میں ہنسنے ہو سکتے اس کے بدن سے چٹ کر سو جاتا۔ جس دن میرے دل سے وہم گمان اور لالچ لپیٹ کی شرم دور ہو گئی اور میں نے بیو لوہاری کا پنڈا چھوڑ کر اس کی مورتی من مندر میں رکھ کر اس کے نام کا چاب شروع کر دیا وہ مجھے چھوڑ کر واپس اپنے خاوند کے گھر چلی گئی۔

الیاس نے ”حق اللہ ہے شک اللہ“ کا ایک زوردار نعرہ مارا اور اپنے بھائی کا نام لے کر زمین پر پٹاخ سے تھوکا پھر میری طرف دیکھ کر کہنے لگا۔ ”اس دن کے بعد سے میں نے سنگل جکمن لئے اور اپنے آپ کو جکڑ بند کر لیا۔ انسان جکڑ بند نہ ہو تو بے راہ ہو جاتا کھلا ہوا ہو تو بے حیا ہو جاتا ہے۔ دونوں کی منزل سائلوں پر چاڑھتی ہے۔ پھر موت آ جاتی ہے اور سارا کوڑ کھاڑا ایسے ہی ادھر ادھر ہو جاتا ہے۔“ سنگل شاہ نے کلائیوں میں پڑے آہنی حلقوں کو زور سے ٹکرایا اور اونچی آواز میں کہنے لگا۔ ”اس سنار میں ایک ہی پیار ہے، تھا سچا پیار اور ایک ہی عشق ہے اور جب برحق عشق اور وہ ہے رب کا پیار۔ باقی سب جھوٹ ہے اور ایویں خالی مجرم ہے۔ پر ”ب“ اور ”من“ کا جھگڑا شروع سے چلا آ رہا ہے سچہ قدیم سے شروع ازل سے۔ رب کا پیار ان کا پیار بن جاتا ہے اور ہوائی جہاز ٹھاہ کر کے گر جاتا ہے۔ ذرا نیچر بھی فوت سواریاں بھی فوت! جہاں گر جاتا ہے وہاں بھی سارے فوت! پر اب میں نے سنگل ڈال لئے ہیں۔ دیہہ کی

جکڑ بندی کر لی ہے۔ ان کا جھگڑا ختم ہو گیا ہے ب کا باقی رہ گیا ہے۔ سب کچھ فانی اک باقی سوہر دم باقی۔ ”ب“ باقی برحق باقی ”پھر وہ اونچے اونچے گانے لگا“ من باقی میری من باقی..... حیرا پیچھا نہیں چھوڑتا بھانویں لگ جان جھگڑیاں۔“

جھگڑیاں کے لفظ پر وہ دونوں بانٹو اوپر اٹھاتا اور کلائیوں کے کڑوں کو آپس میں یوں بجاتا کہ بدن سے لپٹے ہوئے سارے سنگل کھڑکے لگتے۔

پیشاور سٹیشن نے کچھ اپنی مہربانی کی بنا پر اور کچھ ہمارا حق مان کر ہمارے ریڈیو سٹیشن کے لئے اپنی ایک آرٹسٹ بھیج دی تھی۔ یہ گانا بجانا تو کم چاہی تھی البتہ باتیں کرنے کی بہت شوقین تھی۔ اس کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بھائی اور بڑے بڑے پھولوں کے سوت والی ایک بھاری بھر کم ماں بھی تھی۔ ماں لڑکی کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت تھی لیکن لڑکی جوان تھی اور اپنے سامنے کسی کو ٹھہرنے نہیں دیتی تھی۔ جس طرح جوان اور منہ زور گھوڑے کا تانگہ اسٹینڈ پر زیادہ دیر تک کھڑے رہنا مشکل ہو جاتا ہے اسی طرح اس لڑکی کے لئے ایک کمرے میں تک کر بیٹھنا محال تھا۔ سٹیشن پر ایک مدت سے چونکہ ہم مرد ہی مرد تھے اس لئے زمر کا آنا ہمارے لئے رحمت کا باعث بن گیا۔ سارا دن تو اس کی برادری کے لوگ تھے ہی ہم لوگ بھی اپنے اپنے تھان پر ایک سے انداز میں بیٹھنے لگے۔ ایسی باتیں ہم نے اس سے پہلے اپنے منہ سے بھی نہ سنی تھیں۔

زمر کے مقابلے میں مفتی جی اور مسعود میں گھمسان کی جنگ ہوئی۔ مسعود میوزک انجارج تھا اور یہ آرٹسٹ بلا واسطہ طور پر اس کی تحویل میں آتی تھی۔ مفتی جی اس کو ڈرامہ و وائس کے طور پر ڈراموں میں استعمال کرنا چاہتے تھے۔ یوسف ظفر اسی سے پانچ منٹ پہلے تقریریں پڑھوانا چاہتے تھے اور ڈیوٹی آفیسر کسی کو پوچھے بتائے ہاں اس سے دو تین مرتبہ انڈسٹری بھی کروا چکا تھا۔ مفتی اور مسعود کا جھگڑا طویل سمجھ گیا تو ان کے درمیان توانوئی چلنے لگی۔ اسٹینڈ ڈائریکٹر علی صاحب نے دونوں کو باری باری اپنے کمرے میں بلا کر سمجھایا لیکن کوئی بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہ ہوا۔ معاملہ نظامی صاحب تک پہنچا تو انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ زمر کو واپس بھیج دیا جائے۔ واپسی کا فیصلہ سن کر مردوں کی دنیا اندھیر ہو گئی اور سب نے آپس میں صلہ کر لی۔

ہر شخص جو زمر سے علیحدگی میں ملتا تھا ایک ہی بات کہتا تھا کہ ”میں بہت اکیلا ہوں اور اداس ہوں مجھے سہارا دو۔“ وہ بھی ہنس کر ایک ہی جواب دیتی کہ میں کوئی باپ بڑھے کی لاشی ہوں جو تم کو سہارا دوں میں تو ایک آرٹسٹ ہوں اور گانے کے لئے یہاں آئی ہوں۔ مجھے سہارا سہرا دینا کوئی نہیں آتا۔“ اگلے دن وہ کل کا سہارا مانگنے والے کو مجھے دن کا سہارا مانگنے والے کا نام بتا دیتی اور وہ برہم ہو کر ایک ایک سے شکایت کرتا کہ ”ذرا اس کو دیکھو شرم نہیں آتی ایک لڑکی سے سہارا مانگتا ہے۔“

میں نے اس سے سہارا تو نہ مانگا البتہ اپنے ماسٹر بالی کا سارا قصہ الف سے لے کر یے تک اسے سنا کر اس سے ہمدردی اور رحمتی کا طلب گار ضرور ہوا۔ وہ ایک متعصب قسم کی مسلمان لڑکی تھی۔ ماسٹر بالی کی تبدیلی مذہب پر بہت ناراض ہوئی اور اس کو دو تین گالیاں دے کر مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ میں نے اسے اور شامل کرنے کے لئے یہ بھی بتایا کہ میں کلارنٹ بجا لیتا ہوں اور راگداری میں دلچسپی رکھتا ہوں۔ مجھے اپنی برادری کا فرد جان کر اس نے دلی مسرت کا اظہار کیا اور مجھ سے میرے گھرانے کی بابت پوچھنے لگی۔ میں نے کہا ”میں ہوشیار پور کا رہنے والا ہوں اور میرا تعلق شام چوراسی کے گھرانے سے ہے۔“

اگلے دن مفتی جی نے سکریٹ کی کابیاں جوڑتے ہوئے مجھ سے پوچھا ”کون ہے بھی وہ تمہارا استاد جو سکھ ہو گیا ہے؟“

میں نے حیران ہو کر کہا ”میں تو کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا جو سکھ ہو گیا ہو اور جس نے اپنا آبائی مذہب چھوڑ دیا ہو۔“ کہنے لگے ”سنوے تمہیں راگ دیا میں بھی دلچسپی ہے؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے کہا ”صرف سننے سنانے کی حد تک۔“

”کوئی ساز بھی بجا لیتے ہو؟“ انہوں نے پوچھا۔

میں نے کہا ”مفتی جی میں گھسنے پڑھنے والا آدمی ہوں بھڑکی نہیں ہوں۔“

انہوں نے سکریٹ سے نگاہیں اٹھا کر غور سے میری طرف دیکھا اور جھڑک کر کہا ”شام چوراسی گھرانے میں تمہارا کون تھا؟“

میں نے گلا صاف کر کے کہا ”میں نے تو یہ نام ہی پہلی مرتبہ سنا ہے۔“

انہوں نے بات کا پتہ کاٹتے ہوئے کہا ”اچھا جاؤ اور الماری سے ساؤنڈ ٹیکس کی یہ ڈسکی نکال کے لے آؤ۔ میں نے غذا کا شکر ادا کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ کٹسین کی چھوٹی پہاڑی کے ساتھ زمر دسازندوں کے ساتھ ٹین کی کرسی پر بیٹھی ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ مجھے

دیکھ کر اس نے زور کی ہانک لگائی اور بولی ”آؤ آؤ کبھی ہاتھوں کے ساتھ بھی بیٹھا کرو“ سردار جی! میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور ڈیوٹی روم میں داخل ہو گیا۔

پہاڑوں کی ایک عجیب عادت ہے کہ وہ دن بھر چمکتی دھوپ میں ایک دوسرے سے چوٹیاں ٹکالے اپنے ماتھے اور سروں پر بادلوں کی پٹیاں باندھتے کھڑے رہتے ہیں اور جب رات چھا جاتی ہے اور گھپ اندھیرا ہو جاتا ہے تو اپنے عزیز رشتہ دار پہاڑوں سے ملنے دور دور چلے جاتے ہیں۔ ان کے درمیان خاندانی تعلقات اور قرابت داری کی باتیں ہوتی ہیں اور وہ نئے رشتے طے کر کے سورج نکلنے سے پہلے واپس اپنے مقام پر آ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے ہوٹل کی کھڑکی سے کئی مرتبہ سامنے والے بڑھے پہاڑ کو رات کے اندھیرے میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ وہ ایسی گربہ پائی سے اپنی جگہ سے سرکنا کہ سناتے میں بھی اس کی آواز نہ آتی۔ لیکن ٹھنڈی سیت ہواؤں کو کاٹتے ہوئے ہواؤں کی آواز میں تبدیلی سے صاف پتہ چل جاتا کہ وہ کوہاٹے کی طرف جارہا ہے اور اپنے چھوٹوں سے کچھ نئے گلے شکوے کرنے جارہا ہے۔ اس کے چلنے میں اور جانے میں مجبوری کا پس ماندگی کا اور کھولت کا عنصر نمایاں ہوتا۔ رات کے گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کئی کئی گھنٹے پہاڑوں کی سبک خرام موومنس کو واضح کیا کرتا حالانکہ نظر کچھ بھی نہیں آتا تھا لیکن پتہ صاف چل جاتا تھا۔

کوئی دس بارہ روز کے بعد جب میں بابا سنگل شاہ سے ملنے گیا تو اس کی جھونپڑی خالی تھی اور اس کے باہر ہار پھول پھول کے لٹافے اور مٹھائی کے ڈونے بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے تھے۔ پہاڑی کتے چیزہ کے اونچے درختوں پر خاموشی سے بیٹھے دیران کنیا کی طرف دیکھ رہے تھے۔ کوہالا جانے والی ایک لاری جب کنیا کے سامنے رکی اور کلینر نے آلو بخارے کا لٹافہ ایک پرانے ہاسی ہار کے کنڈل میں رکھ کر سلام کیا تو میں نے آگے بڑھ کر اس سے بابا کی بابت پوچھا۔

کلینر نے کہا ”سائیں سنگل شاہ بچھلی جمعرات یہ جگہ چھوڑ کر چلے گئے۔“ جن لوگوں نے انہیں راستے میں دیکھا تھا وہ بتاتے ہیں کہ سائیں نانکا پریت کی طرف نکل گئے ہیں اور اب واپس نہیں آئیں گے۔“

وہ شاید مجھے کچھ اور بھی بتاتا لیکن ڈرائیور نے ہارن دے کر اسے بلا لیا اور وہ تیزی سے لپک کر چلتی ہوئی لاری کے دروازے سے نکل گیا۔

سنگل شاہ کے اس طرح اچانک چلے جانے سے میں اور بھی اداس ہو گیا اور مجھے اپنے

سرکار ماسٹر ہالی شدت سے یاد آنے لگے۔ اس زمانے میں بھارت سے آنے جانے کے لئے کوئی ایچ اسسٹم نہیں تھا۔ بس ایک پر مٹ کی ضرورت ہوتی تھی جو آسانی سے مل جاتا۔ اگر وہ چاہتے تو پر مٹ لے کر آ سکتے تھے اور اگر میں چاہتا تو میں بھی پر مٹ لے کر جاسکتا تھا، لیکن میرا وہاں جانا خطرناک تھا۔ نہ وہ آئے نہ میں گیا۔ شاید ہم دونوں کے لئے خطرہ موجود تھا۔ میں نے انہیں ایک لمبا خط لکھ کر لٹافے میں ڈالا اور لٹافہ اپنی ماں کے نام لاہور روانہ کر دیا کہ اسے کھول کر اندر سے جو لٹافہ ملے اسے پوسٹ کر دیں۔ اپنے خط میں بھی میں نے یہی انشور کشن دی تھی کہ جواب مجھے لاہور کے پتہ پر بھجوائیں وہاں سے مجھ تک پہنچ جائے گا۔ لیکن ایک طویل انتظار کے بعد بھی مجھے ان کا کوئی خط نہ ملا۔

زمرہ کو نظامی صاحب نے واپس پشاور شیشمن بھجوا دیا اور چند دنوں کے اندر اندر ہم سب پھر ایک دوسرے کے قریب آ گئے۔ لطیفے بازی کی محفلیں چنے لگیں۔ مفتی نے اپنی خطرناک کی بساط پھر سے بچھائی۔ ان کے گھر زویں مفتی رہیں پیادے چلتے رہے اور شملتی رہی۔ سارے شاف میں بس ایک عمر اکیلا رہ گیا تھا۔ اس نے زمرہ کے چلے جانے کے بعد باقاعدگی سے نماز پڑھنی شروع کر دی اور اللہ سے لوٹا کر بیٹھ گیا۔ سنگل شاہ ٹھیک ہی کہتا تھا کہ ”ر“ کا کھونا تو اپنی جگہ قائم رہتا ہے بس ”ب“ اور ”ن“ میں جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور یہ جھگڑا اس وقت تک رہتا ہے جب تک بدن کا کوٹ بکھر نہیں جاتا اور وہ بہہ کی مادی ذبیہ نہیں جاتی۔

پورے دو سال بعد جب میں اٹلی سے لوٹ کر آیا تو عمر ایک متقی پرہیزگار اور پارسا آدمی بن چکا تھا اور اس کے سر کے پیچھے نور کا ایک ہالہ سا بن گیا تھا جو دیکھنے والی آنکھ کو نظر تو نہیں آتا البتہ سر کے پیچھے بالوں کی چمک سے اندازہ ہوتا تھا کہ کہیں سے کوئی سپاٹ لائنٹ آ رہی ہے جس کا خرچ دکھائی نہیں دیتا۔ لوگوں میں یہ خبر عام تھی کہ عمر نے خفیہ طور پر زمر سے شادی کر لی ہے اور دونوں نے ایک دوسرے سے الگ رہ کر زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

محمد حسین کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ شادی کر لینے کے بعد میاں بیوی الگ الگ زندگی گزاریں۔ وہ پشاور میں رہے یا چنڈی میں۔ وہ اپنے والدین کے ساتھ رہے یا اپنے گھر وہ اپنی کمائی کرے اور اپنا کھائے یا اپنی ساری تنخواہ گھر لے جائے اور خبر ان کے ارد گرد کی گھومتی رہے کہ انہوں نے شادی کر لی ہے۔ پشاور میں بھی یہی خبر گرم ہو اور چنڈی میں بھی اسی کا چرچا ہو۔ لوگ مان بھی چکے ہوں اور کوئی ثبوت بھی پیش نہ کر سکیں۔ اسے گمے اور کبے سے بھرتے ہوں، لیکن محمد حسین کے پاس اس کا ایک وزنی اور پائیدار ثبوت موجود تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ عمر ہفتے کی شام بس کچڑ کر پشاور چلا جاتا ہے اور اتوار کا سارا دن وہاں گزار کر پھر کی صبح سیدھا دفتر آ جاتا ہے۔ لیکن یہ بات بھی درست نہیں تھی۔ عمر ہفتے کی شام کپڑے بدل کر بری امام چلا جاتا تھا اور اتوار کا سارا دن وہاں گزار کر پھر کی صبح دفتر پہنچ جاتا تھا۔ اس کی جیب میں بری کے بچ کی راکھ کی ایک پٹیا ہوتی جسے وہ چاتا بھی تھا۔ آنکھوں میں بھی لگاتا تھا اور بچی سے اوپر ماتھے پر الٹ کا نشان بھی کھینچتا تھا۔ میں نے عمر کے سر پا کو غور سے دیکھا تو مجھے یقین ہو گیا کہ اس نے واقعی زمر سے شادی کر لی ہے اور اب اس کی زندگی میں صرف نون کا جھگڑا رہ گیا ہے جس نے ”ب“ کی صورت اپنائی ہے اور

”ب“ بھی پانی کی لہروں میں اس کی نظروں کے سامنے ڈالو ہوتی جا رہی ہے۔ اٹلی میں میرا دو سال کا قیام دو مہینوں میں گزر گیا۔ یہاں ماسٹر بالی کے خط باتا عدگی سے بلکہ توڑ سے ملتے رہے اور ہم ایک دوسرے کے اتنے قریب آ گئے جتنے اصل زندگی میں بھی نہیں تھے۔ میرا خیال تھا کہ انہیں اب یقین ہوا ہے کہ پاکستان نہ آکر انہوں نے میرے روپ میں ایک میرا گنوا دیا ہے اور دیار غیر میں یوسف بے کارواں سے ہو کر رو گئے ہیں۔ یہ بات ان کے غلطوں سے عیاں نہ تھی، بس میرے دل کا خیال تھا، لیکن یہ خیال تھا بڑا مستحکم۔ یورپ آکر وہی لوگوں کے بازے میں جو خیال پیدا ہوتے ہیں وہ بڑے مستحکم اور مدلل ہوتے ہیں۔ ان میں ترسیم کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی۔ ہر دلیل اپنے اپنے مقام پر بی تلی اور وزنی ہوتی ہے۔ انحراف کی کوئی صورت نہیں نکلتی۔

ریڈیو روم سے واپسی پر ایک شام مجھے سینٹ پیٹر کے بڑے صحن میں ایک سکھ جوڑا نظر آیا۔ سردارنی فرارے کے کنارے تھی پر پاؤں رکھے اپنے سینٹرل کی گھنڈی باندھ رہی تھی اور سردار ہاتھ میں پی اولے سی کا تھملا اٹھائے اس کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے اپنا سکوتر روک کر سینٹر پر رکھا اور ان کے قریب جا کر فتح بلائی۔ میری بولی سن کر وہ دونوں چوٹ کے توبر وارنے ہاتھ آگے بڑھا کر کہا ”بھاپا جی ہمیں تو آپ کی انالین نے مار دیا۔ تین دن سے پھر رہے ہیں کوئی تہا دی بات ہی نہیں سمجھتا۔“

میں نے کہا ”سردار جی اٹلی آؤ تو انالین سیکھ کر آؤ“ نہیں تو دھکے کھاؤ۔“
دونوں میاں بیوی ہنسنے لگے تو اس کی بیوی نے پوچھا ”ویری جی آپ نے اتنی اچھی پنجابی کیسے سیکھ لی۔“

میں نے کہا ”بی بی میں انالین نہیں ہوں، پاکستانی ہوں اور پنجابی میری مادری زبان ہے۔“

سردار نے خوش ہو کر کہا ”دیکھنے کو تو آپ بالکل انالین لگتے ہیں۔ پر آپ کا سبھاؤ بالکل پنجابیوں جیسا ہے۔ کتنی دیر سے ہیں یہاں؟“

میں نے کہا ”میں کوئی ڈیڑھ برس سے یہاں مقیم ہوں۔ یونیورسٹی میں اردو پڑھاتا ہوں اور ریڈیو روم سے اردو سروس میں براؤن کاسٹ کرتا ہوں۔“

دونوں میری قابلیت سے بہت متاثر ہوئے، لیکن سردارنی سوچ میں پڑ گئی اور آخر پوچھے بنانہ رہ سکی کہ میں پنجابی ہوتے ہوئے اردو کس طرح پڑھا لیتا ہوں۔

سردار نے سر کو ہلکا سا جھٹکادے کر کہا "ہے کہ مدین۔ اپنے گور کھ سنگھ کا جواب نہیں" بابو دلپ سنگھ وہ اردو میں شاعری کر لیتا ہے۔ بڑے بڑے اعلیٰ شعر بناتا ہے۔ دو کتابیں چھاپی ہیں اس نے۔ اردو کوئی مشکل تو نہیں سمجھیں گور۔"

میں ان کو اپنے ساتھ آہستہ آہستہ چلا تاہی تزاویل رنی سورجی میستو لے آیا اور چائے پینے کی غرض سے ہم ایک کینے میرا میں داخل ہو گئے۔ جب میں نے ہر بھجن گور سے پوچھا "بھابی آپ کیا نہیں کی چائے کہ کافی؟ تو سردار صاحب بلبل کر بولے "چائے تو یہاں ایک دھیلے کے کام کی نہیں ہوتی۔ گرم پانی کی پیالی میں تھیلی سی ڈال دیتے ہیں۔ رنگ نکلتا نہیں" کبھی دھکا منہ میں آجاتا ہے کبھی پرچھا۔"

میں نے کہا "تو پھر کافی پی لیتے ہیں۔"

"ناں ویری ناں" ہر بھجن گور چپک کر بولی "میں نے تو ایک گھونٹ ہی پیا تھا۔ تھوکنے کو جگہ نہ ملی تو مجھے اندر لٹکھانا پڑا۔ بڑا ہی گند اسوا ہے" تھے ستوؤں جیسا۔ وہ نہ منگا۔"

"تو پھر یوں کرتے ہیں" میں نے سوچتے ہوئے کہا "آئس کریم منگوا لیتے ہیں۔ یہاں کی آئس کریم ساری دنیا میں مشہور ہے۔"

آئس کریم پر دونوں رضامند ہو گئے تو میں نے ہیرے کو بلا کر سمجھایا کہ گلاسوں میں آئس کریم لانا کون نہ اٹھا لانا۔ کون کھانے کا ان کو بخاورہ نہیں ہے۔ ان کے قابو میں نہیں آئے گی۔ ان کے کپڑے خراب ہوں گے تمہارا فرش گندا ہو جائے گا۔ ہیرا مسکراتا ہوں واپس چلا گیا تو سردار جی نے کہا "آپ تو واہ واہ اٹالوی بول لیتے ہیں۔"

میں نے کہا "بس کام چلا لیتا ہوں۔ مشکل الفاظ میری سمجھ میں بھی نہیں آتے۔"

"مشکل بولی ہے؟" ہر بھجن گور نے معصومیت سے پوچھا۔

"بہت مشکل۔" میں نے سنجیدگی سے کہا "بولنے میں تو پھر بھی آجاتی ہے پر لکھنے میں پکڑائی نہیں دیتی۔ بڑے بڑے نائی گرامی اٹالوی کھادی غلطی کر جاتے ہیں۔"

"تو پھر تو ہماری پنجابی سب سے آسان ہوئی۔" سردار نے خوش ہو کر کہا "چاہے دو دن بولتے رہو کوئی غلطی نہیں ہوتی۔"

وہ دونوں لدھیانے کے رہنے والے تھے اور ان کی غی غی شادی ہوئی تھی۔ جو الا سنگھ میٹرک پاس تھا اور ہر بھجن ایف اے پاس کر کے آگے پڑھنا چاہتی تھی کہ ان کی شادی ہو گئی۔ لندن میں جو الا سنگھ کے تالیفاتی بڑی دیر سے آباد تھے اور روزے کا کاروبار کرتے تھے۔

لندن میں ان کا اپنا گھر تھا۔ کاؤنٹی میں تھوڑی سی زمین بھی ہے پر لے لی تھی جہاں وہ کاروبار کے ساتھ ساتھ وہی بچی سے بھی دل بہلاتے تھے۔ جو الا سنگھ نے بتایا کہ پچھلے سال ان کے ٹائزوں کو سارے ولایت میں اول نمبر انعام ملا تھا۔

یہ جوڑا اپنے تالیفی کے پاس پورا ایک مہینہ گزار کر اب واپس لدھیانے جا رہا تھا اور راستے میں اٹلی کی سیر کرنے کے لیے رک گیا تھا۔

جب میں نے ان سے اٹلی کی سیر کرنے کی وجہ دریافت کی تو جو الا سنگھ نے بتایا کہ سردار گور کھ سنگھ کا بیٹا کر نل سنگھ پہلے ہی اٹلی دیکھ چکا ہے اور ہر وقت اٹلی کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ ہماری ان کے خاندان کے ساتھ اڑ پچس ہے اس لیے میرے باپ جی نے کہا تھا کہ اٹلی ضرور دیکھ کر آنا تاکہ ہم گور کھ کے نمبر سے بیٹے نہ رہیں۔ پھر اس نے سر ہلا کر کہا "یہ تو بڑا ہی مشکل دیس ہے کسی کو کسی کی بات سمجھ ہی نہیں آتی۔ پرے گور پرے کو ہی کرتے رہتے ہیں۔"

ہر بھجن گور نے کہا "میں پھر بھی کچھ سمجھ لیتی ہوں پر سردار جی کو تو اکاپتا نہیں چلا کہ کوئی کہہ رہا ہے۔"

جو الا سنگھ نے جھلا کر کہا "لوئے رہنے دو اپنی فیلو فیاں، کل سے اپنا سینڈل گنڈھوانے کے لیے موچی تلاش کر رہی ہے۔ ہر ایک کو اپنا نگہ پیر اٹھا کر دکھاتی ہے اور ہر کوئی اسے ڈاکٹر کی دکان پر لے جاتا ہے۔"

میں نے کہا "آپ لوگ فکر نہ کریں ابھی یہاں سے فارغ ہوتے ہیں تو بھابی کی جوتی نکھوا لیتے ہیں۔ یہاں قریب ہی ایک موچی کی دکان ہے۔"

جب ہم آئس کریم کھا رہے تھے جو جو الا سنگھ نے ران پر ہاتھ مار کر کہا "لو جی حد ہو گئی۔ ہم نے نہ بھاپا جی سے ان کا نام پوچھا نہ ان کا سر نامہ لیا۔ سارا ٹیم ایسے ہی گزار دیا۔" میں نے ان کو اپنا نام بتایا اور جیب سے اپنا کارڈ نکال کر سامنے میز پر رکھ دیا۔

ہر بھجن گور نے کارڈ اٹھا کر پڑھنے کی کوشش کی تو ٹالین پر پھر رک گئی۔ بولی "ٹیلی فون نمبر تو میں سمجھ گئی ہوں پر سر نامہ نہیں اٹھایا جاتا۔"

میں نے کہا "جب ضرورت پڑے تو کسی سے پڑھو لینا ابھی تمہارے منہ پر نہیں چڑھ سکے گا۔"

ہر بھجن گور نے وزینگ کارڈ اپنے پرس میں ڈالتے ہوئے کہا "یہ تو بھاپا جی آپ نے

ارے کا پتہ بتایا پیچھے کا تو بتلایا ہی نہیں کہ آپ کا پیچھا کہاں کا ہے۔
میں نے کہا "میں تخت پور کا رہنے والا ہوں۔" دونوں نے ہم زبان ہو کر اونچی آواز
میں "تخت پور" کہا اور حیرانی سے میری طرف دیکھنے لگے۔

جو الا سنگھ نے کہا "لو وحد ہو گئی۔ اس مانگی کے میلے پر ہم تخت پور گئے تھے اور پورے
دس دن وہاں رہے تھے۔ آسٹریٹر میں میری ماسی بیانی ہوئی ہے اور میرا ماسٹر ہسپتال میں
کیا ڈنڈ رہے۔ سردار ہر دت سنگھ گراں۔"

میں نے فخر سے آنکھیں نہچا کر کہا "دیکھا پھر ہمارا مانگی کا میلہ۔ ہے کوئی اس کا جوڑ
پورے پیٹاب میں؟"

ہر بھجن نے کہا "میلے کا تو بلا شک کوئی جوڑ نہیں بھلا پائی پر میرا دل تو دربار صاحب
کے شہد کیر تن نے لوٹ لیا۔"

"یہ تو وہاں سے اٹھتی ہی نہیں تھی۔" جو الا سنگھ نے کہا "میلہ مولا کوئی نہیں دیکھا۔
اس نے ارد اس ہی سنتی رہی۔"

میں نے ایک مرتبہ بھر اپنا سر فخر سے اونچا کر کے کہا "ہمارے دربار صاحب کے
گیانوں کا کوئی جوڑ ہی نہیں۔ گیانی مہاں سنگھ گیانی بدھ سنگھ گیانی باراہ سنگھ....."

لیکن ہر بھجن کور نے میری بات سنی ہی میں کاٹ دی اور آنکھیں بند کر کے تھوڑی اوپر
اٹھا کر بولی "سارے گیانی سچ سارے اسی گورو کے سیوک پر جو بات گیانی بھائی بھائی سنگھ میں
ہے وہ اور کسی میں نہیں۔"

بھائی سنگھ کا نام سن کر میں چونکا تو وہ کہنے لگی "گیانی بھائی بھائی سنگھ پہلے مسلمان تھا۔ مونا
تھا۔ پھر گورو کا سکھ بن گیا۔ کڑا لال کے کت ہو گیا۔ جب کت ہو گیا تو دوا گورو کال پر کھ نے
سارا گیان اسی کی جھولی میں ڈال دیا۔"

جو الا سنگھ نے کہا "بات اچھی کرتا ہے اور کھول کے کرتا ہے۔ ڈونگلی گل بھی شیشہ ہو
جاتی ہے۔ کوئی دھار تک مل فریب نہیں رہتا۔"

ہر بھجن کور عقیدت سے سر ہلاتے ہوئے بولی "نہ مان نہ بیکاری نہ لو بھ نہ لالچ" بس
پریم ہی پریم کر پائی کر پائی دوسرے گیانیوں کی طرح دیدے پھلا پھاڑ کے نہیں دیکھتے نظریں
بند بند ہی رکھتا ہے۔ میرا تو دل کرتا تھا کہ تخت پور میں ہی رہ جاؤں اور ہر روز ان کے
شہد کیر تن میں بیٹھا کروں۔"

"اے پلہ صیانی مہنت بھی تو بڑا قافل ہے۔" جو الا سنگھ نے چڑ کر کہا۔
"اس میں کچھ نہیں سرداری۔" ہر بھجن کور نے کپلے ہاتھ کی ڈگڈی بجا کر کہا "جس
میں دین دھرم کا گیان ہو وہ عورتوں کو نہیں تار کر تا۔"

جو الا سنگھ شرمندہ سا ہوا کر خاموش ہو گیا تو ہر بھجن کور پھر ماضی میں پہنچ گئی۔ کہنے لگی
"جس طرح گورو مہاراج کی تصویر میں ان کی آنکھیں ہیں اسی طرح کی گیانی بھائی بھائی سنگھ
آنکھیں ہیں" جیسی پگڑی گورو مہاراج کے سر پر ہے ویسی بھائی بھائی سنگھ کی ہوتی ہے۔ شہد
بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ چلتے ہیں تو ہرے توت کی ٹہنی کی طرح نرم نرم
قدم اٹھاتے ہیں۔ رکتے ہیں تو ہنسی ہی بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ سنتے ہیں تو سارا کان
تمہاری طرف دے کر آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔"

جو الا سنگھ نے ہنس کر کہا "ارے کوئی میری شکایتیں تو نہیں کرتی رہی ان سے۔"
ہر بھجن کور نے جو الا سنگھ کی بات سنی ان سنی کر کے مجھ سے پوچھا "تو یہی آپ ان
سے کہی نہیں ملے؟ ملے تو ضرور ہوں گے" تخت پور تو چھوٹا سا شہر ہے۔"

میں نے کہا "میں تخت پور زیادہ دیر نہیں رہا۔ پڑھائی کے سلسلے میں لاہور آ گیا تھا۔
انہیں دیکھا ضرور ہو گا" لیکن پہچانتا نہیں۔"

جو الا سنگھ نے کہا "نسوا دی رنگ کی پگڑی باندھتے ہیں" سفید قمیص شلوار" کچھ ریشم کی
بندڑی پیروں میں کالی گرگابی آنکھوں میں چاندی کے چھوڑے۔"

"کالی سیاہ چھوٹی ڈاڑھی۔" ہر بھجن کور نے کہا "اور بالکل گول جوڑا جو پگڑی کے اندر
بھی ڈکیں مارتا ہے۔ گردن پر کیسوں کے چھوٹے موٹے تھوڑے تھوڑے بال پوتر تاکا مان
اور نور سروپ کی آن۔ گور بانی کے شہد پڑھتے ہیں تو ایسے لگتا ہے گورو مہاراج خود بول رہے
ہیں۔"

میں نے پوچھا "وہیں رہتے ہیں دربار صاحب میں؟" تو ہر بھجن نے سر ہلا کر کہا "بازار
میں ایک چھوٹا سا چارہ ہے" نیچے بناٹلی کی دکان ہے" تنگ سی میڑھیاں اوپر چڑھتی ہیں۔
وہاں رہتے ہیں۔"

"تمہیں کس نے بتایا؟" جو الا سنگھ نے بار بار اس سے پوچھا۔
"بتانا کس نے تھا مجھے آپ معلوم ہے۔ ترنارن سے میلے پر پانچ پیادیاں آئی تھیں وہ
ان کے درشن کرنے چوہارے پر گئیں تو میں بھی ساتھ چلی گئی۔"

”تم نے مجھے پہلے تو کبھی نہیں بتایا۔“ جو الاسگھ بدستور ناراض تھا۔
 ”بتانے والی کوئی بات ہی نہیں تھی سرداری۔“ ہر بھجن کو نے کہا ”پانچ پیاروں نے صلاح بتائی تو میں بھی ان کے ساتھ چلی گئی۔ مجھے سچے پر بیٹھے چپ جی صاحب پڑھ رہے تھے۔ ہم ساریاں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئیں تو ”نہ بھی نہ بھی“ کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے اور ہمیں ہاتھ جوڑنے سے منع کر دیا۔“

”وہ کیوں؟“ جو الاسگھ نے غصے سے پوچھا۔

”کہنے لگے ہاتھ صرف واگور واکال پر کھ کے آگے جوڑے جاتے ہیں منگھ کے سامنے نہیں۔“

میں نے کہا میں نے بساطی کی دکان دیکھی ہوئی ہے اور اس کے اوپر والا چہارہ بھی لیکن میں اس میں کبھی گیا نہیں۔ ہر بھجن نے کہا ”دیر جی! اگر آپ ایک مرتبہ اوپر چلے جاتے اور ان کے درشن کر لیتے تو پھر جیون بھرا انہی کے ہو کر رہ جاتے۔“

جو الاسگھ اپنی بیوی سے ایک خیر مرد کی اس قدر تعریف سن کر تنگ آ گیا تھا۔ اس لیے بات بدل کر بولا ”بھلا جی پر سوں ہم نے کبھی غلطے جاتا ہے“ آپ سے پھر کبھی ملاقات ہو سکے گی؟“ میں نے کہا ”کیوں نہیں جو الاسگھ جب تک تم لوگ یہاں ہر روز ملاقات ہو گی اور روز باقی ہوں گی۔ اس دلیں میں اپنے لوگ بار بار کہاں ملتے ہیں۔ میں دو دن کی چھٹی لے لوں گا اور تمہارے ساتھ ہی رہوں گا۔“

ہر بھجن نے کہا ”دیر جی مجھے تو آپ میں بھی گیانی بھائی باالی سنگھ کا روپ نظر آتا ہے۔ پر ان کا سر روپ توری ہے اور ہمارا آپ کا خاکی ہے“ منی ر لگا۔

جو الاسگھ نے کہا ”بس بھی کر۔ اب چھوڑ بھی بھائی باالی سنگھ کی کھلوئی۔ پتہ نہیں ہے چارہ کیسا ہے کیسا نہیں اس کو خواہ تو وہ دیوتا جانی جا رہی ہے۔“

ہر بھجن کو در خاموش ہو گئی اور پھر تھوڑی دیر بعد یولی ”دیر جی میرا سینڈل گنڈ حوا دو گے۔ سخت منٹ بعد کھل جاتا ہے۔“ میں ان کو ایک سوچی کی دکان پر لے گیا جو گھوڑوں کے ساز تیار کرتا تھا۔ جب میں نے اس کو بتایا کہ یہ لوگ انڈیا سے آئے ہیں اور اس بی بی کی جوتی کو تانے لگانے ہیں تو اس نے جو الاسگھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا:

”فقیر فقیر!“

میں نے کہا ”ہاں فقیر!“

کہنے لگا ”یہ ہوا میں اڑ سکتا ہے؟“

میں نے کہا ”اس وقت نہیں جب شام کا وقت ہوتا ہے تو ہوا میں اڑتا ہے اور ساری دنیا کا چکر لگا کر آدھ گھنٹے میں واپس آ جاتا ہے۔“

اس نے آواز دے کر اندر سے اپنی بیوی کو بلایا اور جو الاسگھ کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا ”انڈین فقیر! ہوا میں اڑ سکتا ہے اور ساری دنیا کا چکر لگاتا ہے۔“

اس کی بیوی نے محبت بھری نظروں سے ہر بھجن کی طرف دیکھا اور اس کے سر پائی تحریف کرنے لگی۔

سینڈل گنڈوا کر جب ہم وہاں سے چلے تو جو الاسگھ نے پوچھا ”بھلا جی سوچی کیا کہتا تھا؟“ تو نے بات ہانے کی غرض سے کہا ”ہر بھجن کی سندرتا کی تعریف کر رہا تھا۔“

جو الاسگھ نے طیش میں آ کر کہا ”وہ سال لگتا ہے کسی کی گھر والی کی تعریف کرنے والا۔ آپ نے اس کا منہ توڑنا تھا“ نہیں تو مجھ کو بتاتے میں خود کر لیتا۔ اس سے دودھ ہاتھ۔ پھر اس نے بہن کی گالی دے کر کہا ”ذات کا سوچی اور سرداروں کی عورتوں کو تڑپا ہے ہاں کا پار!“

میں نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”اے یہ یہاں کے لوگوں کا وہاں ہے کسی کی صفت شاکر نہ۔“

”چنگار وہاں ہے۔“ اس نے جوش میں آ کر کہا۔ میں سالے کو واپس جا کر سدھ کر تا ہوں۔ آئندہ کے لیے نصیحت ہو جائے گی۔“ میں نے بڑی مشکل سے جو الاسگھ کو روکا نہیں تو اس نے کھینچ ڈال دیا تھا۔

اگلے روز جب میں ان کے ہوٹل گیا تو ہر بھجن کو اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی ناشتہ کر رہی تھی۔ میری طرف دیکھ کر جلدی سے بولی ”سرداری اپنے ناشتے کے لیے باہر سے کوئی چیز لانے گئے ہیں۔ ان کو سربہ“ تو اس اظہار پسند نہیں بازار سے اپنے لیے کوئی چیز پسند کرنے گئے ہیں۔“

میں نے کہا ”میں اس کے پیچھے جا کر تلاش کرتا ہوں۔ وہ دکاندار کو کس زبان میں سمجھائے گا۔“

ہر بھجن نے کہا ”کوئی بات نہیں وہ کر لیں گے کچھ بندوبست۔ جب تک وہ نہیں آتے ہم بھائی باالی سنگھ کی باتیں کرتے ہیں کیونکہ ان کے سامنے تو یہ بات کھل کر نہیں ہو سکتی۔“

میں نے کہا ”تم کو گیانی جی اتنے ہی پسند آ گئے ہیں کہ تم ان کے علاوہ اور کوئی بات ہی

نہیں کرنا چاہتی ہو۔

کہنے لگی "ان کی بات کے علاوہ اور کوئی بات ہو بھی نہیں سکتی ان کی شہتی ہی ایسی ہے۔"

میں نے ایک بڑے بھائی کی طرح صحت کر کے اس سے پوچھا "بی بی ہر بھجن کو تو اس سے پریم کرنے تو نہیں لگ گئی دھیری رانی۔"

میری بات سنتے ہی اس کی آنکھیں ایک دم آنسوؤں سے بھر گئیں اور وہ چہرہ اٹھا کر بولی "ایسے میرے بھاگ کہاں دیر جی۔ وہ تو آنکھ اٹھا کر بھی تمہیں کی طرف نہیں دیکھتے۔ داگور وہی لو لگا کر رکھتے ہیں۔"

اس بات کا کوئی خاص جواب ہی نہ بنا تھا اس لیے میں خاموش ہو گیا۔ ہر بھجن نے جوالا سنگھ والی خالی بیالی میں میرے لیے چائے بناتے ہوئے کہا "میں نے پتہ کیا تھا دیر جی جب وہ مسلمان تھے اور مونے تھے تو ہاتھوں کی ایک لڑکی ان پر عاشق ہو گئی تھی۔ پھر اس کے گھر والوں کو پتہ چل گیا تو انہوں نے اس کا بیاہ بھگت کے ہاتھوں میں کر دیا۔ پر وہ اپنے گھر آباد نہیں ہو سکی، بھگت کر کے واپس تخت پور آگئی۔ میں اس بھاگیہ دان کے درشن کرنے دو دفعہ اس کے گھر گئی۔ وہ مجھ سے ملی ہی نہیں۔ انکار ہی ہو گئی اندر سے ہی جواب دے دیا کہ میں کسی کو نہیں جانتی کسی سے نہیں ملتی۔"

ہر بھجن کو رنے دو پٹے سے اپنی آنکھیں پوچھیں اور توں پر جام لگانے لگی۔ اگر مجھے جوالا سنگھ کے اچانک آجانے کا خوف نہ ہوتا تو میں ہر بھجن کو گلے سے لگا کر ضرور کہتا کہ وہ ظالم تمہیں کی طرف آنکھ اٹھا کر ہی نہیں دیکھتا مردوں کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ میں بھی اس کے بھر کا مارا ہوں ہوں۔ پر میں تیری طرح روٹا نہیں ا

جب مجھے ہر بھجن کے ساتھ اس کے کمرے میں اکیلے بیٹھے ہوئے کافی دیر ہو گئی تو میں نے جوالا سنگھ کے خوف سے کمرے کا دروازہ پورا کھول کر اس کے آگے کرسی لگا دی۔ گیلری میں ٹاکی مارنے والی سینوریا ہمیں دیکھ کر دروازے میں آگئی اور وائپر کے ڈنڈے پر ٹھوڑی رکھ کر مجھ سے باتیں کرنے لگی۔ ہماری گفتگو کے دوران ہر بھجن نے اپنے پرس کے پٹے ہوئے استر کے پیچھے سے ایک چھوٹی سی تصویر نکالی اور میری طرف بڑھا کر بولی "یہ گیمانی جی کی مودت ہے جو میں سردار جی سے چھپا کر رکھتی ہوں۔"

گھڑی کی ایک پرانی سی کرسی پر میرے استرا میرے صاحب میرے سر کا بیٹھے تھے

اور انہوں نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ٹنگھی بنا کر انہیں گود میں رکھا ہوا تھا۔ وہی چہرہ وہی آنکھیں اور وہی ابرو۔ سر پر سسکی سے بندھی ہوئی گھڑی جو کیسوں کی دھبے سے ڈرا پھولی پھولی سی تھی۔ کالی سیاہ ڈھیری جس میں کہیں سفید بالوں کے جوئے بھی تھے۔ پتھل کے ہنٹوں والی بھڑی جس کی اوپر والی جیب میں پرانی وضع کا ایک مونسا سبز تھا۔ کلائی پر وہی اونچے شیشے والی ویسٹ اینڈ کی گھڑی اور انگلیوں میں چاندی کی سونی سونی انگوٹھیاں۔ سینور بنانے وائپر کے ڈنڈے سے ٹھوڑی اٹھا کر اور سر جھکا کر غور سے تصویر کو دیکھا اور کہنے لگی "میک! میک!!" میں نے کہا "ہاں سکھ ا"

ہر بھجن کو تصویر واپس کرتے ہوئے میں نے آہستہ سے کہا "یہ جو گھڑی ان کی کلائی پر بندھی ہے اسے لینے چو بڑے کا بیٹا پھولا چرا کے لے گیا تھا۔ پورے تین سہیچے بعد روٹا ہوا آیا اور گھڑی واپس کر کے پاؤں میں گر کر فرش پر گر کر مارنے لگا۔"

ہر بھجن نے چیخ مار کر کہا "دیر جی آپ ان کو جانتے ہیں؟ گیمانی جی کو!" جوالا سنگھ کمرے میں داخل ہوتے ہوئے اونچی آواز میں بولا "اگرے یہ کیوں گھڑی ہے ہم اپنے دروازے میں؟"

میں نے کہا "یہ کمرے صاف کرتی ہے اور کمرہ صاف کرنے آئی ہے۔" جوالا سنگھ سینور بنائی کی طرف ہاتھ کے اشارے کر کے کہنے لگا "نو ٹھیک یو نو صفائی نو صفائی۔ ضرورت ہوئی تو ہم آپ کر لیں گے۔ یو گواوے۔ گواوے۔"

سینور بنا "اگرے" کہہ کر باہر نکل گئی تو جوالا پیٹ پر ہاتھ پھیر کر بولا "یاراں نے تو بڑا اچھا ناشتہ کر لیا ہے۔ وہی بھی مل گیا اور ملائی بھی۔ ملائی تو میں نے کھانا ڈال کر کھائی پر وہی میں سوکھا ہی رہ گیا۔ بڑا ہی سولا آیا۔"

"اور ساتھ کچھ نہیں لیا۔" میں نے پوچھا۔ اس نے سر ہلا کر کہا "ساتھ کچھ نہیں لیا۔ ساتھ لینے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ ملائی ہی روٹی کی طرح سسکی تھی۔ تازہ اور نروٹی۔ میں نے کہا خالی چلے دو۔" پھر اس نے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا "بھائی جی یہاں دودھ دی بہت سستا ہے۔"

میں نے کہا "دودھ وہی بھی سستا ہے اور پھل بھی بہت سستا ہے۔" جوالا سنگھ نے پھل کی طرف نو کوئی توجہ نہ دی البتہ ٹھوڑے وقفے بعد دودھ دی کی تعریف ضرور کرتا رہا۔ اس کی گفتگو کے دوران ہر بھجن کو پھل کی طرح توپتی

رہی۔ وہ نہ بیٹھ سکتی تھی نہ کھڑی رہ سکتی تھی۔ کرواتا چھوٹا تھا کہ اس میں چکر بھی نہیں لگا سکتی تھی۔ کبھی پرس کھول کر دیکھتی، کبھی اپنے بیک کے پاس جا کر اس کی چیزیں سینٹ کرنے لگتی۔ حسل خانے جا کر کھاتی کرتی۔ پھر سبک میں تھوک کر اوپر سے پانی چلا دیتی۔ واپس اپنی جگہ پر آکر انگلی سے جام چائے لگتی۔ پھر اٹھ کھڑی ہوتی اور جا کر بیک کی چیزوں کو نئے سرے سے ترتیب دیتے لگتی۔

جوالا سنگھ نے کہا "او کیا ہو گیا بھی تو آرام سے بیٹھتی ہی نہیں۔"

ہر بھجن کو رنے کہا "میرا دل گھبرا رہا ہے بے چینی ہو گئی ہے۔"

جوالا سنگھ ہنس کر بولا "اوسے دیکھنا بھائی کوئی ایسی دیکھی گل تو نہیں ہو گئی۔ پرویس کا معاملہ ہے، کہیں کوئی اور ہی مشکل ڈال دیوے۔"

ہر بھجن کو رنے قدرے غصے سے کہا "سردار جی آپ کو تو ہر بات میں ٹھٹھا بخول ہی آتا ہے۔ ایسی کوئی بات نہیں دوسری؟"

اس وقت سے لے کر بہمنی روانہ ہونے تک ہر بھجن میرے ساتھ بیحد گی کے لیے ایک لمحے کے لیے ترستی رہی، لیکن میں نے اسے یہ موقع ہی فراہم نہ کیا۔ ایک دو مرتبہ اس نے جوالا سنگھ کی موجودگی میں بات کرنا چاہی، لیکن میں نے آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔ چامپو اینٹر پورٹ پر ابھی اتر اڑ گیا کہ بہمنی جانے والے جہاز کی اٹاؤ سمٹ نہیں ہوئی تھی کہ ہر بھجن نے مجھے مخاطب کر کے کہا "دیر جی میں نے پیشاب کرنے جانا ہے اور مجھے ہاتھ روم کا پتا نہیں چلتا میرے ساتھ چلیں۔"

جوالا سنگھ نے منہ اٹھا کر پوچھا "اور میں؟"

ہر بھجن نے کہا "آپ یہاں بیٹھیں سامان کے پاس۔"

"اوسے رہنے دے سمیان۔" جوالا سنگھ نے اٹھتے ہوئے کہا "یہ ولایت ہے یہاں کوئی چوری نہیں کرتا۔"

اتنا کہہ کر دو تھارے ساتھ ہولیا اور ہم پائیلٹس کی طرف روانہ ہو گئے۔

۱۳

نکلائی صاحب آزاد کشمیر ریڈیو سے تبدیل ہو کر لاہور آگئے تھے۔ انہوں نے مجھے بھی اپنے ساتھ لاہور سٹیشن پر بلوایا۔ لاہور سٹیشن کی ایک اپنی ہی شان اور اپنی ہی رعایت تھی۔ آل انڈیا ریڈیو کے زمانے میں بھی اپنے ڈراموں کی وجہ سے یہ سٹیشن سارے ملک میں مشہور تھا اور اب بھی یہاں نامور لکھنے والوں کی ایک کھپ موجود تھی۔ ان کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر اپنی کارکردگی کے جوہر دکھانے میں ایک عجیب طرح کا لطف تھا۔ اس وقت بڑوں کی ناگک سمجھنے کا رواج نہ تھا۔ ان کے ساتھ پورے اترنے کا چلن تھا۔ بڑے بڑے ہی تھے۔ اچھے کام پر کھل کے داد دیتے اور غیبت میں زیادہ تعریف کرتے۔ ان کی تعریف کا ایک آدھ جملہ جب گھوم پھر کر جو نیڑے کارکن تک پہنچتا تو زندگی کا لطف دو بالا ہو جاتا۔ مشکل سے مشکل مرحلہ ایک آسان سی جولان گاہ بن جاتا اور سفر خوشگوار ہو جاتا۔

ماسٹر بائی کو میں نے اٹلی سے بھی کئی مرتبہ لکھا تھا اور یہاں آکر بھی مسلسل لکھتا رہا، لیکن انہوں نے ایک اپنا تازہ فوٹو اسی سال نہ فرمایا۔ ہر مرتبہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر جاتے، البتہ خط کے آخر میں یہ ضرور لکھتے کہ ایک عدد کیرے کی بڑی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو ملتا نہیں، اگر تم کہیں سے حاصل کر لو تو میں کسی آتے جاتے کے ہاتھ منگوا لوں۔ اس زمانے میں صرف جرمن کیرے دستیاب تھے، لیکن بڑے جگتے تھے۔ میں ایک کوٹا فلکس اٹلی سے خرید کر لے آیا تھا، لیکن اسے اس شرط پر اپنے پاس روک لیا تھا کہ جب تک وہ اپنی تصویر نہیں بھیجیں گے میں کیرہ نہیں بھجواؤں گا۔ یہ مکلفش بڑی دیر تک جاری رہی۔ بالآخر انہوں نے اپنے غلطوں میں اس فرمائش کا تذکرہ ہی بند کر دیا۔

مری سے دوستوں کی فرمائش آئی تھی کہ ہم مل کر نیکم دہلی کی میر کو جا رہے ہیں، تمہارا اس گروپ میں شامل ہونا ضروری ہی نہیں لازمی ہے۔ فوراً پہنچو اور ساتھ اپنا کیرہ

بھی لے کر آگے گرہ لپڑا کرتے جن چیزوں کے امرا دلانے کی فہرست روانہ کی تھی ان میں ایک چھتری، ایک چھتری، ایک عدد قہر موس، بیکٹوں کے پیکٹ، پیپر کاڈ، ہنگی برساتی، فولادی چاقو، کین، اوپنر اور ایک مضبوط سی سی بھی شامل تھی۔ جو چیزیں بہت ہی ضروری تھیں ان کو اس نے انڈر لائن کر دیا تھا۔ میں نے انڈر لائن چیزوں کو چھوڑ کر باقی سب لے لیں اور چھتری روانہ ہو گیا۔ چھتری جاتے ہوئے گجرات کے اڈے پر ہماری بس کا ٹاسٹر بچکر ہو گیا۔ پیٹر وکیل نہ ہونے کی وجہ سے بس کو جیک پر چڑھا کر اسی پینے کو پیچھے لگوانے کے علاوہ کوئی چارہ نہ تھا۔ کلینر نے بتایا کہ ٹیوب ویلکناڑ میں چونکے دیر لگے گی اس لیے آپ لوگ چائے پئیں اور اخبار پڑھیں۔

سڑک کے کنارے ایک چھوٹے سے ڈھابے میں میری کرسی سے دور کھٹے ہوئے جسم والے ایک مولوی صاحب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ان کی سیاہ کھنٹی ڈاڑھی، چمکدار چہرے اور سر پر گول کٹے کی شہیدی لکھی تھی۔ مجھے اس درجہ متاثر کیا کہ میں اپنی سیٹ چھوڑ کر ان کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اپنا کمرہ کھول کر جب میں نے ان سے ان کی تصویر بنانے کی درخواست کی تو انہوں نے بڑی محبت سے مجھے سامنے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور پھر میری طرف اپنی پلیٹ بڑھا کر بولے ”پہلے میرے ساتھ کھانے میں شرکت فرمائیے پھر تصویر کھینچو اور بس گا۔“ میں نے ہر چند بھوک نہ ہونے کے باوجود وقت کھانے سے احتراز کرنے اور بازاری کھانے سے گیس پیدا ہونے کے اندر پیش کیے، لیکن انہوں نے میری ایک نہانی اور اپنی بات پر اڑے رہے۔ مجبوراً مجھے ان کے ساتھ شامل ہونا پڑا۔

کہنے لگے ”یہ لاریوں والے بہت تنگ کرتے ہیں۔ ماڈل پرانے ہیں۔ سامان ان کے پاس ہوتا نہیں۔ آدھے راستے بریک ڈاؤن کر کے بیٹھ جاتے ہیں اور مسافروں کو بہت پریشان کرتے ہیں۔ آپ کی لاری کا پیپر بچکر ہو گیا ہے اور ہماری بس کے کار بریٹر میں کوئی خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ اب پتہ نہیں کتنی دیر لگتی ہے۔“

میں نے کہا ”آپ کہاں جا رہے ہیں؟“

کہنے لگے ”میں گجرات پکھری میں عرائض نو لیں ہوں اور ایک ضروری کاغذ کے حصول کے لیے جہلم جا رہا ہوں۔ میرے ساٹل کی ضرورت ہے اور اس کو اس بات کا علم نہیں ہے۔ بے چارہ سیدھا آدمی ہے اس لیے اس کی ڈیوٹی بھگتا رہا ہوں۔ آپ ابھی تک آزاد کشمیر ریڈیو میں ہی ہیں یا تبدیل ہو گئی؟“

میں ان کا یہ سوال سن کر سکتے میں آگیا اور لقمہ روک کر ان کا منہ دیکھنے لگا۔ انہوں نے پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے کہا ”یہ ہو ٹل والے مرتضیٰ بہت ڈال دیتے ہیں۔“

میں نے کہا ”آپ مجھے جانتے ہیں؟“

کہنے لگے ”مجھی طرح سے۔ میری آپ کی یاد اللہ بہت پرانی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ آپ نے بڑے افسر بن کر ہم کو بھلا دیا اور ہم وچیں روگھے ٹھن ٹھن گوپال ایس سائیں سنگل شاہ ہوں اور میری آپ کی ملاقاتیں روز ہوتی رہی ہیں۔“

میرے ذہن میں ٹھن ٹھن گوپال کا گھڑیاں زور سے بجا اور دیر تک بجاتا رہا۔ الیاس صاحب ٹلی کی ہڈی سے چٹا ہوا گودا نکالنے کے لیے اسے ٹائمن تھا لی میں بجا رہے تھے اور اس کی آواز میری گونج کی لہروں میں شامل ہو رہی تھی۔

میں نے میاؤں سی آواز نکال کر کہا ”آپ تو ناگوار بت چلے گئے تھے؟“

کہنے لگے ”لو بھائی کہاں کا ناگوار بت اور کدھر کی دھولی دھار وہ پکڑائی نہیں دیتا بس اور اور اصرار ہی چھپا رہتا ہے۔ قریب قریب ساتھ ساتھ کبھی پھول کے پیچھے ہوتا ہے، کبھی پھل کے پیچھے۔ کبھی رنگ کی اوٹ میں کبھی لے کے پیچھے۔ آدمی نے پھول سو گھ لیا پھول توڑ لیا رنگ لے لیا لے سن لی اور خوش ہو گیا۔ اس کے پیچھے نہ دیکھا اور رکاوٹ عبور کی۔ میں کیا کرتا نہیں بھی تو آدمی تھا سنگلوں کا بوجھ اٹھائے پھر اور سنگل کے پیچھے زد کیا۔“

پہاڑ چھوڑ کر محمد الیاس سنگل شاہ گجرات آگیا اور کجھاد کے راستے پر ایک جھگی ڈال کر اس میں رہنے لگا۔ شدہ شدہ اس کی شہرت دور دور تک پھیل گئی اور لوگ مٹیں ماننے اور چڑھاوے چڑھانے اس کے ڈیرے پر آنے لگے۔ بڑے بڑے سردار دو شملوں کی گجڑیاں باندھے جب اس کی جھگی کے سامنے سے گزرتے تو اپنے گھوڑوں سے اتر کر پیدل چلنے لگتے۔ وہ ان کو اونچی آواز میں گالیاں اور کوسنے دیتا اور سردار دونوں ہاتھ اٹھا کر سلام کرتے وہاں سے گزر جاتے۔ کسان اور ہالی ہر روز ٹھنڈے پانی کے گھڑے قطار اندر قطار اس کی جھگی کے باہر سجا جاتے۔ راوگیر ذرا دیر کو رک کر ٹھنڈا پانی پیتے گالیاں سنتے، روڑے کھاتے اور مسکراتے ہوئے اپنی راہ چلے جاتے۔ عورت کو وہاں آنے کا حکم نہیں تھا اور یہ بات عام مشہور تھی کہ جو عورت سنگل شاہ کی جھگی سے دس قدم کے فاصلے پر گزرے گی وہ بھسم ہو کر سلیٹی راگھ میں تبدیل ہو جائے گی۔ عورتیں اپنے پرانے کی

دوری میں تین گانٹھیں دے کر اسے آنے کے بیڑے میں لیٹ کر اپنے مردوں کے حوالے کر دیتیں جو وہاں سے گزرتے ہوئے آنے کا بیڑا جگلی کے آگے پھینک کر گزر جاتے اور ان کی سوانیوں کی سراویں پوری ہو جاتیں۔

سنگل شاہ عشق حقیقی کی پہلی منزل میں داخل ہو چکا تھا اور اس کی ملاقات ان ارواح سے ہو گئی تھی جو اپنی اپنی منزل کا سفر پورا کر کے آگے جانے کی تیاریوں میں مصروف تھیں۔ جس روح کو اذن مل جاتا وہ آگے جانے کے لیے منزل کی آخری سرحد پر پہنچ جاتی اور دوسری روحیں اس کے گرد جمع ہو جاتیں۔ دواغ کا یہ منظر بہت ہی دلنواز اور کریمک ہوتا تھا۔ پیچھے رہ جانے والی روحیں آواز کا اور نالہ و شیون کرتیں۔ جانے والی روح کے قدموں سے چٹ جاتیں اور اپنی اپنی سفارش پیلی پیلی پتوں کے نقوش پر ابھار کر اس کے قدموں سے چسپاں کرتی رتھیں۔ کچھ پتیاں چٹنے سے انکار کر دیتیں۔ کچھ چٹ جانے کے بعد سوکھ کر الگ ہو جاتیں اور جو دو چار لگی رہ جاتیں وہ روح کی روانگی کے وقت اکھڑ کر پہلی منزل کی نیلی دھول میں گر جاتیں۔ اس وقت کی نالہ و زاری کا سماں عجیب ہوتا تھا منزل پر جانے والے بھی روتے اور منزل سے چلنے والے بھی فراق کی کلفت میں آدواغ کی سسکاریوں میں ڈوب جاتے۔

جس روز سنگل شاہ کو اگلی منزل پر جانے کا اذن ملا اس کے وجود میں پہلی مرتبہ پریم کی امرت دھارا طلق سے ناف تک اتر گئی۔ گالیوں کا وہ پیشہ را جس کی ایک گانٹھ ابھی تک اس کے پردے میں چھپی پڑی تھی ایک فینے کی طرح خود بخود کھلی اور کنول کا پھول بن گئی۔ پھر اس پھول کے نیچے جو ہر کا گدلا پانی صاف ہونے لگا اور دیکھتے دیکھتے نیلے جل میں تبدیل ہو گیا۔ اس نیلے پانی میں چھوٹی چھوٹی روپیلی مچھلیاں کنول کے گرد طواف کرنے لگیں اور اپنے گھمبھروں سے حق ہو کے جلت رنگ، بھائی ایک کورس میں ورد کرنے لگیں۔

آدھی رات کے وقت جب سنگل شاہ اپنی کنیا میں سویا ہوا تھا اور اس کی اگلی منزل پر روانہ ہونے کے لیے دوسری روحیں مقام دواغ پر جمع ہو رہی تھیں نیو لوہاری اس کی کنیا میں داخل ہوئی اور اس کے زنجیر پوش بازو پر سر رکھ کر لیٹ گئی۔ پھر اس نے اٹھ کر آہستہ آہستہ سائیں الیاس کے سارے سنگل کھولے اور نیچے سے اس کا رنجور چڑا نکال کر اس پر محبت کا ہاتھ پھیرا۔ سنگلوں کی تختی کے بعد ایک نرم ہاتھ کے لمس نے جلد کے سارے رویں ایک ساتھ کھڑے کر دیئے۔ آہنی انڈے کے خول سے ایک نرم و نازک چوڑہ برآمد ہوا اور اس نے اپنے آپ کو نیو لوہاری کے پردوں میں چھپا لیا۔

ادھر مقام دواغ پر روحیں بڑی دیر تک انتظار کرتی رہیں۔

میں نے کہا "نیو لوہاری اب کہاں ہے؟"

کہنے لگے "گھر پر ہے اور اصرار کر رہی تھی کہ کھانا کھا کر جاؤ لیکن میری قسمت میں یہ مرحلوں والا سالن کھانا تھا۔ یہ ہوٹل والے خالی مرچیں ہی نہیں ڈالتے بلدی بھی بہت زیادہ ڈال دیتے ہیں۔"

میں نے کہا "اور نیو کا خاوند کہاں ہے؟"

بولے "اس بے چارے کو تپ دق ہو گئی تھی۔ ہوتی کیوں ناں! سارا دن تو سینہ دنگ کر کے بھٹی کے سامنے بیٹھا رہتا تھا۔ تاؤ لگ گیا اور دونوں پیچھے پڑے گل گئے۔"

"مر گیا؟" میں نے پوچھا تو انہوں نے درود بھرے لہجے میں کہا "مرا تو نہیں البتہ گاؤں چھوڑ گیا ہے۔ کچھ ذرا تو دانا زہار کے فقیروں میں شامل رہا اب سنتے ہیں سندھ کی طرف نکل گیا ہے اور کسی چھوٹی سی درگاہ پر فقیری کر کے اپنا وقت گزار رہا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کبھی اس سے ملے؟"

کہنے لگے "نیو کا کاغذ لینے کے لیے دو تین مرتبہ اس سے ملا تھا۔ انگوٹھا لگاتے وقت دھاڑیں مار مار کر رونے لگا تو میرے بھی آنسو نکل آئے۔"

میں نے الیاس محمد عرفان فوٹس کے تین فوٹو تارے۔ دو پر دھیل اور ایک فرنٹ پوز۔ شکر کی آواز سن کر بہت خوش ہوا اور کہنے لگے "بڑا کڑا ک ہے۔"

میں نے کہا "یہ قیمتی کوٹا فلکس ہے اور جرم کمرہ ہے۔ اسے میں نے اپنے استاد کے لیے اٹلی سے خریدا تھا اور سب سے پہلے اس سے آپ ہی کی تصویر بنائی ہے۔"

سب سے پہلے والی صف میں آنے پر الیاس بہت خوش ہوئے اور ڈاڑھی کھجا کر بولے "یہاں کی کھیر بہت اچھی ہے ایک پلیٹ منگو لوں۔"

میں نے کہا "پہلے ہی بہت کچھ ٹھونس لیا ہے اب مجھائش نہیں رہی۔ پھر کبھی موقع ملا تو کھیر بھی کھالیں گے۔"

جب میں چڑی کے بس سینڈ پر اترا تو میرا کمرہ چوری ہو چکا تھا اور میرے کندھے پر صرف ایک بیک رہ گیا تھا اور اس کے ساتھ کئے ہوئے کمرے کا چرمی شپ لگ رہا تھا۔

میری شادی پر ماسٹر بالی نے ایک بڑے سے لفافے میں سوئے کا ہار رکھ کر بھیجا اور ساتھ ہی تاکید کی کہ دلہن اس کو اپنے ہاتھ سے نہ پہنے، ساس پہنائے یا نند پہنائے، مرد ہاتھ نہ لگائے۔ لفافہ کھولنے پر میرا ہاتھ تو لگ چکا تھا، لیکن میں نے ہار کو اسی طرح لفافے میں ڈال کر اماں کو دے دیا اور ساتھ ہی ہدایات بھی دے دیں۔ اسی خط میں استاد صاحب نے مجھ سے ہار کا فوٹو بھی مانگا تھا، لیکن میں نے جواب میں لکھ دیا کہ جب تک آپ اپنی تصویر نہیں بھیجیں گے آپ کو فوٹو نہیں بھیجوں گا۔ تصویر اور فوٹو کا جھگڑا بڑی دیر تک چلتا رہا اور ہم دونوں اپنی اپنی خند پر قائم رہے۔

ماسٹر صاحب کے خطوں سے مجھے توحید کی سکھاتا تو ملتی ہی تھی، اب کچھ کچھ استاد سے مارکسزم کے بھی ملنے لگے تھے۔ معلوم ہوتا تھا وہ حارک مواد کے ساتھ ساتھ انہوں نے مارکسزم کا مطالعہ بھی شروع کر دیا ہے اور اس فلسفے کو ایک نظریے کے طور پر اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ سوشلزم اور مارکسزم کو دور و حاشیت کی ایک شاخ سمجھتے تھے اور سورج میں آکر عجیب و غریب باتیں لکھ جاتے تھے۔ میں نے ان کو کئی مرتبہ لکھا کہ میرا اس فلسفے پر ایمان نہیں ہے کہ اس کے بانی نے مذہب کو حوام کی افیون قرار دیا ہے لیکن وہ اپنے خطوں میں اور شد و مد کے ساتھ ”مذہب“، ”افیون“ اور ”حوام“ کے باہمی رشتوں کا ذکر کرنے لگے اور ایک ایک پر دس دس صفحے کے تھیسز روانہ کرنے لگے۔ ان کے ایسے خطوں سے میری طبیعت اوجھل گئی اور میں نے ان کی تحریروں کو بغیر پڑھے ہیست ہیست کر دکھنا شروع کر دیا۔

گیمانی ہونے کے رشتے اور مذہبی فلسفوں کا مطالعہ کرنے کی وجہ سے ان کی تحریر میں بڑا نکھار آ گیا تھا اور سچی تلی بات کہنے کا ذہنک سیکھ گئے تھے۔ میں نے اپنی خند اور تعصب کے باوصف ان کے خطوں میں ایسی باریک باتوں کے عقدے کھلے دیکھے کہ اگر میری جگہ کوئی

اور ہوتا تو یقیناً ایک سوشلسٹ سمجھ بن جاتا۔

6 ستمبر کی صبح میری بیوی نے گھبراہٹ کے عالم میں مجھے جھنجھوڑ کر کہا ”جلدی اٹھئے۔“

ہندوستان نے لاہور پر حملہ کر دیا ہے۔“

”لاہور پر!“ میں نے ہڑبڑا کر پوچھا ”لاہور پر!“

”ابھی ابھی ریڈیو سٹیشن سے فون آیا ہے۔“ اس نے کہا ”اور انہوں نے یہ خبر دے کر کہا ہے کہ آپ اسی وقت اسی حالت میں فوراً ریڈیو سٹیشن پہنچ جائیے۔“

ریڈیو سٹیشن پر شادی کا ساں تھا اور ہر شخص لڑکی والوں کی طرح بارات کا کارندہ بنا ہوا تھا۔ ریمبرسل روم میں ترانوں کے کورس تیار ہو رہے تھے۔ ریکارڈنگ روم کے اندر گانے والوں کا جھگڑا تھا۔ ریڈیو روم میں کھلی تاریں پھینک کر پانی وضع کا ایک نیٹلی فون لگا ہوا تھا جو بلا واسطہ طور پر ایریا میڈ کو آرڈر کے ساتھ ملا تھا۔ ہر شخص آگے پیچھے اوپر نیچے بھاگا پھرتا تھا اور میڈ کو آرڈر سے دس دس منٹ بعد خبروں کا لینٹن نشر ہو رہا تھا۔ لاہور کے شاعر اور ادیب ریڈیو کی روم کے باہر جمع تھے اور اپنی اپنی تحریروں پر نظر ثانی کر رہے تھے۔ پرانے پرانے بڑے اور نکلنے والے لوگ صدا کا پتہ نہیں کہہ سکتے تھے اگر گراں پلاٹ میں اکٹھے ہو گئے تھے۔ وہ اونچے اونچے نعرے مار رہے تھے اور اپنے کزدر سینوں پر ہاتھوں کے دھمو کے مار مار کر مٹھنی بدھوں کو کر زار رہے تھے۔

بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ صدر ایوب جلد ہی قوم سے خطاب کرنے والے ہیں اور بزدل دشمن کے چوروں کی طرح ہماری سرحدوں میں گھس آنے پر ایک باقاعدہ اعلان جنگ کر کے دفاع وطن کا حکم دیئے والے ہیں۔ سڑکوں پر ہزاروں میں اور گلیوں محلوں کے اندر ایک میلے کا ساں تھا۔ فوجی قافلوں کو روانہ کرنے کے لیے عام ٹریفک سڑکوں کے کناروں سے چمٹ کر رہ گیا تھا اور راستوں میں لوگوں کی ٹولیاں آرمی کے ٹرک روک کر فوجیوں کو سگریٹوں، بسکٹوں اور دیہاتیوں اور مٹھائیوں کے پکٹ دے رہے تھے۔ قصور کے کانوائے روٹ پر لوگ نان کباب اور پلاؤ کی دیکوں کے ریزے لے کر پہنچ گئے تھے جس کے پاس جو کچھ بھی تھا اس نے گھر میں نہیں رکھا تھا کانوائے روٹ پر لے آیا تھا۔

شام کے پانچ بجے دیہاتی پروگرام سے ذرا پہلے لاہور سٹیشن سے جب میڈم نور جہاں کا ترانہ ”اے وطن کے چیلے جوانو“ فضا میں بلند ہوا تو جوانوں نے کھیم کرن پر گولہ باری شروع کر دی۔ سلیمانی کے اندر گھس گئے اور گنڈا سنگھ کے ہل پر قبضہ کر لیا۔ ہندوستان کو پاکستان

جیسے حقیر کیڑے سے ایسے جارحانہ جواب کی توقع نہ تھی۔ اس کی پیش قدمی رکھنے لگی اور وہ پہلی رات جہاں تک پہنچا تھا وہیں کا وہیں کھڑا رہ گیا۔

ہینسٹھ کی جنگ میں سکریٹ لوہی کے ساتھ مجھے مائیک پر بھی آنا پڑ گیا۔ تاج نور محمد حسین اور امیر خان جیسے لوگوں کی صحبت میں رہنے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مائیک پر جاتے وقت نہ تو میں گھبراؤ اور نہ ہی مجھے ایک مخصوص لہجہ بتانے میں کوئی دقت پیش آئی۔

پروگرام چلا اور خوب چلا۔ فوجی خدقوں سے مبارکباد کے پیغام وصول ہونے لگے اور شہر کے لوگوں نے ڈیوٹی روم فون کرنے شروع کر دیئے کہ ہم "شادی" سے ملنا چاہتے ہیں۔ میرا یہ پروگرام اپنے استاد سے رابطے کا ایک ذریعہ بھی بن گیا، لیکن یہ رابطہ یک طرفہ تھا۔ وہ تو میری آواز سن لیتے تھے لیکن ان کے درد بھرے سردوں کو سننے کا میرے پاس کوئی ذریعہ نہ تھا۔ جنگ کی وجہ سے خط و کتابت کا سلسلہ منقطع ہو چکا تھا۔ میں نے اگلی میں پروفیسر باؤسانی کے خط میں ماسٹر بالی کے نام کا ایک لفاظہ ڈال دیا کہ نکلیں لگا کر انہیں پوسٹ کر دیا جائے اور جب ان کا جواب آئے تو اگلی سے میرے نام روانہ کر دیا جائے۔

استاد محترم نے اس رابطے کو بہت پسند کیا اور اپنے پہلے ہی خط میں مجھے لکھا کہ شام کے وقت تمہاری آواز ہر روز سننے کو مل جاتی ہے۔ تم نے تو اپنی لے میں بڑا کمال پیدا کر لیا ہے اور جو باتیں تم کہتے ہو وہ تمہاری لے سے بھی زیادہ وزن دار ہوتی ہیں۔ اس سلسلے کو ختم نہ کرنا اور حالات ٹھیک ہو جانے کے بعد بھی جاری رکھنا۔ اس میں بڑی جان ہے اور یہاں کے لوگ باقاعدگی سے یہ پروگرام سنتے ہیں۔

آگے پوچھا تھا کہ تم کو یہ خیال کیسے آیا اور تم نے منام کے پھلوار سنگھ کی آواز کیسے نکالی۔ یہاں تو تم نے کبھی اس صلاحیت کا مظاہرہ نہیں کیا تھا، پھر پاکستان پہنچ کر ایک دم سے صدا کار کیسے بن گئے۔ ماسٹر مند کشور اگر وال کہتے ہیں کہ تم نے کہانیوں کی ایک کتاب بھی لکھی ہے جس میں داؤ چنت رام کی کہانی درج ہے۔ کیا یہ درست ہے کہ تم نے ایسی کوئی کہانی لکھی ہے اور کیا داؤچی کو پتا تھا کہ تم نے ان کا حال احوال درج کر کے اپنے استاد کا مان بڑھایا تھا۔ وہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہے لیکن میں نے ان کے لڑکے امی چند سے پوچھا تھا۔ وہ اس کہانی کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ میں بھی ایک طرح سے تمہارا استاد ہی ہوں۔ گو اتنا مہاراش نہیں جتنے داؤچی تھے۔ لیکن اگر مجھ پر کوئی کہانی لکھنا تو مجھے بتا ضرور دینا میں اسے پڑھے بغیر مرنے نہیں چاہتا۔ آگے انہوں نے میری لیاقت اور قابلیت کے طول و طویل

تعریف کے پل باندھے تھے۔ جن کے ساتھ ہلکی سی کبیر اس تقاضا کی بھی چلتی تھی کہ میرے کسی ایک شاگرد کو تو ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔ سو ایک نکل آیا۔

ہینسٹھ کی جنگ کے دوران تو ہم بڑے خوش و خرم اور حوصلہ مند رہے، لیکن معاہدہ تاشقند کے بعد ہمارے حوصلے کی لٹائیں کاٹ دی گئیں اور ہمارے دل بچھ گئے۔ وہ جو سب کچھ اس قدر جوش اور دلولے کے ساتھ کیا تھا اور جس کا کردگی پر اتنا ناز تھا بے معنی سی ہو کر رہ گئی۔ ہندوستان ایک پدے سے حریف سے مار کھانے اور شرمندگی کے گڑھے میں اتر جانے کے بعد اچانک ایک صحت مند ملک کے روپ میں ابھرا اور ساری دنیا سے داد حاصل کرنے لگا۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد بھٹو صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ وقت آنے پر وہ اس راز سے پردہ اٹھائیں گے اور عوام کو حقیقت حال سے آگاہ کریں گے۔ خدا خدا کر کے وہ وقت آیا اور ہم سب گوش بر آوازاں انتظار میں بیٹھے رہے کہ اب اس راز سے پردہ اٹھے گا مگر ایسا نہ ہو سکا اور یہ راز کراچی رہا۔

ریڈیو کی رہنمائی اور پر کیف زندگی سے علیحدہ ہو کر میں بورڈ میں اٹھیا اور کتابیں شائع کرنے کا کام شروع کر دیا۔ بورڈ کی زندگی تنہا کرنے اور آگے بڑھنے والی تھی۔ اس میں کوئی لطف نہ تھا نہ ہی کوئی بڑا چیلنج سامنے تھا جو کہ بورڈ کے ارکان طے کر دیتے اسے پورا کرنا پڑتا اور جس کام کا وہ حکم دے دیتے اسے طوعاً و کرہاً بجالانا ہوتا۔ اس ملازمت کے دوران ایک اور ہی طرح کے گردوے پالا پڑا۔ یہ گردوے یلپو کے لوگوں کی طرح ذہین اور روشن فکر تھے۔ انہوں نے طاقتور اور منہ زور بہت تھا۔ اس کے حکومت وقت کے ساتھ نزدیکی تعلقات قائم تھے اور یہ ہر کام بھی اسی ایک حوالے سے کرتا تھا۔ اس کے ایک ایک فرد کو بڑی مراعات حاصل تھیں اور ان کی حضوری میں میری حالت جاگیر دار کے سامنے اس مزارع کی سی تھی جس کی بہت سی بیٹیاں ہوں اور جس کی زندگی کا دار و مدار محض سرداروں کی خوشنودی پر ہو۔ اس گردوے نے مجھے حدودِ حاکر اور پاک صاف کر کے اگلی پر سوکھنے کے لیے ڈال دیا اور میں آتے جاتے موسموں کی ہواؤں میں سوکھ کر ایک ایسا پارچہ بن گیا جس سے موثریں صاف کی جاتی ہیں اور جسے نچوڑ کر پھر سوکھنے کے لیے ڈال دیا جاتا ہے۔

ماسٹر بالی کے خط مجھے اب بھی ملتے تھے لیکن ان میں وہ چاشنی نہیں رہی تھی۔ محبت اور تعلق کی چڑیاڑ گئی تھی اور اب ایک خالی سا گھونسلارہ گیا تھا جسے نہ پھینکا جاسکتا تھا نہ رکھا جاسکتا تھا۔

استاد مکرم اپنے خطوں میں جس قدر گرجو ش کا اظہار کرتے اسی نسبت سے لا تعلقی کا خلا بسیط ہوتا جاتا۔ ان سے ملنے کی ایک موبوم سی آرزو البتہ باقی تھی، لیکن وقت کے ساتھ ساتھ وہ بھی ماند پڑ رہی تھی۔ رشتے تاتے نکلیتے کی طرح مضبوط اور پلوں کی طرح پائیدار نہیں ہوتے۔ ان کے ختم ہو جانے کی زیادہ سے زیادہ قیمت ایک نوحد یا ایک مرثیہ ہوتی ہے۔ بہت مضبوط ہوئے تو ختم ہونے کے بعد چند گلے اور کچھ شکوے باقی رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی آہستہ آہستہ ہوا میں تحلیل ہو جاتے ہیں اور زندگی کی گاڑی واپس اپنے سو میٹھم پر پہنچ جاتی ہے اور اس وقت تک اسی رفتار سے چلتی رہتی ہے جب تک زندگی کا اچھا آخری ٹکٹشن نہ آجائے۔

ماسٹر صاحب زندگی کی ساری احتیاطی تدابیر کو اور جہد مسلسل کو کھیل قماشے کا نام دیتے تھے۔ ان کو نہ کھیل سے دلچسپی تھی نہ قماشے سے۔ نہ دیکھنے سے نہ اپنا آپ دکھانے سے۔ نہ روشنی سے نہ بج کے پار مٹانے سے پھر بھی وہ کھیل قماشے کا بڑا احترام کرتے تھے۔ ان کے لیے ہارمت کی آمد اور جنازے کی روانگی ایک سے تقدس کے حامل تھے۔ وہ کامیابی اور ناکامی کی ماں بیٹی کے بے آسرا گمراہے کا بڑا خیال رکھتے تھے اور اپنی ذکوۃ اور صدقے کی ساری رقم ان پر خرچ کرتے تھے۔ لیکن مجھ سا با عمل اور روشن خیال انسان جو اپنی ایگو کے خول سے باہر نکلنے کو رہبانیت گردانتا ہے اس راہب سے متاثر ضرور تھا۔ گرجو ش کی کم ہونے کے باوصف ہمارے درمیان بندھی ہوئی ڈور کھینچ کر باریک ضرور ہو گئی لیکن ٹوٹ نہ سکی۔

مہاراجہ رنجیت سنگھ کی برسی پر سنگھ یاتریوں کا جو قافلہ ہندوستان سے آیا اس میں بھائی کرپال سنگھ جتنے دار بھی تھے۔ مجھ سے ملنے پورڈ کے دفتر آئے تو ہم نے گھٹ کر ایک دوسرے کو چھٹی ڈال لی اور دیر تک جدا نہ ہوئے۔ ان کے ساتھ دو اور سنگھ بھی تھے جو ہمارے اس قریبی تعلق کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے۔ میں نے بھائی کرپال سنگھ کو کرسی پر بٹھاتے ہوئے کہا "بائی تو تو بالکل بوڑھا ہو گیا۔"

انہوں نے ہنس کر کہا "اپنی شکل نہیں دیکھتا جو ایک زمانے میں کلواکاسیپ تھی اب پیچھے کی طرح بے ڈھمی ہو گئی ہے۔"

میں نے کہا "بائی تیری تو ڈاڑھی بھی آڑھی سفید ہو گئی۔"

کہنے لگے "تو ڈاڑھی رکھ لے اگر ساری سفید نہ نکلے تو میرا نام بنادینا۔"

دوسرے دونوں سنگھ چنے لگے تو میں نے بے بی بی باپو جی کلدیپ سنگھ اور چھوٹی بی بی کی ہایت پوچھا۔ ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے "سب راضی باشی، سنگھ ساند، رب سچ کی مہربانی، ڈاکوڑ کی کرپال۔"

میں نے کہا "کلدیپ تو سنا ہے ولایت چلا گیا تھا؟"

کہنے لگے "ماں باپ کا لاڈ لا سب سے چھوٹا میری مرضی کا مالک، سنگھ ہزار روپیہ اجلا کے واپس آ گیا۔"

"کوئی میم وغیرہ تو نہیں لے آیا وہاں سے۔" میں نے پوچھا۔

"میم کی سن لو" انہوں نے بڑی سنجیدگی سے کہا "باپو جی کو تو اس کی چٹھیاں دکھاتا رہا۔"

بے بی کو تصویر میں دکھا کر ڈراما ہاکر سو سوار آ رہی ہے، بدھ دار آ رہی ہے، دونوں ہی اس کو رشو نہیں دے رہے کہ ناں کا کا اور صرنا بلائیں، سارے میر کی بدنامی ہوگی۔ لہذا ہو تو

ایک بار پھر ادھر ہی چلے جانا ہم بھاڑا دے دیں گے۔
”اور آپ نے کچھ نہیں کیا؟“

”میں کیا کرتا بھائی میرے۔ لاڈلا جتنا سب سے چھوٹا اوپر سے سوہنا میں نے بھی کہہ دیا کہ ادھر مشکوئی ہو تو ادھر منگوائے مجھے کوئی اعتراض نہیں دوبارہ ولایت جانا ہونے تو خرچہ بھاڑا میرے سے لے لے بڑھے باہیاں کو تنگ نہ کر۔“

”بڑا سیانا ہے۔“ بھائی کرپال سنگھ کے ایک ساتھی نے کہا ”مہاجنوں کی طرح ہیں لگھ کر سو پرانگوٹھا لگو لیتا ہے۔“

”لاڈلا ہے بھئی لاڈلا۔“ دوسرا بولا ”جو بڑے دیر بھر کا لاڈلا ہو اس کی تو چاروں طرف کپاہی کپاہی ہے چاہے کھڑے کھیت کا سودا کر لے چاہے منڈی بھیج دے۔“

”اد بھائی کیا بڑا بھر اور کیا اس کی اوقات۔“ دواگور نے سوچ بٹار کھی ہے۔ ”کرپال سنگھ نے کہا“ صورت جیسا کلدھ پ سنگھ ہمارے گھر پیدا کر دیا ہے پروا کی ہے پرواہاں ہیں۔ اس کا کون سا ناناواں لگتا ہے چاہے جتنی سے ہیر پٹا ہے۔“ پھر میری طرف غور سے دیکھ کر کہنے لگے ”سادے تخت پور میں دھوم پڑی ہوئی ہے کہ کوئی بڑا افسر بن گیا ہے گوٹھی بنگلہ گاڑی ساتھ سرکاری ملازم۔ سنا ہے بی بی بھی بڑی تعلیم یافتہ ہے کتابیں لکھتی ہے۔“

میں نے کہا ”آپ اس سے مل کر معلوم کر لیجئے گا کہ کس قدر تعلیم یافتہ ہے۔ اس وقت گھر چلتے ہیں اور وہیں کھانا کھاتے ہیں۔“

کہنے لگے ”یہ اپنے سردار سو بھائی سنگھ تو اس کھالیتے ہیں پر بھائی ہر دت سنگھ وہی ٹہرین ہیں۔“

بھائی ہر دت سنگھ نے ہاتھ جوڑ کر کہا ”کوئی بات نہیں آپاں سوکھی روٹی چینی کے ساتھ کھالیں گے۔ بہت ہوا تو دعویٰ منگوائیں گے۔ ایسی کوئی بات نہیں۔“

میں نے شریف الدین کو اندر فون اٹھا کر کہا ”بانو کو بتادیں کہ صاحب کے ساتھ تین مہمان بھی آرہے ہیں جن میں سے ایک دہی ٹہرین ہیں کوئی آدھ گھنٹہ تک بیٹھ جائیں گے۔“

سو بھائی سنگھ نے ہر دت سنگھ کو بتایا ”اندرونی اے کو فون کیا ہے وہ آگے خود ہی بتا دے گا۔“
میں نے پی اے کو فون بھی اپنی افسری دکھانے کے لیے کیا تھا اور اپنے لیے ”صاحب“ کا لفظ بھی شان بڑھانے کے لیے استعمال کیا تھا۔ ان تینوں پر وحاہک بیٹھ گئی اور بانی کرپال سنگھ

نے باری باری دونوں کی طرف دیکھ کر خاموش زبان میں پوچھا ”دیکھا پھر ایسے بڑے بڑے لوگوں سے ہمارے تعلقات ہیں اور کیسے بڑے بڑے لوگ ہمیں کھانے پر مدعو کرتے ہیں۔“
کھانے تک کا وقت گزارنے کے لیے میں نے بانی کرپال سے تخت پور کی خبریں پوچھنا شروع کر دیں جن کے نشریے میں ان کے ساتھی بھی شریک ہو گئے۔

میں نے کہا ”بانی آپ کی پتی میں ایک جاگی بھدی ہوئی تھی شہر سے دور جنگلی میں“
ہر دت نے کہا ”وہ توجہ ہی مر گئی تھی پہلے گلے کے دنوں میں پتہ نہیں سپ لایا تھا یا لکھا تھا کٹا کٹ گیا تھا۔ جنگلی کے اندر ہی مر گئی تھی۔“

”نہ سب لڑا تھا نہ لکھا تھا نہ بچا تھا۔ کوئی چیز کھالی تھی اس نے نہ ہر لیل۔“ بھائی کرپال سنگھ نے کہا ”دو دن تک اپنی جنگلی میں پڑی رہی۔ جب بدبو آنے لگی تو لوگوں کو پتہ چلا۔ اب ناں تو کوئی اسے ساڑنے پر تیار تھا نہ پھونکنے پر۔ باپو جی نے چماروں کے ہسرام جا کر اطلاع دی تو وہ بھی ہاتھ لگانے سے انکاری ہو گئے کہ ہماری موت برادری نہیں ہم نہیں چھو سکتے۔“

”پھر کشیش والوں نے اس کی ٹانگ میں دسی ڈال کر کھینچا اور کالو وال کی نیا نیوں میں لے جا کر دبا دیا۔“ ہر دت نے کہا ”پتہ نہیں کون تھی اور کہاں سے آئی تھی۔ ہم نے توجہ سے ہوش سنبھالا ہے وہیں دیکھا اسی جنگلی میں۔“

میں نے کہا ”اور مودن پاڈی کا کیا حال ہے؟“

کہنے لگے ”بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔ اس وقت سو سے اوپر ہو گا اب بھی منڈی میں بوریاں اٹھاتا ہے اور اسی طرح بھگڑتا ہے۔ تھوڑا سا دماغ مل گیا ہے عورت مرد میں فرق نہیں کر سکتا۔“

میں نے کہا ”ایک چالوں کلینر تھا جو گیس پلانٹ کی لاریوں میں سٹمارا کرتا تھا۔ وہ؟“
بھائی کرپال سنگھ نے کہا ”جانوں کون سا مجھے تو پاؤ نہیں؟“

سو بھائی سنگھ نے کہا ”حد کرتے ہو دیر جی آپ کو جانوں یاد نہیں۔ لمبے لمبے بودوں والا جانوں کا لیا جو مرزا صاحب کی بیگ لگا کر تا تھا۔“

”اچھا اچھا جانوں کا لیا“ بھائی کرپال سنگھ نے کہا ”وہ جو دھتی چو ہڑی کے ساتھ پکڑا گیا تھا۔“

”بالکل بالکل“ میں نے سر ہلا کر کہا۔ ”وہی جو لیٹی اچیاں مندر اں والے پاؤں سے خیر فقیر ان نون گایا کرتا تھا۔“

کہتے تھے "اس کو تو تیرے ہوتے ہوئے قید بول گئی تھی چھ مہینے کی۔ پھر دوپانچ سال اور جیل میں رہا۔ اب پتہ نہیں۔"

میں نے کہا "چھ مہینے کی قید بول گئی تھی تو وہ پانچ سال جیل میں کیسے رہا؟" سو بھائی سنگھ نے ہنس کر کہا "وہ ماں کا پیر بھی عجیب آدمی تھا۔ چھ مہینے کی قید کاٹ کر جس دن رہا ہوا تو جیل کے پاس ٹیوں کے پیچھے چھپ گیا۔ شام کو جب مڑمڑوں کی لاری انہیں پکھری سے پیشی بھگتا کر واپس جیل لائی تو یہ سالہا پھر ان میں رل کر جیل کے اندر داخل ہو گیا۔ پورے تین سال تک جیل کے اندر سخت کی روٹیاں کھاتا رہا۔ جس دن پتہ چلا تو جھگڑی اور بیڑی ڈال کر سپرٹنڈنٹ جیل کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ ہیرن صاحب تھا تو ایٹکواٹریں پر تھا دلہا آدمی۔ جب جانوں نے اسے بتایا کہ باہر تو دھکے ہی دھکے ہیں اندر آرام ہے تو ہیرن صاحب بہت ہنسنا اور اس نے وارڈن کو حکم دے دیا کہ جانو کو اندر ہی رہنے دیا جائے اور اس سے مشقت بھی نہ لی جائے۔ دو سال بعد جب ہیرن صاحب کی تبدیلی ہو گئی تو جانوں کو بھی مجبور کر دیا ہوتا تھا۔ اب پتہ نہیں کہاں ہے وہ ابس تخت پور تو نہیں آیا۔"

میں نے کہا "اور ایک پنڈت شیو رام ہوتا تھا اعلیٰ والی گلی میں جو ہر وقت داتن ہی کرتا رہتا تھا؟"

"وہ بے چارہ تو چھا ہالے کر مر گیا تھا۔" ہر دت سنگھ نے کہا۔ "پڑوس کے لڑکوں سے کوئی جھگڑا ہو گیا۔ انہوں نے مل کر پھینسی لگائی۔ چھوٹی سی دیہہ اور چھوٹی سی جان بے عزتی نہ سہار سکی۔ پرانے ٹیکر کے درخت میں رسہ ڈال کر پھانسی لے لی اور نہر میں ڈوب کر مر گیا۔"

میں ہنسنا تو بھائی کرپال سنگھ نے سنجیدگی سے کہا "ہر دت ٹھیک کہتا ہے۔ اپنے علاقے سے کوئی دو ڈوھائی میل دور اودے کرن کے پل میں اس کی لاش پھنسی ہوئی تھی۔ اس نے تو اور دور نکل جاتا تھا اگر ڈالا پل میں نہ پھنستا۔"

"ڈالا" میں نے حیران ہو کر پوچھا تو سو بھائی سنگھ جی کہنے لگے "وجود تھا اس کا چھوٹا اور غصہ تھا اس میں زیادہ۔ لگے میں پھندہ ڈال کر زور کا جھوکا جوتا ڈالا ٹوٹ گیا۔ دونوں نہر میں جا گرے۔ پھندہ لگا رہا اور ڈالا شیو رام کو کھینچتا ہوا اودے کرن کے پل تک لے گیا۔ اصل میں وہ پھندہ لگنے سے نہیں مر ڈوب کے مرا ہے۔"

ہر دت سنگھ نے کہا "ماں سردار جی مر پھندہ لگنے سے ہی ہے۔ پانی تو اس کے پیٹ میں

بعد میں داخل ہو اجب وہ نہر میں گرا ہے۔"

بھائی کرپال سنگھ نے کہا "ہر دت سیاں کچھ عقل کی بات کر بھائی۔ پھانسی لگنے میں اس کا رسکا تو ٹوٹا ہی نہیں کیونکہ ڈالا تو ایک ہی ٹیکے میں ٹوٹ کر پانی پر آگرا تھا۔ اب جب رسے کی ترخی نہ رہی اور دیہہ کا بوجھ ہی نہ رہا رسے پر تو رسکا کس طرح سے ٹوٹ سکتا تھا شیو رام ڈوب کر ہی مرا ہے۔"

ہر دت سنگھ بولا "پر سردار جی پوسٹ مارٹم رپورٹ سے تو یہی اچانک ہوا ہے کہ پھندا لگنے سے مرا ہے۔"

"اودے تم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ چھوڑو۔" بھائی کرپال نے زور ہو کر کہا۔ "چار ٹیکے دے کر جیسی مرضی رپورٹ لکھوا لو۔ رپورٹ نے کوئی منہ سے بولنا ہے کہ میں جھوٹی ہوں۔"

ہر دت سنگھ اس پر بھی نہ مانا تو ان تینوں کے درمیان گرم مباحثہ شروع ہو گیا۔ کافی دیر تک وہ آپس میں جھگڑتے اور اپنی اپنی تحقیق کا جو از پیش کرتے رہے لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ جب میں نے انہیں اپنے مکالموں میں لڑکھڑاتے ہوئے دیکھا تو بھائی کرپال سنگھ سے پوچھا "لالہ رام چندر زندہ ہیں کہ فوت ہو گئے؟"

کہنے لگے "زندہ ہیں پر اب دکان پر نہیں آتے۔ گھٹے گوڑے سوچ گئے ہیں اور چلنے پھرنے سے معذور ہو گئے ہیں۔ دو آدمی بنگلوں میں ہاتھ دے کر تھوڑا سا چلاتے ہیں اور پھر بٹھا دیتے ہیں۔ دکان پر اب گجاند اور شری بھگوان بیٹھتے ہیں۔ مول چند اور نرائن داس اسامیوں سے اگائی کا کام کرتے ہیں۔"

"یہ بھی تو بتائیں کہ برف کا کارخانہ بھی لگا لیا ہے۔" سو بھائی سنگھ نے کہا۔

"برف کا کارخانہ تو پہلے بھی تھا۔" بھائی کرپال سنگھ نے سوچتے ہوئے کہا۔

"ہمارے ہوتے ہوئے نہیں تھا۔" میں نے یقین سے کہا "ہمارے بعد میں لگایا ہو گا۔"

"چلو پہلے کسی پابند میں کسی۔ لالہ جی کی سوچ بہادر ہیں۔ اولاد جو ان سے اور سارے

کی ساری سیانی ہے۔ ہم جانوں کی طرح نہیں کہ بڑھے ہونے تک عقل ہی نہ آتی۔"

پھر میں نے دماغ پر جان بوجھ کر زور دیتے ہوئے پوچھا "وہ ایک کشمیری پنڈت نہ رہتے تھے ویدوں کے محلے میں۔"

"ان کا کچھ پتہ نہیں۔" بھائی کرپال سنگھ نے جواب دیا تو سو بھائی سنگھ جی کہنے لگے "بھائی جی

برجواہن کو پوچھ رہے ہیں.....

کرپال سنگھ نے ہاتھ اٹھا کر اپنے دونوں ساتھیوں کو صبح کرتے ہوئے کہا "بھاپے کو بات کرنے دو اور مجھے جواب دینے دو تم نے سچ میں نہیں بولا۔" پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے "ہاں جی؟"

میں نے کہا "جانی کرپال سنگھ جی شاید یہ ٹھیک کہتے ہیں ان کا نام پنڈت برجواہن ہی تھا۔"

"تو نے پنڈت برجواہن سے کیا لینا ہے تو سیدھی بات کر اصلی۔"

"اصلی ہی تو کر رہا ہوں۔" میں نے مسکراہٹ روک کر کہا "ویدوں کے محلے میں نہیں رہتے تھے وہ؟"

"وہ ویدوں کے محلے میں ہی رہتے تھے پر تو اصلی بات کر اپنے اندر دلی۔"

میں نے کہا "آپ بھی کمال کرتے ہیں جانی میں اصل بات ہی تو کر رہا ہوں۔"

کہنے لگے "اصل بات اس سے اگلی ہے۔ ویدوں کے محلے سے بھی اور پنڈت برجواہن کی ذات سے بھی۔" یہ کہہ کر وہ رک گئے اور میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے "سیدھی طرح راجنی کا حال کیوں نہیں پوچھتا۔ مل فریب کیوں کر رہا ہے۔"

میں نے منہ پکا کر کے کہا "مل فریب کی اس میں کیا بات ہے، کبھی کا حال پوچھا رہا ہوں۔"

کہنے لگے "پہلے جتنے لوگوں کا حال پوچھا ہے ہم کو یاد بنانے کے لیے پوچھا ہے۔ وہ تیرا اصل مقصد تھا۔ پتہ چلتا تو راجنی تک چاہتا تھا ہم کو خواہ خواہ چھوڑنا تھا۔"

میں نے زور کا ایک قہقہہ مار کر کہا "یہ بات نہیں بھائی کرپال سنگھ جی میں نے سب کا حال ایک ایک کر کے ہی پوچھنا تھا نا۔"

بھائی کرپال سنگھ نے کہا "اب تیرا استوار ہے اور ہمارا گیانی ہے۔ پوجیہ سنان منکھ ہے اس کو کچھ کہہ بھی نہیں سکتے پر اس نے راجنی کو سورت بنا کر چٹائی کے ساتھ لگا دیا ہے۔"

میں نے جلدی سے کہا "تو اس میں ان کا کیا قصور ہے؟"

کہنے لگے "قصور تو کوئی نہیں ساری ہوئی کی بات ہے پر بی بی کے ماتھے پر لکھ کر رکھ رکھ گئی۔ اب اس کا کیا جینا اور کیا مرنا؟"

سردار سو بھانے بے چین ہو کر پوچھا "کس کی بات ہو رہی ہے بھائی جی؟"

"کپے گیانی بھائی باہلی سنگھ جی نہیں۔" کرپال سنگھ نے کہا "وہ ویرجی کے استاد بھی ہیں

اور جگری یاد بھی۔ ان کی بات کر رہا ہوں۔" سردار سو بھانے نے کہا "ان کو تو گورو مہاراج نے ایسا گیانی دیا ہے کہ بڑے بڑے گیانی ان کے سامنے مٹی ہو گئے۔ کئی مرتبہ ان کو دربار امرتسر کے لیے بلاوا آیا پر وہ تخت پور چھوڑ کر نہیں جاتے۔ شدید کیرتن میں ان کی جانی سے جان پڑ جاتی ہے۔"

ہر دت سنگھ کہنے لگے "آپ ان کو جانتے ہیں ویرجی؟"

"جانتے؟" کرپال سنگھ نے حیران ہو کر کہا "او بھائی یہ دونوں اک تک ہیں۔ تو بے دو ہیں تار ایک ہی کھڑکتی ہے۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگا کر کہا "کہاں سرکار بھائی باہلی سنگھ جی اور کہاں میں۔ کہاں رام رام کہاں کہاں نہیں میں۔ مجھے اتنا شہکار تو نہ کرو۔"

یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے اپنے استاد کے نام کے ساتھ سنگھ کا لفظ استعمال کیا۔ کر تو گیا لیکن میری روح کانپ گئی اور بڑی دیر تک گم سم بیٹھا رہا۔ میں ان کا نام اس لفظ کے بغیر بھی لے سکتا تھا لیکن سامنے بیٹھے ہوئے مہمانوں کی خوشنودی نے مجھے اس قدر بودا بوا دیا تھا کہ مجھے اپنے آپ پر اعتبار نہیں رہا تھا۔

اصل میں پاکستان کے لوگ بڑے وطن پرست، محبت وطن اور اپنے تشخص سے پیار کرنے والے ہیں لیکن ان میں آنکھوں کی شرم اور دل کی نرمی بہت ہے۔ غیر کا دل رکھنے کے لیے دو ٹوک جواب نہیں دے سکتے۔ اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگتے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ اگر میں دل کی بات زبان پر لے آیا تو لوگ مجھے پس ماندہ ٹھک نظر بنے علم اور خیال پرست سمجھیں گے۔ اس خوف کے چش نظر وہ اپنے نظریے اور اعتقاد کو ایک طرف لپیٹ کر غیر کے ہم خیال بن کر بیٹھ جاتے ہیں لیکن بعد میں پشیمان ضرور ہوتے ہیں۔ اس وقت کچھ ایسی پشیمانی میں میں بھی مبتلا تھا اور اپنے اظہار پر علانیہ نظر پانی کرنے سے منع ور تھا۔

چڑا سی نے آکر بتایا کہ گھر سے فون آیا ہے کھانے پر انتظار ہو رہا ہے۔ میں نے اپنا بریف کیس چڑا سی کو دیا۔ مہمانوں کو ساتھ لے کر اٹھا اور دفتر سے باہر آ گیا۔ پورچ میں مقید وردی والا شو فر گاڑی کا دروازہ کھولے کھڑا تھا۔ پی اسے اور لگاؤ ٹش آفسر گاڑی کے پاس موجود تھے۔ میں نے چند غیر ضروری ہدایات ان کو دیں اور مہمانوں کو لے کر گاڑی میں بیٹھ گیا۔ اتنے سارے مطمئن کے باوجود ہم غیر ملکی مہمانوں سے پھر بھی مرعوب رہتے ہیں۔ شاید باہر کی عظیم الشان بلڈنگ کی بنیاد اندر سے کھوکھلی ہے۔

سکھ یا تریوں کے جانے کے پورے ایک مہینے بعد مشرقی پاکستان میں بے چینی کی لہر پیدا ہوئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس نے ایک شدید احتجاج کی صورت اختیار کر لی۔ مشرقی پاکستان کے مسلمانوں کا یہ احتجاج مغربی پاکستان کے مسلمانوں کے خلاف تھا جو ان کے بھائیوں ایک عرصہ سے مشرقی پاکستان کی دولت لوٹ لوٹ کر اپنا گھر بھر رہے تھے اور مشرقی پاکستان کے مقابلے میں امیر ہوتے جا رہے تھے۔ بھارتی حکومت کو چونکہ شروع ہی سے مسلمانوں سے قلبی لگاؤ ہے اور وہ دنیا کے کسی خطے میں بے عدلی اور بے انصافی کو برداشت نہیں کرتی اس لیے اس نے مشرقی پاکستان کے مظلوم مسلمانوں کو ظلم و ستم کی وہ تفصیل فراہم کرنا شروع کر دیں جو مغربی پاکستان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھیں۔

بھارتی حکومت نے مشرقی پاکستان کے ایک ایک مسلمان کو جا کر سمجھا یا کہ ان کے منہ پر ریٹے کی برآمد سے اسلام آباد کی تعمیر ہو رہی ہے اور ان کی جائے کی دولت سے ملتان، ساہیوال اور لاہور کی سڑکیں بن رہی ہیں۔ چوکی کاٹکا چھانقصور، انجمن آباد اور چوئیاں میں ایک سو پچاس پرائمری سکول اسی پیسے سے بنے ہیں۔ گرنالہ کا کاغذ باہر ایک سپورٹ کر کے اس سے ایک سو تیس کاریں اپورٹ کی گئی ہیں جو ساری کی ساری مغربی پاکستان میں چل رہی ہیں۔

پھر بھارت نے آرٹ پیپر پر دو تین تصویروں کا ایک کتابچہ شائع کر کے بھی گھر گھر تقسیم کیا جس میں مغربی پاکستان کے عام آدمیوں کو دکھایا گیا تھا جو قد میں نرنگ میں لباس میں اور صحت جسمانی کے اعتبار سے مشرقی پاکستان کے خاص آدمیوں سے پہرے تھے اور جن کی روزانہ خوراک کا استعمال وزن میں بھی زیادہ تھا اور طاقت فراہم کرنے میں بھی ارفع تھا۔ مغربی پاکستان میں شادی کے موقع پر کچھ بھی ہوئی ایک تصویر میں دو لہاؤٹوں کا ہار پہن کر کھڑا

تھا اور اس کے نیچے لکھا تھا "مشرقی پاکستان سے لوٹی ہوئی دولت کا کرنسی ہر جس کی مالیت اسی ہزار روپے ہے۔"

جب مشرقی پاکستان کے مجبور و مظلوم لوگوں نے بھارتی حکومت کی طرف رحم بھری نگاہیں اٹھا کر پوچھا "ہم کیا کریں؟" تو انہیں کلکتہ کے مولوی رفیع الدین احمد اور مولانا دودو القادر انصاری کے وہ دینی پمفلٹ دیئے گئے جو پرانی وضع کے مری رام پور کاغذ پر چھپے تھے اور جن کے صفحے چھری چاقو سے کاٹ کر الگ الگ کیے جاتے تھے۔ ان رسائل میں بنیادی دینی تعلیمات تھیں اور صحیح نماز ادا کرنے کے مسائل بیان کیے گئے تھے۔ آخری صفحے پر ممبر کی تلقین تھی اور آخری پیرے میں حضرت ریان بن جابر کا فتویٰ تھا کہ جب تم پر ظلم کی اور چرکی اٹھنا ہو جائے اور تمہارا بھائی تمہاری آنکھوں کے سامنے تمہاری دولت سمیٹنے لگے اور تمہاری نظروں کے سامنے اس دولت سے عیاشی کا سامان فراہم کرے تو اللہ کا نام لے کر نکو اور اٹھاؤ اور اس کے خلاف جہاد کرو۔ یہ جہاد افضل ترین جہاد ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کے نزدیک اپنے بندے کا سب سے پسندیدہ فعل ہے۔ آخری فقرہ تھا کہ اس وقت جس طرح سے مغربی پاکستان خاص طور پر پنجاب مشرقی پاکستان کو ایکسپلاٹ کر رہا ہے ہر مسلمان مرد و زن اور بچے بوڑھے پر دینی فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اسلام آباد کے خلاف اعلان جنگ کرے اور اس وقت تک آرام سے نہ بیٹھے جب تک اللہ کی نصرت اس کے دروازے پر نہ کھنچ جائے اور وہ ظلم سے نجات حاصل نہ کر لے۔ حاشے کے باہر ایک خط کشیدہ لائن تھی جب تک ہم اپنی پوتر مائری بھوی کے لیے "پاکستان کا گندہ اور اشدھ لفظ نہیں چھوڑیں گے اس وقت تک فتح یمن سے مالا مال نہیں ہوں گے۔"

مشرقی پاکستان کے پامال و پریشان درد مند مسلمانوں نے جب اپنی بے چارگی اور کم بائگی کا اظہار کیا تو بھارتی حکومت نے اللہ کے نام پر دین برحق کی خدمت کے لیے انہیں ہر طرح کی مدد کا یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ اگر وہ مغربی پاکستان کے خلاف حق و صداقت کی تلوار اٹھائیں گے تو بھارتی حکومت ہر طرح سے ان کی مدد کرے گی اور فتح کے دن تک ان کا ساتھ دے گی۔ اس مدد میں گولہ بارود، رسل و رسائل، فوجی و انتہائی مدد سبھی کچھ شامل ہو گا اور اگر حالات نے ساتھ دیا تو ہوائی آپریشن بھی اس کا ایک حصہ ہو گا۔ مشرقی پاکستان کے مسلمان اس فیکمہ المدد سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے مغربی پاکستان اور پاکستان کی فوج کے خلاف باقاعدہ اعلان جنگ کر دیا۔

خوب لڑائی ہوئی اور محمدسان کارن پڑا۔ مسلمان جب مسلمان کے خلاف لڑتا ہے تو بڑی دلیری اور بے جگری کے ساتھ لڑتا ہے۔ یہ ان ہمت خاصیت شروع ہی سے اس کے اندر موجود ہے اور وقت آنے پر اپنی پوری توانائی کے ساتھ عود کر آتی ہے۔ غیر مسلم کے ساتھ مسلمانوں کی جنگ بڑی محتاط ہے حد متوازن اصولوں پر مبنی اور شرافت کی جنگ ہوتی ہے۔ صلیبی جنگوں میں مسلمان اپنے دشمن کو عزت اور وقار کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ مشکل وقت آ جانے پر انہیں راستہ بھی دیتے ہیں۔ رچرڈ ہار ہو تو اس کے علاج کے لیے اپنے حکیم و طبیب بھی بھیجتے ہیں۔ دشمن کا نام لیتا ہو تو اس کو چرڈ شیر دل کہہ کر یاد کرتے ہیں لیکن جب انہوں کے ساتھ جنگ ہو تو پھر کوئی اصول اصول نہیں رہتا ضابطہ ضابطہ نہیں رہتا۔ سوچ کی ساری راہیں بند ہو جاتی ہیں اور بے رحمی کا ہر راستہ کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ دونوں بڑھ بڑھ کر اپنے بھائی کو ایسے ذمہ لگاتے ہیں کہ اگر دشمنی شیر پنج بھی جائے تو ارد گرد کی کومڑیاں سالہا سال تک اس کا گوشت نوچ نوچ کر کھا سکیں اور اپنے پر یوار کی پرورش کرتی چلی جائیں۔

ڈھاکہ فال کر گیا۔ پاکستانی فوج کے کمانڈر نے اپنا پستول بھارتی فوج کے خارج کمان دار جنرل اردو کی خدمت میں پیش کر دیا۔

مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے مسجدوں میں چراغاں کیا۔ اللہ کے پاک نام کا ورد بلند ہوا اور مجلسوں میں حمد و نعت کے بعد بھارتی حکومت کے کارناموں کے گیت اور ترانے گائے گئے۔ کچھ بڑے روئے قہر انہوں نے ان کی ڈاڑھیاں کھینچ کر ان کی لنگھیاں ڈھیلی کر دیں۔ ظالم اپنے کفر کردار کو پچھتا اور ہنگامہ دیش میں خیر و خوبی اور دولت و فراوانی کی بہاروں نے ڈیرے ڈال دیئے۔ دولت لوٹنے والے کے ہاتھ اور سر قلم کر دیئے گئے تھے اور اب ہنگامہ دیش کی دولت اپنی تھی اس جنگ آزادی نے ہنگامہ دیش کا سرخسہ خیر سے بلند کر دیا تھا اور دنیا کے سارے محکوم ملک ایڑیاں اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے تھے۔

مشرقی پاکستان پر فتح پانے کے بعد بھارت کا قد ایک دم اونچا ہو گیا تھا اور عالمی برادری کے مہذب ملک اس کو قدر کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ خود بھارت کے لوگوں نے اس عظیم فتح کے شکرانے میں اپنی ملک کو سونے کے علاو ان میں تول اور ملک نے ترازو کے پلڑے سے اعلان کیا کہ ہم نے ہزار سالہ غلامی کا بدلہ لے لیا۔

ہماری زند گیوں میں معاہدہ عاشقہ پہلے ہی ایک راز تھا اب ایک دوسرا راز سقوط

ڈھاکہ کی شکل میں اس کے پہلو میں آکر کھڑا ہو گیا۔ کچھ آوازیں آ رہی تھیں یہ سب کچھ جنرل بیک کی وجہ سے ہو اس کو پچاسی دی جائے۔ کچھ کا خیال تھا کہ اگر سلامتی کو نسل میں پولیٹڈ کارپوریشن نہ بھاڑا جاتا تو پاکستان دولت ہوئے سے بچ جاتا۔ کچھ لوگ اسے المیہ اور انقراض کی کارروائیوں کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ کچھ پرانی وضع کے لوگ مشرقی پاکستان کے ہندوؤں کو نام نہاد مہرتے تھے۔ سوشلسٹوں کے لیے یہ ایک سیدھی سی بات تھی کہ یہ صاف اور واضح تاریخی عمل ہے جہاں استحصال ہو گا وہاں یہی حال ہو گا۔ جمہوریت نواز گروہ اسے مارشل لاء کی وجہ سے سمجھتا تھا۔ مارشل لاء ”ادھر تم ادھر ہم“ کے اعلان کو اس شکست سے وابستہ کیے بیٹھا تھا۔ جماعت اسلامی اسے دین سے دوری کا شاخسانہ خیال کرتی تھی۔ عام لوگ اتنی بڑی شکست کو امریکہ کی یارماری خیال کرتے تھے کہ سخت ضرورت کے وقت بھی بحری بیڑا نہ بھیجا۔

کچھ لوگ ایسے بھی تھے جن کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا۔ دہوتے تھے اور ہر دم نالہ و شیون میں مبتلا تھے۔ انہوں نے کبھی مشرقی پاکستان دیکھا نہ تھا لیکن اس سے وابستہ ضرور تھے۔ چند ایک ایسے بھی نکلے جنہوں نے ڈھاکہ فال کی خبر سنی اور ایک دلدوز چیخ کے ساتھ جاں بحق ہو گئے۔ انہوں نے صرف مشرقی پاکستان کا نام سنا ہوا تھا اپنے مغربی پاکستان میں تھے لیکن ان کی رو میں مسجدوں والے شہر کے گنبدوں میں مقیم تھیں۔

علم کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ یہ جتنا ایک طرف ہوتا ہے تقریباً اسی قدر مخالف سمت میں بھی موجود ہوتا ہے۔ جس قدر علم ایمان کا اس دنیا میں ہے اتنا ہی کفر کا ہے۔ جتنا اچالے کا ہے اسی قدر اندھیرے کا بھی ہے۔ جتنا سامنے کا ہے اتنا ہی پیچھے کا۔ جیسا جیسا ترقی کا ہے ویسا ہی روایت کا بھی ہے۔ اپنے اپنے من چلے کا سودا ہے۔ کھنا لینا ہے کھالے لو بیٹھا درکار ہے بیٹھالے لو۔ کوئی پابندی نہیں بچر نہیں۔ اگر نہیں۔

علم کی آمورش میں شروع ہی سے مقابلے اور محلوں کی بنیاد رائج کر دی جاتی ہے۔ آزاد چھوڑ کر رخ متعین کر دیا جاتا ہے۔ قلم اور تلواریں کے مقابلے میں چاہے قلم قبیلے میں شامل ہو جاو چاہے تلواریں طریق اختیار کر لو تمہاری مرضی ہے۔ ”دنیا کو ہے پھر معرکہ روح و بدن پیش“ اس مباحثے میں چاہے بدن کی سائیڈ اختیار کر لو چاہے روح کی ایک ساموئل مل جائے گا۔ ”یہ خاک اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ تاری ہے۔“ ”سرخ سویرا جھانک رہا ہے کھیتوں میں پہلی ہریالی“ ”سرخ سویرا خوف کا سایہ بچنے کی امید نہیں ہے“ ”سائنس کی

ترقی نے انسان کو باہم عروج پر پہنچادیا۔ "کسی طرف کے ہو جاؤ علم ہر طرف سے تمہاری مدد کرے گا" اور ہر قدم پر تمہارا ساتھ دے گا۔

ترادو کے قول تلے ہوئے علم کے باہر سقوط مشرقی پاکستان پر اخباروں میں بھڑے مفلوں میں الجھے "سیمناروں میں گرجے" مباحثوں میں گونجے اور سارا ملک ہنگامہ ویش منظور ہا منظور..... نا منظور اور منظور کے پردوں میں تقسیم ہو گیا جس شدت کی لڑائی مشرقی پاکستان میں ہوئی تھی کچھ ایسا ہی گھمسان کا بختیارن ادھر پڑ گیا۔ ابھی ہوئی ڈوری کا سہرا کسی کو بھی نہ ملا اور ہر پارٹی اپنی اپنی جگہ پر اس یقین محکم کے ساتھ اٹھی کہ مر اس نے ڈھونڈ لیا ہے۔ اور یہی اصل وجہ ہے۔ دوسرا چاہے مانے نہ مانے اصل حقیقت یہی ہے جو مجھ کو معلوم ہے اور جس پر میں قائم ہوں۔ میرا اپنی بات پر قائم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ میں سچا ہوں!

سن اکبر کی جنگ میں ریڈیو کا ایک یومیہ پروگرام میرے ذمے بھی تھا۔ اس میں مجاز جنگ پر موجود فوجیوں کی حوصلہ افزائی، شہری آبادی کی ہمت بندھائی اور دشمن کی پھپائی کی تفصیلات بہم کرنے کا کام پیش نظر تھا۔ کرفیو کے اوقات اور بلیک آؤٹ کی تاریک راتوں میں پروڈیوسروں، انجینئروں اور صدکاروں کا وقت پر پہنچ کر ٹھیک ٹھیک نشانے لگانا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ اپنے ملک اور اپنی ملت سے محبت کرنے والے یہ فریب، کم علم، بے آسہ اور گناہ لوگ اپنی جائیں، تھیلیوں پر رکھ کر ہر دم تیار اور ہر وقت مستعد رہتے، لیکن ان کی محبت، خلوص، نئی ہمت اور ہر طرح کی قربانی کے باوجود گاڑی پیچھے کو لڑھک رہی تھی اور اپنے ہی خاندان کے لوگ گاڑی کو ڈھلوان سے ڈھلتے دیکھ کر گھر والوں کی مدد کو آگے نہیں بڑھتے تھے۔ ان میں سے کچھ لوگ خوفزدہ تھے کہ آزاد خیال لوگوں کا گردہ ہمیں تنگ نظر سمجھے گا اور وطن پرستی کا طعنہ دے گا کہ ہم آفاقی اور عالمی قدروں سے بے بہرہ ہیں۔ کچھ لوگ بھارت کے پسندیدہ لوگ تھے اور وہ بھارت کی نظروں سے گرنا نہیں چاہتے تھے۔ بہت سے اہل نظر اسے مذہبی جنونیوں کا ایک جہا کن اور ہولناک ارادہ جان کر خاموش بیٹھے تھے۔ کچھ کو اندر کھاتے اس ڈراسے کی حقیقت معلوم تھی اور وہ بے وقوف پاکستانیوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ یہ لوگ اپنے اپنے مقام پر بڑی دانش اور پیش کے ساتھ آرام سے بیٹھے تھے اور ان کے مقامات بے وقوف پاکستانیوں سے بہت اونچے تھے۔ ریڈیو ماسکو بڑی جان سازی کے ساتھ اپنی ہر نرا شمع میں بھارت کا موقف اجاگر کر رہا تھا اور مغربی پاکستان کے مظالم کی تفصیلات بڑی محنت سے براڈ کاسٹ کر کے سارے پاکستان کو خوفزدہ کر رہا تھا۔ اس کا ہر تشریہ

اس بات پر ختم ہوتا تھا کہ پاکستان میں مختلف النوع قوتیں آباد ہیں جن کو آزاد ہونے کا اور آزادی سے زندگی بسر کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ پاکستان کی مصنوعی اکائی غریب کی کھوکھلی زیادہ پر اٹھائی گئی ہے جسے ہر حال میں ڈھنسا اور ٹکڑے ٹکڑے ہونا ہے۔ جب تک یہ ملک مختلف قوتوں میں تقسیم ہو کر آزاد سلطنتوں میں تبدیل نہیں ہو گا اس وقت تک جنوب مشرقی ایشیا میں امن و استقامت کی ضمانت نہیں دی جاسکتی۔

لے دے کے ساری بھری پری دنیا میں صرف امریکہ پاکستان کا واحد دوست اور سپورٹر تھا جس کو ہر گھڑی یہی خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ہندوستان کسی انہونی وجہ سے پاکستان سے شکست کھا کر ذلیل و خوار نہ ہو جائے۔ شکست نہ بھی ہو اور برابر کی چوٹ ہو جائے پھر بھی اتنے بڑے ملک کی بے عزتی ہو گی اس لیے ہندوستان کی عظمت، شہرت اس کی قدیم روایت اور سبھتا کو بچانے کے لیے پاکستان کو اس کی حد میں رکھنا ضروری ہے اور مولے کو اس کی مولیت یاد دلانا وقت کی اہم ضرورت ہے۔ پاکستان سے گہری دوستی کی بنا پر جب امریکہ نے ہندوستان کو ڈھاکہ فال کا سٹیکل دے دیا اور دوس کو بتا دیا کہ ساتویں بحری بیڑے کی پیش قدمی کی کہانی پاکستان کا دل رکھنے کو میان کی تھی تو دوس نے اپنے تشریے میں امریکہ کی دانشمندی کی داد دی اور بتایا کہ چونکہ مغربی پاکستان کو زندہ اور صحیح سلامت رکھنا ہمارے دشمن کی ضرورت ہے اس لیے اس ضرورت کا خیال رکھا جائے گا اور ان کی درخواست کا احترام کیا جائے گا۔

جب ہندوستانی فوجوں نے مشرقی پاکستان فتح کر لیا تو جنگ سے چوہین لائی کی آواز آئی کہ "مستور ڈھاکہ بھارت کے خاتمے کی شروعات ہے" ہمارے دانشوروں نے مجذوب کی اس بڑکاوڑھٹھا اڑایا۔ مجھے بھی اس عظیم تحنکر کے ایسے اعلان پر بڑا تعجب ہوا لیکن چوہین لائی اس وقت بوڑھا ہو رہا تھا اور بوڑھے لوگ کیسے بھی صاحب فکر کیوں نہ رہے ہوں عمر کے آخری حصے میں ایسی بونگیاں ضرور مار جاتے ہیں۔ بھلا ہندوستان جیسے مضبوط قلعے میں جہاں صرف ایک ہی قوم بسیتی ہو ایسی درازیں کیونکر پڑ سکتی تھیں!

اُبتری کی لکھنئیں ایک ساتھ ختم کی جارہی تھیں اور جمہوریت کا عمل لوگوں میں آسانیاں تقسیم کر رہا تھا۔ دولت کے قارونی نشے اور طاقت کے فرعونی خشکی کے پرانے آثار زمین بوس ہو رہے تھے۔ کچھ ٹپایا ہونے کی نوید تھی اور پرانا پرانا ختم کرنے پر زور دیا جا رہا تھا۔ جیسے لوگ عید کے روزے کپڑے پہن کر اور خوشبو لگا کر نکلتے ہیں کچھ ایسے ہی جمہوریت کا تہوار اکسٹارہا تھا لیکن لوگ کپڑے بدل کر نکلتے نہیں اخبار دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔

لیکن یہ اخبار کی خوشی بھی چند دنوں کے اندر ہرن ہو گئی۔ گرمی، سردی، بیمار، خزاں کی طرح ایک اور رت آئی۔ بے یقینی اور بے مرادی کی رت جو آہستہ آہستہ بد اعتمادی کے بڑے موسم میں تبدیل ہو گئی۔ پھر اس موسم نے سارے ملک پر چھاؤنی ڈال دی اور پختہ ارادہ کر کے بیٹھ گیا کہ اب اس علاقے میں کوئی دوسرا موسم نہیں آئے گا۔ بس ایک میں رہوں گا!

اصل میں بہت سے لوگ جمہوریت کا یہ مطلب سمجھتے تھے کہ اس کے آجانے پر ہر شخص کی عزت و حریت کے قصین کا اعلان ہو گا اور پاکستان کے سب لوگوں کے ایک رہنے اور ایک مرتبے کا حکم جاری ہو جائے گا۔ لوگوں کو ان کی تو قیرو ذات واپس لوٹا دی جائے گی اور ان کے اس شان و مقام کو پوری دنیا پر واضح کر دیا جائے گا جو پہلے تو بادشاہوں نے پامال کیا پھر کمپنی بہادر نے اپنی مشینی برتری کی ٹھوکروں سے ریزہ ریزہ کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مٹی میں ملا دیا۔

صبح جمہوریت کی آمد پر پاکستان کے سارے لوگ اس اعتماد کے ساتھ گھروں سے باہر نکل آئے تھے کہ اب گورے کو کالے پر اور کالے کو گورے پر کوئی ترجیح نہیں ہوگی۔ امیر غریب، پڑھے لکھے، ان پڑھ صاحب کفنی و کلاہ اور بے عرف و بے لوا برابر کے انسان سمجھے جائیں گے۔ اونچے نیچے ختم ہو جائے گی اور سارے ملک میں صدیوں کی رکی ہوئی عطر پڑ بہار جمہوریت آجائے گی۔

لیکن ایسا نہ ہوا۔ جمہوریت کے سرداروں اور جمہوری کارخانے کے صنعت کاروں نے آگے بڑھ کر بڑی شفقت کے ساتھ اعلان کیا کہ ہم تمہاری مشکلات کے حل کے لیے میدان میں آئے ہیں اور تمہاری برسوں کی ادبی ہوئی آرزوئیں پوری کرنے کے لیے اپنے سر ہتھیلیوں پر رکھ کر لائے ہیں کہ ہم تمہیں روٹی کپڑا اور مکان دیں گے۔ زمین اور رقبے دیں گے۔ لوگوں کی آنکھوں میں آنکھ ڈال کر بات کرنے کی ہیبت عطا کریں گے۔ لیکن ہم

مساوات اور برابری کا چلن عام نہیں کر سکیں گے کیونکہ ہم کو یہ امر مجبوری ایک طے شدہ اونچے مقام پر بیٹھ کر تمہاری عزت افزائی کے منصوبے تیار کرنے ہیں اور تمہارے درمیان خوشیاں اور آسودگیاں تقسیم کرنی ہیں۔

جب یہ سب کچھ طے پا گیا تو باہر نکلے ہوئے لوگوں میں سے ایک شخص نے آگے بڑھ کر کہا ہم تو جمہوریت کو ایک ایسا زندگی آموز عمل سمجھتے تھے جو گروہ انسانی کے کردار میں رفعت اور سر بلندی پیدا کر دے۔ ہر شخص کا احترام ہو۔ ہر ایک کی حکمران ہو۔ کسی کو دیوتا نہ سمجھا جائے۔ کسی کی پوجا نہ ہو۔ کوئی اونچے کھٹولے میں بیٹھ کر نیچے بیٹے انسانوں کو شاباش نہ دیتا جائے۔ مرجہا مرجہا نہ کہتا جائے۔ یہ جمہوریت تو نہیں یہ تو کچھ اور ہے۔ ہم تو بڑی امیدیں لے کر چلے تھے۔

جب جمہوریت کا معاملہ ایسا سیدھا ستواں آسان اور خوش آئند نکلا تو میں نے سیاست میں حصہ لینے کا پروگرام بنالیا۔ اس میں عزت بھی تھی، دولت بھی، آسودگی اور فراوانی بھی۔ خوش وقتی بھی اور خوش فکری بھی۔ سیاست کے دخیل ہتے بیٹے لوگ تھے۔ ہر وقت ہتے کھیلتے رہتے۔ سوچ میلے کرتے، جشن مناتے، اٹھیلیاں کرتے، زندگی گزارتے، آتے جاتے تالیاں بجاتے، نعرے لگواتے، ہاتھ چلاتے، وی کے نشان بناتے، دیوتاؤں سے مان نکل جاتے تھے اور لوگوں کو یقین دلا جاتے تھے کہ تالیاں بجانے اور نعرے لگانے سے ان کی عزت اور ٹھکانے میں اضافہ ہوا ہے اور وہ ذی وقار لوگوں میں شامل ہو گئے ہیں۔

جس طرح وکالت کے پیشے سے منسلک ہونے کے لیے سنے وکیل کو کسی پرانے اور کہنہ مشق وکیل کی شاگردی میں داخل ہونا پڑتا ہے اس طرح ہمارے یہاں ایک سیاست دان بننے کے لیے کسی بڑے سیاست دان کی جوتیاں سیدھی کرنی پڑتی ہیں اور ہر وقت اس کی معیت میں رہنا پڑتا ہے۔ میں نے بڑے سیاست دانوں کے قریب رہنے اور ان کی خوشامد کرنے کے لیے اپنے دفتری اوقات سے اچھا خاصہ وقت ادھار لے کر ان چلتے پھرتے اداروں پر صرف کرنا شروع کر دیا۔ بڑے اچھے نتائج برآمد ہوئے اور میرا درخشاں مستقبل خود بخود میرے قریب آنے لگا۔ وہ جو سیاست دانوں اور حکمرانوں کی ایک مخصوص رعایت ہوتی ہے وہ تو مجھ میں فوری طور پر پیدا ہو سکی، البتہ میرے اندر غمگینی کی کئی شمعیں ایک ساتھ روشن ہو گئیں۔

ایک دن صبح شیو کرتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ میرا چہرہ پہلے سے زیادہ خوبصورت ہو گیا ہے اور اس کے کھردرے پن میں ایک خاص طرح کی جاذبیت پیدا ہو گئی ہے۔ میں نے پیچھے ہٹ کر دیکھا تو مجھے یوں لگا جیسے میرے سارے وجود میں ایک عجیب طرح کا زرافہ پن پیدا ہو گیا ہے اور میری گردن اس قدر لمبی ہو گئی ہے کہ مجھے ہر شے نیچی نیچی نظر آنے لگی ہے اور میرا سراپا عین لفظ طعیران کی طرح پیچیدہ، کم، مستعمل، جھنجھٹ دار اور پھڑی سا ہو گیا تھا۔ مجھے اپنے اندر یہ تبدیلی دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی۔ میں ٹھیک ٹھیک راستے پر تھا۔

عوام کے ساتھ گہرا اور قریبی تعلق ہونے کی وجہ سے تقریباً سارے سیاستدان ضعیف الاعتقاد، پیر پرست، کوہی جو قش پسند، اعدا پرست، شگون گیر، فال مست اور قرعہ کش ضرور ہوتے ہیں۔ وہ ڈیڑوں، استخوانوں، تنکیوں پر بھی جاتے ہیں اور جو تھیلیاں، نجومیوں کو اپنے یہاں بلا کر بھی ان سے اپنی قسمت کی فال منگواتے ہیں۔

ان جو تھیلیوں، نجومیوں اور رہائیوں کی بھی ایک عجیب دنیا ہے۔ کچھ تو ان کا یہ پیشہ ہے اور کچھ ان کو اس کام کا بھی چسکا ہے۔ گاہک ہونہ ہو، دوا ہونا سودا جانتے جائیں گے اور رہنما بھرتے جائیں گے۔

انہی لوگوں میں سے ایک خوشی محمد عامل کامل بھی تھا جس کا اڈہ جون میکڈونلڈ سکول کے پہلو میں چٹروں پب کے پیچھے ایک سبے آباد سے گیران میں تھا۔ یہاں بہت سے چارٹ اور نقشے آویزاں تھے۔ کئی الماریوں میں کھوپڑیاں محفوظ شدہ نیولے، سانپ، گویاں اور سنگیں رکھی تھیں۔ فرش پر سجھور کی چٹائیاں بچھی تھیں۔ کونے میں رلی کا ایک خوبصورت جھول تھا جس پر خوشی محمد بیٹھا تھا اور سامنے اس کے منشیوں والی ایک صندوقچی تھی جس کا ڈھکنا آدھے

سے بھی کم اٹھا کر وہ اندر دیکھتا تھا اور غیب کی خبر جانتا تھا۔

اس زمانے کے نامی گرامی سیاستدان، منسٹر، پیروکر شیٹس اور کروڑ پتی اس کے یہاں حاضری دینے آتے تھے اور اپنی قسمت کا حال معلوم کر کے مشکلات کے پائے کا چنگالے کر جاتے تھے۔ میں بھی ایک سیاستدان کی معرفت (جو بعد میں وزیر صنعت بنے) خوشی محمد کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس کے کمال فن اور بول چال سے اس قدر متاثر ہوا کہ دل میں دھار لیا کہ اب آگے چل کر کچھ بننا ہے تو خوشی محمد ہی جتنا ہے اس سے کم نہیں۔

میں نے وقت بے وقت اس کی خدمت میں حاضریاں دینا شروع کر دیں اور اس کی خوشنودی کے لیے ہر طرح کے کام کرنے اور آلام اٹھانے کا تجربہ کر لیا۔ خوشی محمد بھی انسان شناس تھا۔ جلد بھانپ گیا کہ میں اس کے کام کی ایسی بوٹی ہوں جس کو خشک کے طور پر استعمال کر کے وہ بڑے سے بڑا شکر اچکا سکتا ہے۔ اور اس زمانے میں شکرے بہت تھے جو پکڑے جانے کے لیے پکڑ پکڑا رہے تھے۔

خوشی محمد کے ارادے کو اچھی طرح سے جانچ کر میں نے بھی اس پر یہ شرط عائد کر دی کہ جب تک وہ کشف کے اسرار و موز سے مجھے واقف نہیں کرے گا میں اس کے خطرناک پروگراموں میں اس کا ساتھ نہیں دوں گا! البتہ جھوٹی موٹی بدیوں اور کینکٹیوں میں اس کے پہلو بہ پہلو ضرور چلوں گا۔ خوشی محمد کو اس بھاد پر یہ شرط منظور تھی کیونکہ وہ میری اندرونی فطرت سے کافی حد تک متاثر ہو چکا تھا اور مجھے پسند کرنے لگا تھا۔

جب اس نے مجھے اپنے فن کی کچھ ابتدائی باتیں بتائیں اور کتاب طلسم کے اولین صفحات سے روشناس کرایا تو میرا دل ماننے سے منکر ہو گیا۔ ایسے جوڑ توڑ تو میں نے تیسری چوتھی جماعت میں بہت کیے تھے جب ہمارے محلے کا درزی عنایت اللہ ہمارے علاقے کی عمری بھرائین کی لڑکی پر عاشق ہو گیا تھا اور اس کو قابو کرنے کے لیے مجھ سے ٹونا کر دانے آتا تھا۔

عنایت اللہ درزی ہر جمعرات میرے پاس مرغی کا ایک براؤن انڈر لانا اور اس پر مجھ سے میرے ہی قلم سے اور میری ہی صوف والی سیاہی سے لکھواتا تھا "بچہ، ہوز، حلی" کلین سفوس اور پھر اس کے بعد دو نقطے اوپر نیچے ڈال کر اس کے آگے لکھا جاتا "عنایت اللہ درزی خاشدہ پہلو بند در محبت چچاں محبوبہ شوش و شک بنت عمری بھرائین و دولو بھرائی" میں جب اس سے کہتا کہ آگے انڈر ختم ہو گیا ہے عنایت بھائی "تو دو مایوس ہو کر چپ ہو جاتا

ورنہ اس کے پاس موند بانی یاد کیے منتر کے ابھی دو چار جملے اور باقی ہوتے۔

اس اٹنے کو محبوبہ کے قدموں میں توڑا جانا ضروری تھا۔ چنانچہ جب بیچیاں کئی کے نکلے سے پانی کا گھڑا بھر کر لاری ہی ہوتی اور اس کے دونوں ہاتھ گھڑے پر ہوتے تو عنایت اللہ "تھا" کر کے میرا لکھا ہوا لفظ اس کے قدموں میں پھوڑ کر وہاں سے رن پکڑا ہوا جاتا۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے بیچیاں کو اس بات کا علم تو تھا کہ یہ لفظ پھوڑی کس مقصد کے لیے کی جاتی ہے لیکن وہ اس کی پروا نہ کرتی تھی اور اسی طرح سے گھڑا اٹھائے اٹھلاتی ہوئی گھر پہنچ جاتی تھی۔

جب خوشی محمد کے ساتھ میری کوئی پندرہ بیس نشستیں ہو چکیں تو میں اس سے کچھ مایوس ہو گیا کہ اس کے پاس وہ گوہر مقصود نہیں تھا جس کی تلاش میں میں اس کے پاس پہنچا تھا۔ اس کے پاس کچھ چھوٹے چھوٹے کمالات اور ذرا ذرا سی پیش بینیاں تھیں جن کے زور پر دور وحایت کا پیساری بنا ہوا تھا۔

میں نے کہا میں تو اس بحر طلسمات میں گہرا غوطہ لگنا چاہتا ہوں اور روحانیت کے پانچل میں اتر کر ان بو قلمونیوں کا مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں جن کے اسرار و انروں کی صورت میں اس آب پر آتے ہیں لیکن اندر کے بھید نہیں کھلتے۔ کہنے لگا "میں آپ کو اپنے گرو سے ملا دوں گا" لیکن اس کے لیے مجھے ان کی اجازت لینا ہو گی۔ "میں نے کہا "آپ کے گرو یہیں ہیں اسی شہر میں؟"

کہنے لگا "اب یہ ان کی مرضی ہے کہ وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہیں یا مجھے جھڑک دیں لیکن میں کوشش ضرور کروں گا۔ آگے آپ کی قسمت کوئی وعدہ نہیں کرتا۔" میں نے کہا "کون ہیں آپ کے گرو؟"

تو اس نے ڈھیلا سامنہ چھوڑ کر "سینہ پر ہاتھ رکھ کے پولی سی آواز میں کہا "شیطان؟" میرے اور اس کے درمیان ایک طویل وقفے کا تناؤ تھ گیا۔ "شیطان؟" میں نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا "ابلیس؟"

اس نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اذہب سے سر جھکایا اور منہ کی آواز میں بولا "استلوا کل کو آپ جس نام سے بھی پکارتے ہیں ان کا مقام وہی ہے بلند ہے گا جیسے کہ طے کر دیا گیا ہے۔"

وقت مقررہ پر جب میں خوشی محمد کے ڈیرے پر پہنچا تو میری حالت غیر تھی۔ وہ جو کہتے ہیں کانٹو لہو نہیں بدن میں کچھ ویسی کیفیت میری تھی۔ لیکن شوق اور تجسس کا یہ حال تھا کہ اگلے پھر آنے پر طبیعت مائل نہ تھی۔ میں ایک چورے کی طرح خوشی محمد کے سامنے

کھڑا تھا اور اپنے بوٹوں کے اندر دونوں انگوٹھے پتاووں پر رگڑ رہا تھا۔ گنجائش تو نہ تھی لیکن میرا خیال ہے انگوٹھے حرکت کر رہے تھے۔

خوشی محمد نے کہا "گرو جی آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔" اس نے اپنے کندھے کے پیچھے اس کمرے کی طرف اشارہ کیا جسے میں آج تک ایک بند گودام سمجھتا رہا تھا۔

اور میں غلط نہیں سمجھتا رہا تھا۔ وہ واقعی ایک گودام تھا اور اس کے اندر پرانے تختے، ٹونا پھوٹا، فرنیچر، بنگے، میز، ٹرک اور گودام پھونس کے ڈبیر تھے۔ ایک جھلنگ سی چارپائی پر شیطان بیٹھے تھے اور ان کے دونوں پاؤں فرش پر تھے۔ دبلے پتلے اور لاغر قسم کے "بزرگ" تھے۔ ٹھوڑی پر چھوٹی سی مسکندہ خیر ڈالھی تھی۔ سر دکا تھا اور ایک کپے ہوئے بڑے سے کھیرے سے ملا جلتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اندر بھی کپے کپے بیج ہوں گے جن کا خول مضبوط اور ذائقہ یکساں ہو گا۔ آنکھیں گول اور چھوٹی چھوٹی تھیں۔ ایک ڈھیلی سی پرانی کھسی پٹی کپڑوں والی شیر وانی پہنے تھے جس کی ٹیکریں اب تقریباً بالکل معدوم ہو چکی تھیں۔ ہونٹ موٹے اور کان بڑے تھے۔ چہرے پر ملاحت، شرافت اور شفقت نمایاں تھی۔ آواز میں ٹھہراؤ اور لہجے میں بزرگی کا انداز تھا۔ پائنتی کی طرف اشارہ کر کے بولے "بیٹھو بر خور وار تشریف رکھو۔"

میں نے کہا "ٹھیک ہے جی اگر آپ اجازت دیں تو میں اسی طرح سے ٹھیک ہوں۔" فرمانے لگے "کیا چاہتے ہو؟"

میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کی کہ میں کائنات کے بھید جاننا چاہتا ہوں اور اپنے اندر کشف کی کیفیت پیدا کرنے کا خواہشمند ہوں جو دھاما گلوں وہ پوری ہو جو آرزو کروں اس کی تکمیل ہو۔"

میری بات سن کر ذرا سا مسکرائے اور پھر گہرے فکر کے انداز میں میری طرف دیکھنے لگے۔ میں پامردی کے ساتھ اپنے مقام پر ڈنار ہالور ان کی طرف غور سے دیکھتا رہا۔ ان کی شکل ان کا وجود اور ان کا انداز نشست اس آدمی سے ملتا تھا جو ایک زمانے میں لاہور کی مال روڈ پر ٹوٹن مار کیٹ سے پیشل سکول آف آرٹس تک چکر لگایا کرتا تھا اور لاہور میوزیم کے سامنے رک کر پیٹھ سڑک کی جانب کر کے اور منہ عجب گھر کی طرف اٹھا کر چاروے کے مختلف اوزار کو گالیاں دیا کرتا تھا اور چٹری پر جھک کے خیالی پھر اٹھا اٹھا کر میوزیم کی طرف مارا کرتا تھا۔ وہ تھا تو بڑا تنک مزاج تو کھی اور مستحق مجذوب لیکن اپنے بھرے بڑے جذب کے

عالم میں عورتوں اور بچوں کو بڑی پر آتا دیکھ کر سر جھکا کر ایک طرف ہو چلا کرتا تھا۔
خوشی غم ہاتھ باندھے کسی کام سے اندر آیا تو انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے
واپس بھیج دیا، پھر میری طرف مخاطب ہو کر بولے "اس آرزو کی تکمیل کے لیے آپ نے
اب تک کیا کیا کوشش کی اور کس کس مرحلے سے گزرے؟"

میں نے کہا "جناب! میری کوشش ابتدائی قسم کی تھیں، چھوٹے چھوٹے چلے بارہ
تشیخاں پاس انکس نوکراسم ذات وغیرہ....."

کہنے لگے "کچھ خاص فائدہ ہوا؟ نہیں ہوا ہو گا۔ عام طور پر اس طریق میں بڑی دیر لگتی
ہے۔ کبھی کبھی تو ساری عمر ہی لگ جاتی ہے اور گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا لیکن ہمارا طریق
اس سے مختلف ہے اس میں نہ دیر ہے نہ اندھیر۔ ٹھیک سے معاملہ طے ہو جاتا ہے اور سالک
سالموں کی منزلیں ایک ایک دن میں طے کر جاتا ہے۔"

مجھے حضرت اٹلیس کی یہ بات سن کر حیرت بھی ہوئی اور خوشی بھی۔ اگر تو ان کی بات
اپنا لینے میں یہ سب کچھ ہو جاتا ہے تو کیسی خوش آئند بات ہے اور اگر یہ بات غلط ہے تو اس
میں کوئی خاص وقت ضائع نہیں ہوتا اور سب کچھ جلد ہی وقت ہی وقت سے۔ میں نے کہا
"اچھا فرمائیے کہ آپ کے طریق کی ابتدا کیسے کی جاسکتی ہے اور اس کی کیا شرائط ہیں؟"

کہنے لگے "ہمارے مسلک کے مطابق روحانی اور جات کی بلندیوں تک پہنچنے میں آپ کو
زیادہ سے زیادہ ایک ہفتہ لگے گا۔ اگر آپ غبی اور تسائل پسند ہیں تو دس دن لگ جائیں گے اس
سے زیادہ نہیں۔"

میں نے کہا "مگر اس سے وصول کیا ہو گا۔"

فرمانے لگے "اس سے ایک تو آپ کی ہر خواہش پوری ہونے لگے گی۔ دوسرے کشف
کی راہیں کھل جائیں گی۔ تیسرے لوگ آپ کے گرویدہ ہو جائیں گے اور آپ کی ذات
مقبول عام اور مقبول عوام ہو جائے گی۔ چہ نہ پرندہ آپ کے تابع ہو کر آپ سے خوف کھانے
لگیں گے اور ہر اعتبار سے آپ کے مطیع ہو جائیں گے۔ بس یہ سمجھ لیجئے آپ کی کلا جگ
جائے گی اور چاروں کھونٹ سے آپ کی طلب کا نالہ بجنے لگے گا۔"

"اور مدت زیادہ سے زیادہ دس چار دن؟"

بولے "ایک ہفتہ! سنچر کو شروع کر کے سنچر پر آجائیں گے اور آپ کے سارے
راستے کھل جائیں گے۔"

میں نے کہا "آپ کا وظیفہ کچھ مشکل اور پیچیدہ ہے؟"
کہنے لگے "بالکل بھی نہیں۔ ایک بچہ بھی آسانی سے کر سکتا ہے اور اس میں طبیعت پر
کوئی بوجھ بھی نہیں پڑتا۔"

میں نے کہا "سنچر میں تو ابھی تین دن پڑے ہیں جب تک میں کیا کروں؟"
کہنے لگے "تیاری اور تیاری کے لیے ایک مخصوص روپے کی دھن..... جب تک آپ
کے موجودہ چلن میں تبدیلی پیدا نہیں ہوگی آپ کا راستہ سیدھا نہیں ہوگا۔ یہ زندگی جو آپ
بسر کر رہے ہیں یا جواب تک بسر کرتے چلے آئے ہیں اس میں تین سو ساٹھ ڈگری کی پلٹ کا
پیدا ہونا بہت ضروری ہے۔ اگر وہ نہیں ہو سکا تو آپ کی سمدھی نہیں ہوگی اور آپ راستے
سے ہٹک جائیں گے۔"

میں نے دیکھا وہ بات کرتے ہوئے بار بار اپنی ناک کو کھجاتے تھے اور تھوڑی تھوڑی دیر
بعد ناک کی پھٹنگ پر اس چھوٹی سی گومڑی کو دیکھتے تھے۔ اس طرح دیکھنے سے ان کی دونوں
آنکھیں بھیٹکی ہو جاتی تھیں اور ڈھیلے ناک کی جڑ سے پیوست ہو جاتے تھے۔

کہنے لگے "سنچر آنے تک آپ کو اپنا آپ تیار کرنا پڑے گا جس طرح اچھی فصل کے
لیے زمین کو تیار کرنا پڑتا ہے اس میں اعلیٰ درجے کی کھاد ملا کر اسے اٹھل پٹھل کرنا پڑتا ہے۔
اسی طرح جسم سے روح کی فصل تیار کرنے کے لیے جسم کو اعلیٰ درجے کی کھاد سے ہمکنار کرنا
پڑتا ہے۔ کل سے آپ کو طہارت کی ذرل کا خاتمہ کرنا ہو گا۔"

مجھے ان کی یہ بات سمجھ نہ آئی اور میں نے حیرانی سے ان کی طرف دیکھا تو انہوں نے کہا
"کل سے آپ اپنی بدنی صفائی بالکل بند کر دیں گے۔ حوائج ضروریہ کے بعد آبدست نہیں
کریں گے۔ نہانے کے قریب نہیں جائیں گے۔ موقع موقع پر اپنے ریت اور تھوک کو
اپنے ہاتھوں اور بازوؤں پر ملتے رہیں گے۔ دن میں ایک دو مرتبہ اپنے زیریں بدن کو پیشاب
اور براہ منویہ سے لٹھڑے رہیں گے۔"

میں سڑھی پر بیٹھے اس کو ترکی طرح انہیں دیکھ رہا تھا جس کے گلے میں ری بندھی ہو
اور جس کی گرہ آہستہ آہستہ تنگ کی جا رہی ہو۔

انہوں نے فرمایا "پہلے پہلے ذرا سی تکلیف ہوگی۔ تھوڑی سی الجھن ہوگی لیکن تیسرے
روز جب بدن سے بھبار آنے لگے گی تو آپ کی طبیعت لگ جائے گی اور ذوال کی کامیاب
پردہ شروع ہو جائے گی۔"

”زدال کی پرواز۔“ میں نے چیخ کر کہا تو انہوں نے فرمایا ”عروج اور زوال دراصل ایک ہی چیز کے دو نام ہیں۔ نارتھ پول اور ساؤتھ پول ایک سے ہیں اور حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ جو جہاز زمین کے گرد جنوب کی طرح چلتا ہے وہ دراصل شمال کی جانب ہی مائل پرواز ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”معاف کیجئے میں تو کسی اور شے کی تلاش میں یہاں آیا تھا لیکن خوشی مجھ نے مجھے بددینی پر مجبور کر دیا۔۔۔ خدا ہم دونوں کو معاف کرے۔“

حضرت شیطان نے بڑی لطیف مسکراہٹ کے بعد فرمایا ”یہ تو ابتدائی بدنی پابندی ہے اس لیے اس پر عمل ضروری ہے۔ جب تک آپ کا بدن سیدھی ریل پر نہیں ہوگا“ آپ کی جان کا بوجھ ہلکا نہیں ہو سکے گا۔“

”یہ جان کا بوجھ ہلکا کرنے کی ترکیب ہے؟“ میں نے پوچھا۔

کہنے لگے ”میں اپنے اپنے اصول میں اور ہم اصولوں پر کوئی سمجھوتہ نہیں کر سکتے۔“

میں نے پوچھا ”اور اس کے بعد؟“

کہنے لگے ”ایک ہفتے کا لگا ہوا درد ہوگا اور دنیا کے راستے آپ سے آپ روشن ہوتے جائیں گے۔“

میں نے کہا ”وہ درد اس وقت طے لگایا ہوگا کہ پیداکرنے کے بعد بتایا جائے گا۔“

کہنے لگے ”ہمارے یہاں بیروں کی طرح غیر ضروری پابندیاں نہیں ہیں۔ طالب خدای اور بیٹلا ہونا چاہیے نام اسی وقت دامن کر دیا جاتا ہے۔“

میں نے کہا ”مجھے کس شے کا درد کرنا ہوگا؟ کوئی مشکل پاڑھت تو نہیں؟“

بولے ”سیدھی سی آسان سی پاڑھت ہے تم اس سے مانوس بھی ہو۔ کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔“

میں نے کہا ”یعنی؟“

بولے ”آپ کو الحمد شریف کا درد کرنا ہوگا۔“

”الحمد شریف؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

کہنے لگے ”ہاں۔۔۔ کیا مطلب؟“

فرمانے لگے ”تم کو اپنی الحمد شریف پڑھنا ہوگی“ سنیچر سے سنیچر تک اور پھر آپ ہمارے ہمیش کے ایک بہادر سپاہی بن جائیں گے۔ اس کے بعد آپ کا نشانہ کبھی خطا نہیں

جائے گا۔“

میں نے کہا ”الحمد شریف پڑھنے کے لیے مجھے آمین سے شروع کرنا ہوگا؟ یعنی پہلے آمین پھر ولد آمین پھر عظیم۔۔۔“

بات کاٹ کر بولے ”اس طرح سے الٹ نہیں معنی کے اعتبار سے الٹ۔ میرے ساتھ ساتھ پڑھئے۔“

”لا بسم اللہ۔۔۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ۔۔۔ لا ارجو۔۔۔ لا ارجو۔۔۔ لا ارجو۔۔۔“

”نعوذ باللہ۔۔۔ نعوذ باللہ۔۔۔ نعوذ باللہ۔۔۔ میری زبان کو تالا لگ گیا اور میرا بدن تھر تھر کاہنے لگا۔ وہ فنی کے انداز میں سورۃ پڑھتا گیا اور لہراتا گیا۔ میں خوف کے مارے ”اسے روک بھی نہ سکا اس کی شیطنت کا ہالا بڑا گہرا بہت مضبوط اور بے حد دہیز تھا۔ میں نے دل ہی دل میں لا حول ولا قوۃ الا باللہ تیزی کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا تو دورک کر بولا ”یہ جو تم اندر ہی اندر کچھ پڑھ رہے ہو اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں ہو تا۔۔۔ وہ لوگ جنہوں نے خواہش کو اپنا معبود بنایا ہو اسے جب دو کچھ پڑھتے ہیں تو اس کا کوئی اثر کسی پر بھی نہیں ہو تا۔ تم بھی انہی لوگوں میں سے ہو اس لیے اپنی کوشش ضائع نہ کرو۔“

میں پھر کایت بن کر اٹھیں کے سامنے گم گما گیا اور مجھ میں ہلنے کی سکت باقی نہ رہی۔ بلتا تو ایک طرف مجھ سے سانس لینا بھی مشکل ہو گیا۔ اس کی دونوں آنکھیں ناک کے بانسہ سے آٹکیں اور اس نے ہاتھ جھٹک کر ایک دو سو ہی گندی گالی دے کر کہا ”جادف ہو جا مگر دے دے تجھے خباثت کی نعت کبھی نہ ملے اور تو نیکی کے پیچھے ہاتھ ملتا ملتا حوسکی کی لکیر بن کر معدوم ہو جائے۔ جا؟ دفع ہو جا۔۔۔ تیری ماں تجھے روئے اور تیری بہنیں تیرا سیپا کرتی پھریں۔“

دو بڑے جلال میں تھے اور دائیں بائیں تھوک رہے تھے۔ پھر وہ بھڑک کر اٹھے اور چلا کر بولے ”بند کر“ ”بند کر“ یہ پڑھنا بند کر نہیں تو میں تجھے کما کے پتے کی طرح چیر کر دو کر دوں گا۔“

ان کو قلعہ نہیں ہوئی تھی۔ پڑھنا پڑھنا تو ایک طرف میرا تو دم بھی مقام واپس پر پہنچ کر اٹک گیا تھا۔

خوشی محمد نے گھبرا کر پردے کا ایک کونہ اٹھایا تو مجھے اندر آنے والی روشنی سے بھاگنے کا اذن ملا۔ کسی نے میرے دونوں کندھوں کو مضبوطی سے پکڑ کر مجھے گھمایا اور باہر کی روشنی کا

ایک کوندا میری طرف جھپٹا کچھ اسی کوندے کی لہک اور کچھ کندھوں پر مضبوط ہاتھوں کی گرفت کا دھکا میں رہت کر سڑک پر آگیا۔

پھر جو میں پاگوں کی طرح یونورسٹی گراؤنڈ کی طرف بھاگا تو کئی سوڑوں کی بریکیں چٹیں اور کئی بھاگتے گھوڑوں کی راسیں کھنچیں مگر میں ان جھپٹوں سے زندہ سلامت نکل ہی گیا۔

یونورسٹی گراؤنڈ کی دیوار سے لگ کر میں نے سانس ہموار کرنے کی کوشش کی تو میرے اندر سے غول گم گھٹ کر کے بدبو کا ایک بلبلانکا جیسے بند گھڑ کے اندر سے بدبو کا ایک صوتی بھکا اٹھا کر تاپے اور گھڑ کے اندر چلنے والا دھیرا دھیرا پانی ایک طرف ہو کر بلبلے کو روا دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ بدبو مردہ کتوں کی لاشوں، گدھوں کے خون اور چربی سے لہترے ٹپوں، غرقے کے اندر سیاہ فضلے کی گھائی، بے طہارت بوڑھے کے جہر، فوڈ پوائزن والی لڑکی کی قے، بال صفا پاؤڈر کی ہلک اور کوہستانی بچے کے بپ کا استخراج تھی۔ میں جوں جوں اس سے دور بھاگتا تھا یہ میرے جسم کے ہر دگ و ریشہ سے آواز دے کر نکل رہی تھی جیسے سرتانگے کے کسی گھوڑے کے بدن سے ٹاپ کے ساتھ ساتھ جسم کا ہنگامہ بھی نکلا کرتا ہے۔

میں نے ابھی اپنی بد بطنی کا اعلان بھی نہیں کیا تھا صرف اشارت کی تھی اور اس کے بدلے میں مجھ پر یہ لعنت مسلط ہو گئی تھی۔ اگر میں اقرار کر لیتا یا ارادہ باندھ لیتا یا اس طرف کا رخ کر لیتا تو پھر یہ نہیں مجھ پر کیا گزرتی تھی۔ تین دن اور تین راتیں مجھ پر قیامت بن کر گزریں اور میں گھر والوں سے بہت برے رہ کر وقت کو دھکے مارتا رہا۔ اس غرے میں مجھے جو کچھ بھی آتا تھا میں نے پڑھا جو درد مشکل نظر آتا تھا کیا۔ لائی سول ڈال کر دن میں تین تین مرتبہ غسل کیا لیکن بدن سے برآمد ہونے والی بدبو کم نہ ہوئی۔ جلد بھی جگہ جگہ سے کھرستی گئی اور چٹیاں پڑ گئیں۔ ہڈیوں کی تکی ہوئی کمانیاں بھی ڈھیلی پڑ گئیں اور جسم میں جگہ جگہ چب پڑ گئے۔

انسان بلا ارادہ، بے پتا، بے اختیار اور بے عمل شیطان کی بیرونی کرے اور اسے اپنی جبلت کی وجہ سے سمجھتا ہے تو اس کا کوئی خاص نقصان نہیں ہوتا لیکن اگر وہ بے اختیار و بلا ارادہ وائرہ شیطان میں داخل ہونے کا پروگرام بنائے اور اس کو ایک شفیق فعل نہ سمجھے تو پھر اس کے واپس آنے کا کوئی امکان نہیں رہتا۔ اس کے تہیہ کو پختہ کرنے کے لیے شیطان کے علاوہ اور دوسری مثبت طاقتیں بھی اس کی مدد کرتی ہیں اور اس کی ذرا سی آرزو کو وسعت عطا کر کے

اسے شیطانی پیکل میں دھکیل دیتی ہیں۔ چلتی ہوئی تیز ہوائیں، سمندروں کی لہریں، کشش ثقل کی مسلسل کھینچ، موسموں کے تغیر و تبدل، چاند کا جذب، سورج کی تپش یہ سب اس کے ارادے کو تقویت عطا کر کے اسے تباہ و برباد کر دیتی ہیں۔ اس کی طرف رخ ہی نہیں کرنا چاہیے۔ رخ تو ایک طرف ایسا خیال بھی دل میں نہیں لانا چاہیے۔ بس اسے ایک خوفناک اور خونخوار دیوانہ سمجھ کر اس کے قریب سے آنکھ بچا کر گزر جانا چاہیے۔ اس طرف نگاہ اٹھا کر دیکھنا نہیں چاہیے۔

شیطان تو زندگی میں اکثر ملتا رہا ہے۔ ملتا رہتا ہے۔ ملتا رہے گا۔ ہمارے اور اس کے راستے ایک دوسرے کو کراس کرتے ہیں لیکن عافیت اسی میں ہے کہ ان راستوں پر سر میوڑ کر کندھے جھکا کر، سانس روک کر اپنی چال چلتے ہوئے گزر جائے۔ نہ جلدی کرے، نہ رے، نہ ان کو پتہ چلے دے کہ کوئی ڈرائڈ راسا گزر رہا ہے۔ بس ایک مرتبہ ان کے محاذ سے نکل گیا تو اگلی ٹکڑ خود گھوم کر قریب آجائے گی اور گلی آپ سے آپ مڑ جائے گی۔

میں شیطان کے لیے ہمیشہ جمع کا صیغہ استعمال کرتا ہوں۔ بہت بڑی طاقت ہے۔ بڑے بڑوں کا لوہا ان کے آگے پانی ہو گیا۔ ہم کس بارغ کی سولی ہیں۔ جب بھی گزرو، ادب سے گزرو۔ بھاگنے کی کوشش نہ کرو ورنہ پکڑے جاؤ گے۔ جب تک زندہ ہیں ان سے ملاقات تو ہوتی رہے گی۔ ان کا کام ہی لوگوں کو اغوا کرنا ہے۔ دوسرے تو تاوان لے کر چھوڑ بھی دیتے ہیں، یہ گھر آئے ہوئے کو جانے نہیں دیتے پکڑے ہوئے کو چھوڑتے نہیں۔ اپنی محبت میں جتا کر کے گھر و ملاسا بنا لیتے ہیں۔

میں جنس ضرور تھا لیکن بد نیت نہیں تھا۔ مجھے جنس نے مارا اور اپنی ذات میں ذلیل کر کے چھوڑ آیا۔

ایک ہفتہ کے بعد مجھ سے بدبو آتا تو بند ہو گئی، البتہ میرے وجود میں ایک نمایاں تبدیلی پیدا ہو گئی کہ میں خود کو ایک لال بیگ سمجھنے لگا۔ سمجھنے کیا لگا میرے اندر ایک کاروبار کی صفات پیدا ہو گئیں۔ ویسے ہی چلتا اسی طرح سے رکنا، کسی کو کچھ کر دیکھ جانا، کوئی نظر بھر کے دیکھ لے تو وہاں سے بھاگ کر کسی کو نے میں چھپ جانا۔ میں بظاہر تو ایک انسان تھا لیکن میرے اندر ایک بینڈ بول رہا تھا جس کی آواز صرف مجھے سنائی دیتی تھی۔ مجھے پتہ تھا کہ میرے اندر کا خون سفید ہو چکا ہے۔ شیو کرتے ہوئے مجھے ایک مرتبہ تک لگا تھا تو میں نے فوراً پیچھے مڑ کر دیکھا تھا کہ کسی اور نے تو آئینے میں میرے خون کی رنگت نہیں دیکھی، جس

طرح ایک کاروبار سیدھا چلتا ہوا بھی پہلوؤں کی طرف جاننا دکھائی دیتا ہے کچھ ایسی ہی تبدیلی میری جال میں بھی پیدا ہو گئی تھی۔

میرے سنگی ساتھیوں اور میرے گھر والوں کو تو اس تبدیلی کا علم نہ ہوا لیکن میری ماں میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر بار بار پوچھتی رہی "کاکا تیرا بی تو ٹھیک ہے؟"

میں ماں کو گھور کر دیکھتا تھا اور کوئی جواب نہیں دیتا تھا۔ مجھے وہ ایسا سوال کرتی ہوئی بہت بری لگتی تھی کیونکہ مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں مر جاؤں گا اور سر کر کسی غلط مقام پر پہنچ جاؤں گا۔

اور پھر ایسے ہی ہوا۔ ایک شام لارنس بارش کے باہر میاں بھر کی کونٹھی کے سامنے ایک تیز رفتار کار نے مجھے ٹکرایا اور مجھے سڑک پر تھپتا چھوڑ کر ہٹا گئی۔ لوگوں نے اٹھا کر مجھے گن کار ام ہسپتال کے ایمر جنسی وارڈ میں پہنچایا اور خود چلے گئے۔

پورے چوبیس گھنٹے موت و حیات کی کشمکش کے بعد مجھ سے میرے استاد بھائی ہالی ملنے کے لیے آئے۔ وہ میرے بستر کے سامنے کرسی پر بیٹھے مسکرا رہے تھے "لیکن میں یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ موت و حیات کی کشمکش کے بعد وہ موت کے اندر تشریف لائے ہیں یا حیات نو پا پکھنے کے بعد آئے ہیں۔ انہوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر 'سربلاتے ہوئے پوچھا' ٹھیک ہو؟" میں نے اسی طرح لپٹے لپٹے ہاتھ کھاکر کہا "پتہ نہیں ٹھیک ہی ہوں۔"

انہوں نے کہا "خیر ہو گئی شفا کی وقت مل گیا۔"

میں نے پوچھ "میں سچ گیا؟"

بڑے "دونوں طرح سے کیوں بھی اور وہی بھی۔"

مجھے ان کی بات ٹھیک سے سمجھ نہ آئی کیونکہ جب کوئی پختا ہے تو یوں ہی پختا ہے 'دونوں' کس طرح سے پچا کرتا ہے۔"

جب ڈاکٹر اندر داخل ہوا تو استاد محرم کرسی سے اٹھ گئے اور ان کی جگہ ڈاکٹر وہاں بیٹھ گیا۔

ڈاکٹر نے ابھیرے ہوئے دیکھتے ہوئے کہا "شکر ہے سر پر ایسا کوئی چوٹ نہیں آئی جس سے کسی مستقل نقصان کا اندیشہ نہ ہو تا۔ یہ بس اوپری چوٹیں ہیں۔ ان کا کوئی اندیشہ نہیں۔ خود ہی ٹھیک ہو جائیں گی۔"

اس حالے کا یہ فائدہ ہوا کہ میرا کاروبار مر گیا اور ساری خوشی خود بخود دور ہو گئی ا

پاکستان کی گاڑی ایک مرتبہ پھر بڑی تیزی کے ساتھ اپنی منزل کی طرف رواں ہو گئی تھی اور طے شدہ مقامات پر گھڑت آوازیں نکالتی کانٹے پر کانٹا بدلتی جا رہی تھی۔ ملک اوپر نیچے دائیں بائیں آگے پیچھے بڑی سرعت کے ساتھ ترقی کر رہا تھا اور پہلے کے مقابلے میں ہر طرح سے پچھل کر وسعت پذیر ہو رہا تھا۔ لوگوں نے باہر جاننا شروع کر دیا تھا۔ باہر کی دولت اندر آ رہی تھی۔ نئی نئی کرنسیاں 'بھاری بھر کم بینک ڈرافٹ' غیر سرکاری مگر معیاری ہنڈیاں اشغال زر کے نئے نئے طریقے کچھ نیا نیا اور ساہوکار تھا۔

پرانے طریقے معدوم ہو رہے تھے اور وہ فن جو ہم نے بڑے جو کھوں سے سیکھا تھا کہ ایک مکان یہاں کھلو کر الاٹ کرالو 'دوسرا کسی قریبی شہر میں' تیسرا کسی اور ضلع میں اور زمینوں کے نمبر ڈالو 'وہ زراعت نہ بھی کی ہو تو اب کر لو' اب بھی دل نہ کرے تو زمین الاٹ کر کے ٹھیکے پر دے دو۔ کرایہ جمع کر کے قرضہ دے دو۔ چھوٹے موٹے ساہوکارے سے نئی زندگی کی ابتدا کر لو۔ مسجد کی تعمیر کے لیے چند دے دو۔ مدرسے کے لیے زکوٰۃ نکال دو۔

بس اس قسم کی چھوٹی چھوٹی بھوت پھسریاں تھیں جو ہم نے بڑی سخت سے ایک دوسرے سے سیکھ کر اپنی زندگیوں بنالی تھیں اور اپنے اعمال ضائع کر دیئے تھے۔ اور اب لوگوں نے ان ضائع شدہ اعمال کے نقص کی راکھ سے نئے انداز کے بے شمار نقص بچے پیدا کر لیے تھے جو اعمال کے بچے کچے مل کھاتے کرموں کو اپنی چونچوں میں دبا کر بھاگتے تھے اور ایک دوسرے سے اس کا کرم چھیننے کی کوشش میں مصروف رہتے تھے۔

ترقی کی منازل تیزی سے طے کرنے کا یہ بڑا ہی سہانا دور تھا اور اس کی پیروی میں خوشی حمد کے ڈیرے پر گیا تھا لیکن اپنی کم سواد ہی بے عقلی اور بزدلی کی مار کھا کر واپس آ گیا تھا اور اب چٹلون کی دونوں جیبوں میں ہاتھ ڈال کر بے مصرف گھوم رہا تھا۔

جب سیاست کے وسیع سمندر میں داخل ہو کر بحری قزاق کی طرح ایک آنکھ پر اندھیری لٹکا کے لوگوں کو لوٹنے کی خواہش پوری نہ ہوئی تو میں نے ملک التجار بننے کا پروگرام بنایا اور دفتر سے چھٹی لے کر کراچی پہنچ گیا۔ تجارت کے سارے راستے نئی ہوئی تھیلی کی طرح کھلے تھے اور کویت، دبئی، قطر، شارجہ، مسعودی، عرب، لیبیا کی منڈیاں نیلی ڈانسر کی طرح آنکھیں مار کر قریب بلارہی تھیں جو کوئی ان کے قریب جا کر گلے میں بانہیں ڈال دیتا تھا اسے مال مال کر دیتی تھیں۔

کراچی کے بالاخانوں میں در آمد بر آمد کے بڑے بڑے تاجر بیٹھے تھے جو اپنی اپنی تجارتوں کو بل دے دے کر آگے پھیلا رہے تھے۔ ان میں تیل کے تاجر، ٹیکسٹائل، سپورٹس، سپورٹس گڈز کے سپلائر، کپڑے کے بیوپاری، رزئی کے تھوک فروش، پانی کارک کے اسپورٹس جویناں کے انڈینٹر، کھانوں کے ایکسپورٹرز کے تاجر اور تلے کے منگول بیٹھے تھے۔

میرے پاس کل تین ہزار روپے تھے جن میں سے پانچ سو میں گھر چھوڑ کر چلا تھا۔ کچھ واپسی کے سفر خرچ کے لیے بچانا ضروری تھے۔ باقی کی ساری رقم تجارت کے لیے مختص تھی۔ سہرے مستقبل کا خواب میرے سامنے تھا اور میں اس کی سب سے اونچی چوٹی پر بیٹھا نظریں گھما گھما کر درمض کے مختلف براعظموں کو دیکھ رہا تھا جہاں میرے کارندے بڑی تنہائی کے ساتھ اپنے اپنے کام میں مشغول تھے۔

بولٹن مارکیٹ کے سامنے والی بلڈنگ کی اوپری منزل میں بڑی گہما گہمی تھی۔ کچھ لوگ اندر گھوم رہے تھے کچھ کھڑکیوں میں بیٹھے باہر جھانک رہے تھے۔ ایک پور ٹیکسٹائل بیوٹری پان کا پھول گلے میں لٹکائے گوریلا بنایا کر بیچ رہا تھا۔ مجھے کسی نے اس بلڈنگ کا پتہ دیا تھا کہ یہاں ہر نوع کا کاروبار ہوتا ہے اور یہاں سے انڈی آدمیوں کی تجارت کا صفہ بھی کھل سکتا ہے۔

اوپر پرانی وضع کے کمروں میں بے شمار تجارتی دفاتر تھے جہاں اپنی اپنی طرز کا کام ہو رہا تھا۔ اندر لٹکتے ہوئے پیلے پیلے بلب تو روشن تھے لیکن کمرے دھندلے دھندلے سے تھے۔ کام کرتے ہوئے کارندوں کے چہرے ٹھیک سے دکھائی نہ دیتے تھے۔ شاید وہ انہیں ٹھیک سے دکھانے کے آرزو مند بھی نہیں تھے۔ ہر دفتر میں سامنے کاؤنٹر پر ایسا کچھ ہو رہا تھا جیسا خفیہ انداز میں اندھیرے کونے میں ہو رہا ہو۔

میں جس کمرے میں روز تجارت سمجھنے کی غرض سے داخل ہوا اس میں سلک کا جھل جھلا سوٹ پہنے ایک ٹیلیفون شیور مرد انہیں ہاتھ بیٹھی ٹائپسٹ گرل کو چٹھی لکھوا رہا تھا اور

ٹائپٹ ایسے بولے جا رہا تھا جیسے اس نے یہ چٹھی زبان یاد کر رکھی ہو۔ بائیں جانب ایک اور گہمی سی لڑکی بڑے ٹائپ رائٹر پر بڑے بڑے فارم ٹائپ کر رہی تھی۔ دونوں لڑکیاں گوانیزے تھیں اور ہلکے ساٹوں رنگ سے نکھر کر باہر کو نکلتی رہی تھیں۔ میں کرسی سمجھ کر کاؤنٹر کے سامنے بیٹھ گیا، لیکن باس نے میری طرف کوئی توجہ نہ دی۔ ایک چٹھی ختم کرا کے اس نے دوسری شروع کرادی!

میں اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا تھا اور وہ مجھے دیکھتے ہوئے بھی نہیں دیکھ رہا تھا۔ جب اس کی ڈکٹیشن ختم ہو گئی تو اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور بولا "فرناؤ؟"

میں نے کہا "آپ کس چیز کی تجارت کرتے ہیں؟"

اطمینان سے بولا "ہم روڈو جرمنی بیچتے ہیں اور ہالینڈ سے خوشبوئیں منگواتے ہیں۔"

پھر تھوڑی دیر سوچ کر بولا "آپ کسی کاروبار میں ہیں؟"

میں نے کہا "میں تو سرکاری ملازم ہوں، لیکن اب کاروبار کی سوچنے لگا ہوں۔ تھوڑی دیر تک ساتھ ساتھ نوکری کروں گا اس کے بعد چھوڑ دوں گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔" اس نے میرے پروگرام میں دلچسپی لیتے ہوئے کہا "آپ دھندہ کس چیز کا کرو گے؟"

میں نے کہا "اسپورٹ کروں گا۔"

بولا "کس چیز کی؟"

میں نے کہا "کسی چیز کی بھی جس میں زیادہ سے زیادہ نفع ہو۔"

"اور ایکسپورٹ کیا کرو گے؟"

میں نے کہا "ایکسپورٹ کی مجھے چنداں ضرورت نہیں۔"

وہ حیرانی سے میرا منہ دیکھنے لگا۔ پھر ذرا سا مسکرایا اور سر کو ہلکا سا جھٹکا دے کر بولا "اسپورٹ کے لیے فارن ایکسچینج کدھر سے لاؤ گے۔"

میں نے کہا "وہ مجھے میرا بینک دے دے گا۔"

کہنے لگا "آپ کو اس دھندے کا کچھ علم ہے ایکسپورٹ اسپورٹ کا؟"

میں نے کہا "تھوڑا سا کتابی علم ہے باقی کام میں ساتھ ساتھ سیکھ جاؤں گا۔"

وہ پھر ہنس اور اس نے سر کو پھر اسی طرح سے جھٹکا دیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میں اسے

جانتا ہوں۔

کہنے لگا "پہلے آپ کو سال دو سال کی نوکری کر کے یہ کام سیکھنا چاہیے اور پھر اس میں ساتھ کسی حصے دار کو مل کر یہ کام کرنا چاہیے۔ لیکن....." وہ رک گیا۔

میں نے کہا "لیکن کیا؟"

بول "شرط یہ ہے کہ وہ حصے دار نیک اور ایماندار شخص ہو۔"

میں نے کہا "کیا آپ میرے ساتھ اس حصے دار کی میں شریک ہو سکتے ہیں؟"

اس نے فنی میں سر ہلایا اور اسی طرح سے مسکرایا جیسے کہہ رہا ہوں میں باز آیا محبت سے اٹھا اپنا دان اپنا۔

مجھے یوں لگا جیسے میں نے اسے پہلے نہیں دیکھا ہے۔

اس نے کمری سے ذرا سا اٹھ کر میرے ساتھ مصافحہ کرنے کو ہاتھ آگے بڑھایا تو میں نے بڑے تپاک کے ساتھ اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا۔

اس نے زور کی چیخ مار کر اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑا لیا اور قرقر کا پینے لگا۔ پانچھ ایسے لگا گویا وہ کانپ رہا ہو۔

اس کی دونوں گونگیزے لڑکیاں کام روک کر حیرت سے اسے دیکھنے لگیں۔

وہ اپنے کاؤنٹر کا پیٹا اٹھا کر باہر نکلا اور میرے ساتھ چٹ گیا۔

میں نے اس سے پرے ہونے کی کوشش کی تو وہ میرے ساتھ اور جڑ گیا اور ہولے ہولے کر اپنے لگا۔

مجھے یہ سب کچھ اچھا نہیں لگا اور دل میں جلدی جلدی طرح طرح کے خیال گزرنے لگے۔

اس نے مجھ سے الگ ہو کر گردن ذرا سی اٹھا کر پوچھا "ابھی تک ریڈیو میں ہوا محکمہ تبدیل کر لیا؟"

میں نے کہا "محکمہ تبدیل کر لیا۔ اب میں وزارت تعلیم کا ملازم ہوں۔ لاہور میں میرا دفتر ہے اور میں وہیں قیام پزیر ہوں۔"

"لیکن تم کون ہو؟" یہ میں اس سے نہ پوچھ سکا۔ اگر میں پوچھتا تو شاید وہ بتا بھی دیتا لیکن میرا یہ سب کچھ پوچھنے کا حوصلہ نہ ہوا۔

وہ کہہ رہا تھا "آپ بزنس کریں تو پہلے ایک مخلص اور ایماندار قسم کا ساتھی ڈھونڈیں" پھر اس کے ساتھ کچھ وقت گزاریں اور اس کو گردن دمان کر اس سے کچھ سیکھیں....."

وہ تو اپنی رو میں بولتا چلا جاتا تھا لیکن میں اس کے اسی سوال پر اٹکا ہوا تھا۔ اس کا چہرہ بڑا باؤس اور شناسا قسم کا تھا مگر وہ میرے ذہن سے پھسل پھسل جاتا تھا۔ پکارا کی نہیں دیتا تھا۔ میں نے کہا "میں آپ کو پہچان نہیں سکا؟"

بول "کو شش کرو۔"

میں نے کہا "یاد کے اندر تو بہت کوشش کر کے دیکھ لی اب باہر سے دیکھ رہا ہوں۔"

بول "ابھی تم نے پار کے اندر پورے طور پر جھانڈو نہیں دیا۔ اوھر اوھر کے ہاتھ چلا کر فارغ ہو گئے ہو۔ اس سے کچھ نہیں ملے گا اور کوشش کرو۔"

میں تنگلی باندھ کر بڑی دیر تک اس کے چہرے کو دیکھتا تھا اور وہ قانکوں کے صفحے الٹ پلٹ کرتا مسکراتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد نظریں اوپر اٹھائے بغیر مسکرا کر بولا "تم شروع ہی سے ایسے کامل اور آس آوی ہوں۔ تم میں ہمت نہیں ہے۔ پہلے بھی جب ملے تھے تو ایسے ہی شمس اور احدی انسان تھے۔"

یا اللہ! یہ کون ہے جو ایسی جان پہچان اور گہری واقفیت کی باتیں کر رہا ہے انکول چہرہ؟ کلین شیو، سرخ و سفید مہنچاسر، کوجیک نڈا، خوش پوش، خوش گفتار، صاحب علم، زندہ شناس، ملک التجار..... کون ہے بھائی؟ یہ کون ہے؟

اس نے میرے اندر کی آواز کو بغور سن کر چہرہ اوپر اٹھایا۔ ایک لمحہ کے لیے مجھ کو دیکھا۔ پھر نہ جانے کے انداز میں بولا "ارے بھائی! میں بابا سنگل شاہ ہوں..... محمد الیاس جتوئے؟"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس سے بے اختیار چمکی ڈالنے کو جی چاہتا تھا لیکن وہ کاؤنٹر کے اس پار اسی طرح سے بیٹھا اپنے کاغذات لکھتا رہا۔ شیو لڑکی نے اسے چٹھی دی تو اس نے سونے کا پار کر نکال کر اس پر بے اعتنائی سے دستخط کیے اور مجھے کہنے لگا "میں رووے کا بیوپار کرتا ہوں۔ رووہ جرمنی ایکسپورٹ کرتا ہوں اور وہاں سے ڈائریکٹ گھوڑا تار ہوں۔ کھانے والے رنگ اور تین قسم کی خوشبوئیں، ڈیلا، شاہری اور انٹاس..... پاکستان میں خدا کے فضل سے" اس فیلڈ میں میری فکر کا اور کوئی تاجر نہیں۔

میں نے کہا "لیکن تم کو تو میں گجرات کے اڈے پر چھوڑ کر آیا تھا۔ اس عرضی نوکیلی کا کیا بنا؟"

کہنے لگا "لالہ موسیٰ سے ذرا آگے ایک کار سوار کی درخت سے گر ہو گئی تھی۔ میں

سائیکل پر سوار کھادیاں چارہ تھا۔ بائیکنگل پر سے پھینک کر میں نے مشکل سے اس شخص کو کار سے نکالا۔ اسے زمین پر لٹا کر مصنوعی شخص دیا۔ دل کی مالش کی۔ دونوں بازو کھولے بند کیے لیکن وہ جانبر نہ ہو سکا۔ اس کی جیب میں پچاس ہزار روپے کا چیک تھا جو میں نے احتیاط سے نکال کر اپنی سائیکل کی گدی کے نیچے اڑس لیا۔ تھوڑی دیر بعد بہت سے لوگ ادھر جمع ہو گئے۔ میں میت ان کی حفاظت میں چھوڑ کر اپنے سفر پر روانہ ہو گیا۔

”دل بہت بے چین تھا۔ رہ رہ کر اس جوان مرگ کا خیال سنا تھا۔ پتہ نہیں کون بد نصیب تھا اور کہاں کا رہنے والا تھا۔ کدھر سے آیا تھا؟ کدھر کو جانا تھا اور کدھر پہنچ گیا تھا۔ دنیا کی بے ثباتی کا دل پر ایسا اثر ہوا کہ میں گجرات چھوڑ کر اپنی آٹیا اور اس رقم سے یہاں بیٹھ کر تجارت کی راہ اختیار کر لی۔ قسمت یاد تھی۔ ایک اچھا سمین گرو مل گیا۔ اس نے رودے کی ایک سپورٹ میں ڈال دیا۔ اس وقت سے لے کر اب تک یہ دھندہ کر رہا ہوں۔ حال اچھا ہے۔ مال کافی ہے۔ جب تک اس کو منظور ہو گا یہ دھندہ کرتا رہوں گا۔ پھر جو اس کا حکم ہو گا اس کے آگے سر جھکاؤں گا۔“

یہ سب کچھ سننے کے بعد میرے پاس جو لب دینے کو کیا باقی رہ گیا تھا۔ منہ میں گفتگیاں ڈالے تک تک اس کا چہرہ دیکھتا رہا اور دل ہی دل میں سبحان اللہ و بحمد سبحان اللہ والعظیم کا ورد کرتا رہا۔

کہنے لگا ”گھر سے کھانا آیا ہے۔ ہے تو پر ہیزی قسم کا“ لیکن ہم دونوں کے لیے کافی ہو گا۔ چاہو تو یہیں کھا لیتے ہیں ورنہ انٹینسٹریٹ پر ایک چائینیز ہوٹل ہے وہاں چلتے ہیں۔“

پھر خود ہی کہنے لگا ”یہاں کھا کر کیا کریں گے؟ چائینیز چلتے ہیں وہاں کا کھانا بہت کمال کا ہے۔ ذرا مہنگا بہت اچھی جاتے ہیں۔ فریڈ پر انز کا جواب نہیں..... چلو وہیں چلتے ہیں۔“

جب ہم نیچے اتارے تو ایک اس کا پرانی وضع کا جو ناکڑھی ڈرائیور تھا اور ایک عددی امبالا کار تھی۔ اس کی سینٹ پر سخت چڑے کی ایک چو کوہ گدی تھی جس پر بیٹھے سے اس کی ریشم کا درم دبا رہا تھا۔ میں بہت ڈرتے ڈرتے بڑے تپاک سے اور نہایت لجاجت کے ساتھ اس کی کار میں داخل ہوا اور اس سے ڈراؤر ہو کر بیٹھ گیا۔

کہہ رہا تھا ”مجھے سمجھ نہیں آتی کہ میری منزل کہاں ہے اور مجھے کیا کرنا ہے اور میرے لیے کیا کام طے ہے۔ لیکن اب کچھ کچھ محسوس ہوتا ہے کہ مجھے تجارت کرنی ہے۔ بہت سا روپیہ کمانا ہے۔ اپنے ملک کی اور اپنے ہم وطنوں کی مدد کرنی ہے۔ یہ بھی ایک طرح کا جہاد

ہے۔“ پھر اس نے غور سے میری طرف دیکھا اور کہا ”جہاد ہی ہے ناں؟“ میں نے کہا ”بالکل جہاد ہے“ لیکن مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں کہ جہاد کا اصل مفہوم کیا ہے۔ بظاہر تو ہر طرح کی کوشش ”جدوجہد“ یعنی ”دوڑ و دوپ“ مشقت اور تنگ دوو جہاد ہی ہے لیکن اصل جہاد کچھ اور ہوتا ہے۔“

یہی تو میں کہتا ہوں۔ ”اس نے چہرہ حجت کی طرف اٹھا کر کہا ”میری ابتدا تو اچھی تھی اور میں نے اس میں کشت بھی کافی کاٹا تھا لیکن پھر پتہ نہیں کیا ہوا.....“

”پھر سنگل ٹوٹ گیا۔“ میں نے شرارت سے کہا۔ ”ہاں کچھ ایسا ہی ہے۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا ”اصل میں یہ سنگل بھی بہت کمزور ہوتا ہے۔ کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جاتا ہے۔“

”ٹوٹنا تو نہیں چاہیے۔“ میں نے سوالیہ انداز میں یقین دلایا۔ ”ہاں ٹوٹنا تو نہیں چاہیے۔“ اس نے سوچتے ہوئے کہا ”لیکن یہ جو مرد کی ذات ہے ناں اس کا سنگل پر بازو رہتا ہے اور کچن بات یہ ہے کہ اس کا سنگل ہی کمزور ہوتا ہے۔ مجھ پر جو گزری اس کا تمہیں اچھی طرح سے علم ہے۔“

میں نے کہا ”اوپر کا علم تو ہے لیکن اندر کا نہیں۔“ کہنے لگا ”اب یہاں بھی ایک ہے۔“

”کوئی دوسری؟“

”ہاں دوسری۔ لیکن اس کا گھر والی کو علم نہیں وہ ابھی گجرات ہی میں ہے۔ ایک چکر لگا گئی ہے اور دو مہینے میرے ساتھ گزار بھی گئی ہے۔“

میں نے خوش ہو کر کہا ”یہ تو مرد کے کمال فن کا اظہار ہے۔ ہزاروں سال سے ایسا ہی ہوتا آیا ہے اور اسی طرح سے ہوتا رہے گا۔ اس میں گھبرانے کی چنداں ضرورت نہیں۔“

اس نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور چپ سا دھ کر کھانا کھانے لگا۔ کچھ دیر تک ہم خاموش کھانا کھاتے رہے اور پھر اس نے ریستوران کے باہر کر اپنی کی اسی ہوئی گرمی کو دیکھا جو پچھلے سالوں فقیر فی کی طرح ریستوران سے باہر ہمارا انتظار کر رہی تھی۔

”چینی قبوہ؟“ اس نے اچانک پوچھا۔ میں نے کہا ”ابھی تو ہم نے کھانا بھی ختم نہیں کیا ابھی سے قبوہ کیسا؟“

بولاً ”پہلے سے کہہ دیں تو کھانا ختم کرتے ہی مل جاتا ہے۔ پھر میں ذرا جلدی میں بھی ہوں۔ میرے دو تین کیبل گرام جرمنی سے متوقع ہیں۔ کچھ مال بیجا تھا اس کی اب تک کوئی اطلاع نہیں ملی۔“

میں نے کہا کون سا مال اور کہاں کا مال۔ سچ میں سے تو وہ وہی ہے۔ گنڈا بندہ پورے پینٹ میں رہے تو آنت باہر نکل آئے تو تانت۔“

کہنے لگا ”بس بس یہ تانت ہی شیطان کی آنت ہے جس سے میرے ازل کی ڈوری بندھی ہے۔“

میں نے کہا ”تانت کے ساتھ؟“

بولاً شیطان کے ساتھ اچھے سے بڑی ہمدردی کرنا ہر بار ازلے چھڑے وقت میں میرے کام آتا ہے۔ کوئی مشکل پڑ جائے تو ڈٹ کر ساتھ دیتا ہے۔ جتنے برس مشکل پوش رہا میری خدمت کرنا رہا مجھے سہارا دیتا رہا۔ میرے ہر ہر نفس کے ساتھ رہا۔ لیکن میں شاید اس کا بندہ نہیں ہوں۔“

میں نے کہا ”خدا نہ کرے۔۔۔ تم واقعی اس کے بندے نہیں ہو۔۔۔ نفوذ باللہ“

گھبرا کر بولا ”میں شاید خدا کا بندہ بھی نہیں ہوں۔۔۔ میری راہوں میں اس کے بلاوے کی آواز نہیں پہنچتی، بس اک گونج سی سنائی دیتی ہے، الفاظ سمجھ میں نہیں آتے۔۔۔ لیکن یہ میری زندگی نہیں، میری زندگی کچھ اور ہے۔“

”یعنی؟“ میں نے پوچھا۔

”یعنی یہی کہ میں جو کے بدلے جنت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔“

میں نے حیرانی سے اس کی جانب غور سے دیکھا تو اس نے کہا ”آنے والے غیبروں میں سے کسی ایک نے بابا آدم کو طعنہ دیتے ہوئے کہا واہ بابا جی! وہاں آپ نے گندم کے ایک دانے کے بدلے جنت گنوا دی اور اس سے خالی ہاتھ باہر نکل آئے۔ کیا گھائے کا سودا کیا۔۔۔ بابا آدم نے اطمینان سے فرمایا کہ اب یہی جنت میری اولاد سے کوئی جو کے ایک دانے کے عوض خرید لیا کرے گا۔ جو میں نے گندم کے دانے کے بدلے فردخت کر دی۔۔۔ تو میری آرزو ہے کہ میں بھی یہ سودا کروں اور اس میں کامیابی حاصل کروں۔“

میں اس کی یہ بات سن کر حیران رہ گیا۔

کہنے لگا ”میں جہاں جہاں ہوتا ہوں وہاں بس ہوتا ہی ہوں۔ اصل میں یہ میری منزل

نہیں ہے۔ مجھے کسی اور جگہ ہونا چاہیے۔“

میں نے کہا ”میں آپ کی بات نہیں سمجھا۔“

بولاً ”وہ جہاں میں تھا۔ مری کے پیازوں میں، وہ میرا اصل مقام نہیں تھا۔ مجھے اس سے کافی ہٹ کے ہونا چاہیے تھا۔“

”مثلاً؟“ میں نے پوچھا۔

”میں یہ نہیں بتا سکتا، لیکن میری بے چینی مجھ سے بار بار یہی تقاضا کرتی رہتی تھی کہ تم ایک غلط مقام پر آگئے ہو، اس کو چھوڑ دو۔“

”اور وہ اصل مقام کا کیا اشارہ دیتی تھی؟“ میں نے پوچھا ”تمہاری بے چینی؟“

”وہ بڑی باقاعدگی سے اشارہ دیتی تھی لیکن میں سمجھ نہیں سکتا تھا۔۔۔ جیسے میں اب اس محبوبہ کی آغوش میں ہوتا ہوں اسی کراچی والی دختر قصاب کی گود میں، تو میرا دل گھبرانے لگتا ہے اور مجھے اپنی گجراتن ویوی یاد آنے لگتی ہے۔۔۔ اور جب میں گجرات جا کر چند ہفتے اس کے ساتھ گزارتا ہوں تو مجھے اس کی یاد ستانے لگتی ہے جس نے ایک مرتبہ مری میں میرے سنگل کھولے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بھی میری حیون ساتھی نہیں ہے۔“

”کیا؟“ میں نے چیخ کر پوچھا۔

تو اس نے آرام سے کہا ”میری ان کے ساتھ شناسائی ضرور ہے، لیکن ان میں سے کوئی بھی میری حیون ساتھی نہیں ہے۔۔۔ میری اصل حیون ساتھی میری موت ہے جو میرے بہت ہی کمزور لمحوں میں ان چھوٹی حیون ساتھیوں کے ساتھ ایک ایرانی بی بی کی طرح میرے دونوں پاؤں کے درمیان گھومنے لگتی ہے اور اپنی کھڑی دم بادی بادی سے میری پنڈلیوں پر بھائی جاتی ہے۔“

اس کی ایسی سوچ کا کیا جواب دیا جاسکتا تھا بھلا!

وہ کہہ رہا تھا ”اپنی من پسند موت کو گلے لگانے میں بڑی لذت ہے۔ وہ جب تمہاری شرمگ کی طرف اپنی تھو تھنی بوھاتی ہے تو اس کے دانتوں اور کلیوں سے ایک عجیب طرح کی خوشبو نکلتی ہے۔ گلاب اور اناراس کی خوشبو۔ یہ موت کی آمد کی خوشبو ہے اور جب وہ بہت قریب پہنچ جاتی ہے تو اس کے حلق سے جانتل اور جاوتری کی بھبک آنے لگتی ہے۔“ مجھے اس کی باتیں سن کر خوف آنے لگا، لیکن وہ بڑے اطمینان سے باہر سڑک کی طرف دیکھ رہا تھا اور خوش تھا کہ اس کو اپنے من کی باتیں سنانے کے لیے کوئی جھٹو ڈھانڈا مل گیا ہے۔

میں اس سے جب بھی بزنس کی کوئی بات بھیجی تیا حرافت کی اوٹ سے نکل کر کچھ پوچھنے کی کوشش کرتا تو مجھے ہر مرتبہ خالی دے کر جہاد کے بارے میں گفتگو شروع کر دیتا۔ اس کا خیال تھا کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے اسے ہمیشہ ایک جنگجو کے روپ میں زندہ رہنا چاہیے۔ ایک دلدور مبارز کی شکل میں۔ اس سے اس کے اندر کی حقیقت واضح طور پر عیاں رہتی ہے اور دیکھنے والے کو کسی قسم کا دھوکا نہیں ہوتا۔ وہ شخص جس کی تلوار ہر وقت اس کے پہلو میں آویزاں رہتی ہے اس کے اندر کسی قسم کی آلائش جمع نہیں ہوتی۔ وہ اندر باہر سے شفاف ہوتا ہے۔

صاحب السیف ہونے کے لیے جہاد کا رخ ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک ذہن میں جہاد کی جہت نہیں ہوگی انسان کا سیدھا ہونا ممکن ہی نہیں۔ جس طرح قطب نما کی سوئی ہر وقت شمال کا رخ کر کے لرزتی رہتی ہے اسی طرح انسانی وجود اگر جہاد کی طرف رخ کر کے لرزتا رہے تو اس کے اندر کوئی خرابی نہیں رہتی اور وہ ہر طرح کی ذہنی، جسمانی، نفسی اور نفسیاتی بیماری سے امین ہو جاتا ہے۔

میں نے پوچھا "تم نے یہ سب کچھ کیونکر جانا؟"

بول "یہ میرا شخصی تجربہ ہے۔"

میں زور سے ہنسا اور میرے ہاتھ سے کاٹا چھوٹ کر میز سے پرے جا کر۔ اس نے میرے اس غیر ارادی فعل کو خاطر میں لائے بغیر کہا "میرے اندر کی سوئی بھی قطب نما کی طرح ارتعاش پذیر ہوتی ہے مگر کبھی کبھی۔ اس وقت میں ایک اور شخص ہوتا ہوں۔ ایک اور آدمی۔ بہت ہی پرانے زمانے کا ایک شمشیر زن۔ کئی کئی مرتبہ بڑی بڑی دیر تک یہ کیفیت ہوتی ہے پھر میں واپس اپنے گد کی گدی پر لوٹ آتا ہوں۔"

"اپنی اصل سیٹ پر!" میں نے طنز کہا۔

کہنے لگا "لیکن وہ شاید میری اصل سیٹ نہیں ہے۔"

"مگر یہ تم نے کیونکر جانا؟" میں نے اپنا سوال دہرایا۔

اس نے ہلکے گولڈن رنگ کا تھوہیلیاں میں ڈالتے ہوئے کہا "کھنڈوں میں ایک خان صاحب تھے جو ٹھاکروں کی طرح ڈاڑھی چڑھاتے تھے اور لہیں بڑھا کر مونچھوں کو تاؤ دے کر رکھتے تھے۔ لباس بھی کچھ ایسا ہی کا فر لہا ان کو پسند تھا۔ فسق کی یہ ظاہری صورت تھی۔"

میں نے کہا "اگر ظاہری صورت ایسی زوردار تھی تو اندر کی کیفیت کیا ہوگی؟"

بول "دنیا بھر کی بازیاں ان کے اندر موجود تھیں جن میں سے ایک ایک کا تعلق فسق و فجور کی اعلیٰ سے اعلیٰ شق سے منسلک تھا۔ شام کو دلائی بوتل منگوا کر گھونٹ گھونٹ کر کے پیتے اور رنڈی کو ران پر بٹھا کر اس کا بھر اسٹے۔ خوش نہال ہو کر سازندوں کے ساتھ تالیاں بجا بجا کر لہک لہک کے گاتے اور لوٹ لوٹ جاتے۔ جب کوئی کہتا خان صاحب اب عمر رسیدہ ہو گئے ہو قبر میں جانے کا وقت قریب آگیا ہے اب تو توبہ کر لو۔ تو خان صاحب حیران ہو کر اس کا چہرہ دیکھتے۔ وہ آدمی بڑی دردمندی کے ساتھ رک رک کر کہتا نماز پڑھو روزہ رکھو مال و دولت رکھتے ہو حج کر آؤ۔ تو خان صاحب پوچھتے نماز پڑھ کر روزہ رکھ کر کیا ملے گا؟ لوگ جواب دیتے جنت ملے گی۔ اللہ کا دیدار نصیب ہو گا۔"

خان صاحب پوچھتے جنت کے واسطے اتنی محنت کیسی مشقت اچھریں کر کے مریاں کوئی وقت ایسا آوے گا کہ ایک ہاتھ اوپر ایک ہاتھ اوپر کائی سی پھٹ جائے گی اور کھٹ سے جنت میں جا کھڑے ہوں گے۔ جنت میں جانا کون سا مشکل کام ہے۔"

"اتحاد عم!" میں نے حیرانی سے کہا۔

کہنے لگا "اب خان صاحب کی اس بات کو کوئی نہ سمجھتا۔۔۔۔۔ لیکن جلدی وقت آگیا جس وقت مولوی امیر علی صاحب ہنومان گڑھی پر جہاد کے لیے تشریف لے گئے تو بہت سے مسلمان تیار ہو گئے۔ ہمارے خان صاحب بھی مولوی صاحب کے پاس پہنچے اور کہا مولوی صاحب ہم جیسے گنگا گروں کو بھی اللہ تعالیٰ قبول فرمائیں گے۔ مولوی صاحب نے کہا کہ خان صاحب مانع کون ہے اور آپ کی راہ میں حائل کون ہو سکتا ہے۔ راہ حق کا جہاد ہے کسی کا کوئی اجارہ نہیں۔"

خان صاحب صافہ باندھ کر اور ہاتھ میں خاندانی تلوار لے کر میدان جنگ میں پہنچے۔ ایک ہاتھ اوپر اور ایک ہاتھ اوپر چلانا شروع کر دیا۔ شمشیر زنی کا پرانا خاندانی فن ہر بر بدھت پر ساتھ دیتا گیا۔ ایک کثیر تعداد کافروں کی ختم کر دی۔ اب کسی کافر کا ہاتھ خان صاحب پر پڑ گیا۔ ایک دم کائی سی پھٹ گئی اور کھٹ سے سیدھے جنت میں جا کھڑے ہوئے۔ بظاہر فاسق تھے مگر باطن میں عاشق تھے۔ جھنڈی لوٹ کر لے گئے۔"

میں نے کہا "آپ کا کیا ارادہ ہے؟"

کہنے لگا "میں بھی عاشق ہوں پر میرے اوپر کالک جی ہے چھٹے چھٹے چھٹے گی۔ لیکن یہ نہیں۔۔۔۔۔ اس عرصے میں وفات بھی ہو سکتی ہے۔"

میں نے کہا "کبھی باتیں کرتے ہیں۔ ابھی تو آپ کو بہت سے کام کرنے ہیں۔ صنعت

کو فروغ دینا ہے کارخانے لگانے ہیں، غیر ملکوں میں برائیاں نہیں قائم کرنی ہیں۔“
 بولا ”ارادہ تو یہی ہے لیکن پتہ نہیں یہ نکل منڈھے چڑھے گی بھی کہ نہیں۔“

پھر وہ جہاد کا فلسفہ چھوڑ کر کاروباری باتیں کرنے لگا اور اس میں اتنی دور تک چلا گیا کہ اس نے جس کی سرگنگ کے خواب دیکھتے شروع کر دیے اور ایک انٹر نیشنل منگلر کے طور پر خود ایک فلمی ہیرو سا بن کر کھڑا ہو گیا اور دستور ان ہی کے اندر ڈرامہ ساز کرنے لگا۔ اس کا یہ جذبہ جذبہ جہاد سے بھی بڑھ کر عیاں ہونے لگا اور دیکھتے دیکھتے اس کے سارے وجود پر محیط ہو گیا۔

کہنے لگا ”دولت سے بڑھ کر اور کوئی حسین شے اس دنیا میں موجود نہیں۔ اس کے زرخیزے پر چہرہ رکھ دو تو سارے زمانے کی خوشبوئیں سمٹ کر اس نقطے پر آ جاتی ہیں۔ محبوب کے گلے کی خوشبو ساری خوشبوؤں سے افضل ہے اور دولت کی خوشبو اس گلے سے بھی بہت اوپر نکل جاتی ہے۔“ پھر اس نے رک کر غور سے میری طرف دیکھا اور کہنے لگا ”تم نے سٹیٹ بینک سے آئے نوٹوں کی تازہ گڈی سو گڈی کر دیکھی ہے.....؟ سو گڈی کر دیکھنے کی بھی ضرورت نہیں..... اسے قریب سے دیکھنے کی طلب ہو تو وہ خوشبو آپ سے آپ آنے لگتی ہے۔“

مجھے یاد آیا کہ جب ابا عید پر عیدی دینے کے لیے نئے نوٹ بینک سے منگوا کر لاتے تھے تو ان میں سے ایسی خوشبو آتی تھی۔

میں نے کہا ”مجھے یاد ہے اور میں نے اس خوشبو کو کئی بار اپنے وجود کے ساتھ محسوس کیا ہے۔“ مینے کی پہلی تاریخوں میں جب میں اپنی قیص اندر کر کھوٹی پر لٹکا کر تاہوں تو میری جیب سے تازہ نوٹوں کی خوشبو آیا کرتی ہے، حالانکہ نوٹ کب کے خرچ ہو چکے ہوتے ہیں۔“
 اس نے کہا ”دولت کی خوشبو دنیا کی ساری خوشبوؤں سے افضل ہے۔ اس میں دونوں ہیکس شامل ہوتی ہیں۔“

”دونوں ہیکس!“ میں نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں!“ اس نے تھوڑی کھجائے ہوئے کہا ”اس میں دلہن کی سچ کی باس بھی ہوتی ہے اور جنازے کی چادر کی خوشبو بھی اور دونوں ایک ساتھ ملی ہوتی ہیں..... میں نے سو سٹور لینڈ کی شریف سمجھنی سے یہ سمجھ بیٹھ خوشبو ہوا کر منگوائی تھی۔ بڑی مفید ثابت ہوئی.....“
 ”جنازے کی خوشبو!“ میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ اس نے جھٹک کر کہا ”جنازے کی خوشبو نہیں جھٹے، جنازہ لوٹوں کی خوشبو..... میں نے اس خوشبو کے زور پر بڑے مزے لوٹے ہیں اور مشکل سے مشکل طور توں کو آسان کر کے اپنے ساتھ لیتا ہے۔ وہ جیبوں، کندھوں، کپٹیوں اور ہتھیلیوں پر ملی ہوئی اس خوشبو کی سنگندہ پا کر تھارے ساتھ لپٹی چلی جاتی ہیں۔“

”اور جیسے خالی ہوتی ہیں۔“ میں نے اٹھلا کر کہا تو اس نے فنی میں سر ہلایا اور پھر ہٹکا مارنے کے انداز میں ہونٹ کھول کر کہا ”بالکل خالی نہیں ہوتیں ان میں بھی کچھ ہوتا ہے۔“
 میں نے کہا ”تم تجارت کرنے کی غرض سے یہاں آئے ہو کہ خوشبوؤں کے مزے لوٹنے کو آٹھٹے ہو؟“

کہنے لگا ”دولت بھی زن لطیف کی طرح بڑی جاذب..... دلکش اور کشیدہ چیز ہے، جس طرح خاص ایام میں عورت کے وجود سے ایک مخصوص قسم کی ہلک آتی ہے اسی طرح یہ بھی شگی جتوں کی طرح ”آدم یو“ ”آدم یو“ پکارتی پکارتی ہے۔“

میں نے کہا ”تم بھی کمال کے احق انسان ہو، کبھی اس کی خوشبو کی بات کرتے ہو کبھی اس کو بدبو میں بدل دیتے ہو۔ ایک بڑا پر قائم ہو۔“

سجیدگی سے بولا ”تم نے کبھی ہاسی پھولوں کے گل سڑ جانے کے بعد ان کی بدبو سو گڈی ہے۔ خوشبودار پھولوں کو پھونڈی لگ جانے کے بعد ان کو چھو کر اپنی انگلی سو گڈی کر دیکھی ہے۔“

میں حیرانی سے اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

بولا ”اب یہ دولت جس کے نوٹوں سے ایسی اچھی خوشبو آتی ہے، غفلت بھی ہے، یہ اجابت ہے۔ جس طرح انسانی بدن میں غذا کی گردش بتدریج مختلف خانوں میں ہوتی رہے تو صحت کا سلسلہ قائم رہتا ہے، لیکن اگر یہ گردش رک جائے تو قبض کی صورت اختیار کر لیتی ہے اور اس سے جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔“

ہمارے شہر کا سب سے امیر آدمی تھوچر چر تھا اور اس کو ہر وقت جان کے لالے پڑے رہتے تھے۔ گھر کے باہر ٹیڑھی میں اس کو ہر روز حقہ ہوتا تھا اور اس کی کراچی دور دور تک جاتی تھیں۔ ہم سکول سے آتے ہوئے تھوچر چرے کی حویلی کے سامنے کھڑے ہو کر اس کی آہوں اور کراہوں کے مزے لوٹا کرتے تھے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔

سنگل شاہ نے کہا ”جب دولت پر دولت ٹھونسی جائے اور نگاہی کے راستے بند کر دیے

جائیں تو جان لیوا قبض ہو جاتی ہے۔ دولت دراصل شٹ ہے۔ اس کو جمع کرتے جائیں تو بدبودار اور ڈی بن جاتی ہے۔ بکھیرتے جائیں تو اٹلی درجے کی کھاد بن جاتی ہے جس سے رنگارنگ پودے، پھل اور پھول پیدا ہوتے ہیں اور لوگ سیر گل کے لیے دور دور سے چل کر آتے ہیں۔۔۔۔۔ دولت میں اور شٹ میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں ہی خوشحالی کی ضامن ہوتی ہیں۔ ایک معاشرے میں دوسری خیابان میں۔“

پھر وہ خاموش ہو گیا اور دیر تک میری طرف دیکھا رہا۔ جب میرے چہرے پر اس کی غمگینی سے گھبراہٹ کے آثار پیدا ہوئے تو وہ کہنے لگا "میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ یہ دولت کوئی چیز نہیں ہے کوئی شے نہیں ہے، یہ ایک فعل ہے۔۔۔ تم یوں سمجھو کہ زندگی کی عبارت میں دولت ایک ناؤن نہیں بلکہ یہ ایک فعل کے طور پر اور متعلق فعل کے طور پر استعمال ہوتی ہے۔ دولت ایک اسم نہیں یہ ایک فعل ہے۔"

میں نے کہا "سنگل شاہ تم تجارت کرتے ہو کہ سکول ماسٹری؟"

دونوں ساتھ ساتھ ہیں۔ ایک میں سے ایک نکلتی ہے۔“

دوا ہے ہاتھ کی لکیریں دیکھتے ہوئے بولا "میں نے بڑے سال فقیری میں لگائے اور بہت دور تک پہنچا مگر اب دیکھتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ امیری فقیری سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس میں روحانیت کا رنگ غالب ہے۔ آدمی ہر وقت لڑائی و ترساں رہتا ہے۔ مستقبل کے خوف سے کانپتا ہے۔ حال میں زندہ نہیں رہ سکتا۔ بات یہ ہے کہ دولت چیزوں کو رخ دیتی ہے، خلق کرتی ہے، جنم دیتی ہے، دُجو میں لاتی ہے، یہ دنیا میں عمل کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ اقتصادیات کی شرع کی فقہ بھی ہے اور اس کی معرفت شناس بھی۔ یوں لگتا ہے کہ زندگی کا دار و مدار اس پر ہے۔ لیکن انسان کا انداز اس سے احتراز بھی کرتا ہے۔ پھر دنیا پر قابض طاقتور سکے آگے بڑھ کر اس احتراز کی سزا بھی دیتا ہے۔ گوشمالی کرتا ہے۔ خوب ٹھکانی کرتا ہے۔ جوں جوں اس کا بطلان ہوگا اس کی سزا خوفناک ہوتی جائے گی۔ اس کی عقوبت بدھتی جائے گی۔"

اس نے کہا ”میں تمہیں مرتبہ ولایت گیا ہوں اور وہاں جا کر میں نے محسوس کیا ہے کہ اقتصادیات دولت کو لہر راست پر لانے سے معذور ہے۔ دولت ناخلف اولاد کی طرح آگناکس کی ایک نہیں مانتی جو دل میں آتا ہے کرتی ہے۔ آگناکس ڈری ڈری، سبھی سبھی، شرمندہ شرمندہ اپنی ڈگڈی بجائے چلی جاتی ہے اور کچھ نہیں ہوتا۔ اعداد و شمار دولت کے بھالو کو نہ تو ڈور پر لگا سکتے ہیں نہ اسے اپنی مرضی کے مطابق تماشا دکھانے پر مجبور کر سکتے ہیں۔“

پھر اس نے اپنی گرگاہی پہننے ہوئے کہا "یہ جو آگناکس ہے فلا یہ جیمیر آف کارس..... یہ سٹوئیٹ لٹی نیشنل یہ سب ایک طرح سے دولت کا عصبی اختلال ہیں۔ اس کا نیروس ہیں جو اس درد کے حملہ آور ہونے سے روکتے ہیں۔ لوگوں کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرتے ہیں لیکن لوگ بچتے نہیں ضرب شدید کا شکار ہو جاتے ہیں۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور جوش میں آکر بولا ”یہ جو ماہرین اقتصادیات ہیں، بروکر ہیں، اکاؤنٹینٹس، سرمایہ کار اور مالی مشیر ہیں یہ سارے کے سارے دولت کے مندر کے پجاری ہیں جو دن رات اس کی آرتی اتارتے ہیں اور اس کی شان میں بھجن گایا کرتے ہیں۔“

میں نے کہا "کچھ خدا کا خوف کرو سنگل شاویہ تم نے کیا غی کھٹا شروع کر دی کہاں سے چلے تھے اور کدھر پہنچ گئے۔ اوپر کی اڑان کس طرح پستیوں میں اتر گئی۔ تم تو وہ رہے ہی نہیں ہو جوتھے۔ تم وہ چوہی نہیں جس کو میں جانتا تھا۔ میری نظروں میں تو تم ایک ہیرو تھے اور اب ایک معمولی انسان بھی نہیں رہے۔

کہنے لگا ”یہ جو دولت ہے ہاں یہ میری اور اس کے کارہائے نمایاں کی یاد دلاتی رہتی ہے۔ بس اسی میں یہ وضع موجود ہے اور کسی شے میں نہیں۔“

پھر اس نے خیب سے سو روپے کا ایک ٹوٹ نکالا اور کہنے لگا "اس ٹوٹ پر قائد اعظمؒ کی تصویر دیکھ رہے ہو؟"

میں نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ فخریہ انداز میں بولا ”یہ سو روپے کا نوٹ قائد اعظم کو اس سر زمین کے ہیرو کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ یہ ایک کرنسی نوٹ ہی نہیں میرے قائد کے ہونے کا ایک دستو بزی ثبوت ہے۔ اس نوٹ پر ان کی تصویر ہی نہیں ان کی اسی تقریر کا ساؤنڈ ٹریک بھی موجود ہے جو انہوں نے پاکستان سٹیٹ بینک کے اجراء پر کی تھی۔ اسے دیکھ کر وہ ساری متحرک فلمیں یاد آ جاتی ہیں جو قائد اعظم کی ذات سے ان کی جدوجہد سے اور ان کے لازوال ایٹان سے تعلق رکھتی ہیں۔ دولت بہادروں کی عظمت کے قصے ان کی پوری جزیات کے ساتھ یاد رکھتی ہے۔ نہ صرف یاد رکھتی ہے بلکہ ان کی یاد دلاتی بھی رہتی ہے۔ دولت مند ہے، خلافت ہے، منجاست ہے، عفونت اور بسا نہ ہے لیکن ساتھ ہی سنگد ہے، پاس ہے، مہربان ہے، شیم ہے۔ اس سے رکے ہوئے کام چل پڑتے ہیں اور پھٹتے ہوئے اجسام ساکت ہو جاتے ہیں۔ یہ موت سے زندگی پیدا کرتی ہے اور زندگی کو موت میں داخل کر دیتی ہے۔ جتنے بھی بھگت، اولیاء اللہ، شہید، سورے اس دنیا کو ارفع اقدار عطا کر گئے، دولت ان کی پاؤں کو سہارا

دینی ہے۔ ان کے دن مٹاتی ہے۔ ان کی برسیاں کرتی ہے۔ ان کے جگ کرتی ہے۔ ان کے عرس مٹاتی ہے۔ دولت نہ ہو تو فقیروں اور بزرگوں کے مزاروں کی تزئین و آرائش نہ ہو سکے۔ ان کے گرد عقیدت مندوں کی بستیوں کو جگتے بھاؤ خرید کر ان آستانوں کو وسعت نہ دی جاسکے۔ ان کے مرقدوں کے ارد گرد گلستان نہ بن سکیں۔ اس کے ذریعے قدیم ہیروں کی مٹائی اتاری جاتی ہے اور اس کے بل بوتے پر گزرتے ہوؤں کو زندہ کیا جاتا ہے۔

کہنے لگا "اصل میں دولت ہی قائم ہے۔ یہی قائم کی کہانی کی اصل ہیر ہے۔ انسانی ذہن گھوم پھر کر نکھو نکھو کر اور دھونڈ دھونڈ کر تصوراتی خواب بنتا ہے۔ پھر ان خوابوں کو وہ وقت کی سر زمین میں بوتا ہے تو ان مشکل خوابوں کو وقت کی سنگلاخ زمین میں بونے کے لیے دولت ہی اس کا واحد ذریعہ اور سہارا بنتی ہے۔"

میں نے جب اپنے دونوں کانوں پر ہاتھ رکھ لیے تو وہ ہنسنے لگا اور مجھے اس کی ہنسی میں ایک مرتبہ پھر وہی معصومیت نظر آئی جو اس بے وقوف سنگل پوش کے چہرے پر ایک چھوٹی سی سبزی مائل چیزیاں کے روپ میں آکر بیٹھ جاتی تھی اور ایک مرتبہ ادھر ادھر دیکھ کر پر پھیلا کر سو جاتی تھی۔

میں پورا ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہا اور تجارت کرنے کے لیے ہر قسم کی مدد کا وعدہ اور عملی سہولت کی یقین دہانیوں کا مظاہرہ دیکھ کر واپس آ گیا۔ میرے لیے تجارت ایک پیچیدہ غلام گردش تھی جس کے ہر کونے میں ایک تنگ دھڑنگ کالا بھنگ ڈنڈا پکڑ کر بیٹھا تھا اور میرے قدموں کی آہٹ پا کر اس ڈنڈے کو فرش پر بجانے لگتا تھا۔

میں درخت کی اونچی شاخ پر ہاتھ نہ پڑنے کی وجہ سے لنگور کی طرح واپس اپنے ٹپے پر آ گیا۔

۲۰

میرے دفتر میں ڈاک کا ایک تودا جمع ہو کر اپنے ہی وزن سے میز پر گر چکا تھا اور اس کے اندر سے انواع و اقسام کے خط جھانک رہے تھے۔ ایک لفافہ لمبائی میں کم اور چوڑائی میں زیادہ دکھائی دیتا تھا۔ دونوں طرف بے شمار مہریں تھیں۔ کونے میں ہندوستان کا ٹکٹ چسپاں تھا اور لکھائی کافی مانوس سی تھی۔ میں نے خط کھولنے سے پہلے اسے سوچا تھا تو اس میں سے استاد باہلی کے ہاتھوں کی خوشبو آئی۔ وہ بالوں میں "کوئی" کا تیل لگا کر دونوں ہاتھوں کا کہنوں تک مسح کر لیا کرتے تھے۔ ملل کے کرتے کی آستینوں سے دن بھر دلائی سینٹ کی خوشبو آتا کرتی تھی۔

خط کھول کر دیکھا تو انہی کا تھا۔ اوپر لکھا تھا "ست نام سری واکوروست نام۔" نیچے السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ کے بعد لکھا تھا کہ ایک لمبے عرصے کے بعد تم کو خط لکھ رہا ہوں۔ شاید یہ میرا پہلا خط ہے۔ ہو سکتا ہے یہی خط آخری اور التعمی ہو۔ گورو مہراج فرماتے ہیں کہ پریم بارگ پر اگلی سفر کرنے کے لیے بروہرگ فراق اور فرقت خوراک کا درجہ رکھتے ہیں۔ پریمی سے جتنی دوری ہوگی اس قدر آنکھڑا مضبوط اور کڑا ہوگا۔

اس مرتبہ میں بیساکھی کے پیلے پر لاہور آ رہا ہوں۔ ایک سو مہینوں پریموں کا جھنڈ ہے۔ گورو دیال سنگھ ڈھلوی جتنے دار ہیں۔ میں ان کا نائب جتنے دار ہوں۔ تین دن لاہور میں رہیں گے۔ چوتھے دن حسن ابدال چلے جائیں گے وہاں سے دو روز بعد واپس ہوگی۔ پھر لاہور میں پورا ایک دن بسرام ہوگا۔ اگلے روز بعد دوپہر واکوروست نام کے راستے واپس۔ پر میں یہ سارا قائم تیرے ساتھ گزاروں گا اور تیرے پاس ہی رہوں گا۔ ہو سکتا ہے میں حسن ابدال بھی نہ جاؤں اور وہاں کے دو دن میں تیرے ساتھ لاہور ہی میں گزاروں۔ کچھ پتہ نہیں۔ آنے پر ہی حال خیریت معلوم ہوگی اور آنے پر ہی اصل پروگرام بنے گا۔"

وہ جس کیمبرے کی میں نے تیرے سے فرمائش کی تھی وہ ابھی تک نہیں مل سکا۔ ہندوستان میں ہر طرح کی اچھوت بند ہے۔ خاص طور پر رنگ راس اور پیش آنند کی چیزوں کی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ پشاور میں کوئی بازار منڈی ہے جہاں سے ہر طرح کا سودا مل جاتا ہے۔ ہم لوگوں کو لاہور اور حسن ابدال کے علاوہ اور کسی شہر میں جانے کی اجازت نہیں لیکن پچھلے پاتری بتاتے ہیں کہ بہت سے سودے دار لپنڈی تک پہنچ جاتے ہیں اور میلے کے سے میں حسن ابدال میں بھی دکانیں دلائی مال سے بھر جاتی ہیں۔ تم پتہ کر کے رکھنا شاید کوئی اچھا سا کیمبرہ مل ہی جائے لیکن ہو جرمی کا۔ یہ جو روسی کیمبرے جو من نقل میں بنے ہیں وہ نہیں لیتا۔ روسی تو خود پانچل پٹھانوں کے ہاتھوں مار کھا رہے ہیں ان کی مشینوں کا کیا اعتبار؟ گوردیال سنگھ کا بھتیجا جسونت پچھلی مرتبہ ایک روسی کیمبرہ حسن ابدال سے خرید کر لایا تھا لیکن اس میں فلم ہی نہیں چلتی۔ ہر دو فریبوں کے بعد پھنس جاتی ہے۔ بس تم پتہ کرنا اور ساری انفرمیشن اکٹھی کر رکھنا۔ باقی باتیں میرے آنے پر ہوں گی۔ جیسے جیسے یاد آتی جائیں گی کرتے جائیں گے۔ جب حکم ہو گا بھوکہ والی ساد پر واپس چلے جائیں گے شاید اس بار لمبا ہی حکم ہو۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھنا پانی سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہیں۔ چوک بھی آباد اور خوشحال ہے اور لوگ بھی رجبے رجبے سکھی اور بھاگو ان ہیں۔ سب کا دعا سلام۔ قبول صودے۔

تمہارا اور شن بھلاشی
بھائی باپلی گرنتھی

صدیوں بعد اپنے محبوب کا خط پا کر دل میں خٹک کی دھند اتر آئی۔ پران کے نام کے ساتھ گرنتھی کا لفظ دیکھ کر دل بیٹھ گیا۔ بندہ بھی کیا بے اختیار چیز ہے کہ اس کو ہر شے جب چاہے جیسا چاہے تبدیل کر کے رکھ سکتی ہے۔ اس شے میں طاقت ہونہ ہو بدھی ہونہ ہو ارادہ ہونہ ہو جائدار ہو چاہے بے جان ٹھوس ہو چاہے 'مائع' ہو چاہے گیس۔ کیسی بھی حالت میں ہو کسی بھی صورت میں بڑے سے بڑے دلوں کو بے دست دپا کر کے انگوٹھی میں سے گزار کر ان کے کھڑا کر دیتی ہے۔

پہلے مجھے انسان کی لاچاری اور بے اختیار پر غصہ آتا تھا۔ پھر جب میں خود اس حال کا محرم ہوا تو سارا غصہ گلا اور ہو گیا۔ پہلے تو میں نے مجبور انسان کو گود میں اٹھایا۔ پھر اس کی انگلی پکڑ کر بارگ کی سیر کرانے سے روش روٹی لے کر پھر تار ہا۔ جب سے اب تک میں اس کا

خدمت گار اور بیٹ میں ہوں۔ اب وہ اپنی مجبوری اور لاچاری پر روتا نہیں۔ میری طرف دیکھ کر سر جھکا لیتا ہے اور اس وقت تک چہرہ اوپر نہیں اٹھاتا جب تک کوئی دوسری آفت آکر اس کے لٹو کی ڈور نہ گھماوے۔

جب ہم پاتریوں کے جتنے کی سواگت کے لیے داہدہ بارڈر پہنچے تو وہاں سب لوگ موجود تھے سوائے بھائی باپلی کے

پاتریوں نے بتایا کہ ان کے کاغذ میں کوئی نقص رہ گیا تھا جس کی وجہ سے وہ جتنے میں شامل نہ ہو سکے۔ اب وہ باپلی ایئر آفیس گئے اور شام کی فلائٹ سے یہاں پہنچ جائیں گے۔ شکر ہے اس روز ایک فلائٹ آتی تھی۔

وقت مقررہ پر میں ایئر پورٹ پہنچا تو مجھے میٹر میوں سے اترتے لوگوں کے گردہ میں اپنے گوبر مقصود کا چھریا وجود نظر آیا۔ انہوں نے تنگ یا بچاؤ اور ملل کا کرتہ پہن رکھا تھا اور ان کے سر پر نیلی پگڑی تھی۔ چمکتی دھوپ میں میٹر می کے عین درمیان دائیں ہاتھ کو ہوا کر انہوں نے ہاتھ باندھ کر پہلے لاہور کو دائیں طرف پر نام کیا پھر بائیں طرف۔ پھر چہرہ اوپر اٹھا کر داگور واکال پر کھ سے کوئی بات کی اور آہستہ آہستہ میٹر می سے نیچے اترنے لگے۔

جب وہ سسٹم کر کر باہر نکلے تو انہیں دیکھ کر میرا رونا نکل گیا۔ پگڑی کے پیچھے سے ان کی الٹی سٹنگھی کے کیس نمایاں تھے۔ ہاتھ میں کڑا تھا۔ الٹے ہاتھ کی طرف چار پانچ انچ لمبی ایک کرپان ان کے پہلو میں لٹک رہی تھی۔ جسم جو پہلے ایک محبوب بھر دے کی طرح ذرا سا پگھلا تھا اب سیدھا ستواں اور پراعتاد نظر آنے لگا تھا۔

میں ان کے راستے میں دونوں بازو پھیلا کر کھڑا ہو گیا۔ پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر انہوں نے مجھے پہچان لیا تھا لیکن مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنی رفتار تیز نہ کی۔ اسی طرح چلتے رہے اور میرے قریب پہنچ کر بیگ زمین پر رکھ کر مجھ سے ایسے چٹ گئے جیسے اس کے بعد پھر کبھی جدا نہ ہوں گے۔

میں رونے کے ہلکے ہلکے ہنچو لے کھاتا ہوا جب ذرا تیز ہوا اور میری آواز قدرے اونچی ہو گئی تو انہوں نے میری پیٹھ تپتھاتے ہوئے کہا "بس بس۔ اس سناہر وانکا کا بکلی پھل ہے۔ اس کے ساتھ منور نجن ہو کر رہنا ہے اور اسی کی مہما کرنی ہے۔"

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اسی طرح ان کے ساتھ چلتا رہا۔ لوگ ہمارے ارد گرد سے گزرتے رہے اور حیران ہو کر دیکھتے رہے کہ ایک پاکستانی کو اس محبت اور

عقیدت کے ساتھ ایک سکھ کے حضور میں ایسی سسکیاں نہیں بھرنی چاہیے تھیں! ان کو جب میں اپنی شوخروالی سرکاری گاڑی میں لے کر شہر کی جانب چلا تو انہوں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے کہا ”پاکستان بننے کے پورے سات سال پہلے میں نے لاہور دیکھا تھا“ وہ بھی تین دن کے لیے۔ اب وہ تو یاد نہیں کہ کیسا تھا یہ صاف نظر آ رہا ہے۔“

میں نے کہا ”سر لاہور اب بہت بڑا ہو گیا ہے اور ایشیا کے چند خوبصورت شہروں میں سے ایک گنا جاتا ہے تو انہوں نے مسکرا کر سر ہلایا کہ ٹھیک ہے اور ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔“ پھر بولے ”ہم نے تو تمہارے اسلام آباد کی بڑی تعریف سنی ہے“ لوگ بڑی سوچا کرتے ہیں۔“

میں نے کہا ”جی وہ بھی ٹھیک ہے۔ اس کا حسن باغوں، بہاروں اور پہاڑوں والا ہے لیکن اس کی ثقافت کوئی نہیں۔ بنیاد آباد ہو اسے۔ پانچ چھ سو سال بعد جا کر اس کے وجود کی ڈھلائی شروع ہو گی! ابھی تو کیا کیا سا ہے لیکن ہے خوبصورت! پوچھنے لگے ”اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟“

میں نے کہا ”اپنے گھر جا رہے ہیں جہاں میں آپ کو اپنی بیوی سے ملاؤں گا۔ وہ دل و جان سے آپ کے حسد میں مبتلا ہے اور کئی سال سے آپ کا انتظار کر رہی ہے۔“

بس کر بولے ”اس سے ضرور ملیں گے لیکن اس وقت میں ان کو سلام نہیں کر سکتا۔ مجھے حکم کے مطابق سیدھے پہنچنا ہے کہ یہی جتنے دار کا حکم ہے اور اس حکم کے تحت اس نے مجھے ایک دن لیٹ آنے کی اجازت بخشی تھی۔“

میں نے کہا ”گھر سے چائے کی ایک پیالی پی کر سیدھے ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔“ کہنے لگے ”ایسا ممکن نہیں۔ مجھے سیدھے ان کی سیوا میں حاضر ہو کر بیٹھنا ہے۔ پھر جیسا وہ حکم دیں گے ان کی آگیا کا پالن کریں گے۔“

میں نے کہا ”آدھ پون گھنٹے میں کیا فرق پڑ جائے گا؟“

کہنے لگے ”بہت فرق پڑ جائے گا۔“

میں نے کہا ”فرض کیجئے جہاز دو گھنٹے لیٹ ہو جا تا پھر؟“

بولے ”یہ دوسری بات ہے اور اس کا پرمیٹ اور ہے۔“

میں نے کہا ”پھر بھی میں آپ کو پہلے گھر لے کر جاؤں گا“ پھر مزاحیہ رنجیت سنگھ پر چھوڑ کر آؤں گا۔“

بولے ”استاد کا زرنے پر حکم ہے تم اس کے خلاف نہیں جاسکتے۔“ میں نے ڈرائیور سے کہا ”گاڑی رنجیت سنگھ کی مزاحیہ کو لے چلو۔ بعد میں دیکھ لیں گے۔“

استاد مگرای نے فرمایا ”شاباش! ٹھیک کیا۔“

ان کے اس فیصلے سے میں کچھ رنجیدہ سا ہو گیا تھا لیکن نہیں چاہتا تھا کہ ان کو میرے اس رویے کا احساس ہو۔ میں نے کرید کرید کر ادھر ادھر کی باتیں شروع کر لیں جن میں زیادہ تر ان لوگوں کے حال احوال کی تفتیش مطلوب تھی جو میرے ان کے جانے پہچانے تھے۔ میں نے ان کو اس سکھ جوڑے کی تفصیل سنائی جو مجھے روم میں ملا تھا اور جس کی سردارنی بھائی بائی کی دل و جان سے عاشق تھی اور ان کے بیان بھاشن اور پانڈے پر فریفتہ تھی۔ میں نے کہا جب بھی اس کا سردار ہم کو اکیلے چھوڑ کر کچھ لینے دینے جاتا تو وہ آپ ہی کا قصہ شروع کر دیتی اور بے حد افسردہ ہو کر رونے کے قریب ہو جاتی۔

کہنے لگے ”عورتیں عام طور پر جذباتی ہوتی ہیں اور ان کی سوچ کا دائرہ شوک سوگ کے اندر ہی رہتا ہے۔ جو وجود مامتا کے دس سے بنتا ہے وہ کشت میں ہی جیون بتاتا ہے۔ اس لیے ہر عورت دکھ والی زندگی بسر کرتی ہے۔“ میں کیا کہنا چاہتا تھا اور وہ کدھر کولے گئے۔

پھر میں نے ان کو بتایا کہ وہ نوجوان جس نے ایک مرحبہ بھائی گور بخش سنگھ کی دکان سے حائل شریف چرائی تھی اور لوگوں نے پکڑ کر چوک میں اسے پھینچی چڑھائی تھی وہ آج کل واپڈاک ایک بہت بڑا افسر ہے اور مجھے اکثر ڈکر کی محفلوں میں ملتا رہتا ہے۔

استاد صاحب نے کہا ”بس ہم دونوں سے پورے جیون میں ایک ہی نیکی کا کام ہو اور ہم اس گدڑ پر دانے کے زور پر گیت پاس کر سکتے ہیں۔“

پھر وہ مجھ سے اس کا احوال پوچھنے لگے۔ اس کے گھر بار بال بچوں اور آر پرو دار کے بارے میں استفسار کرتے رہے۔ اس کے بڑے بزرگوں خاص طور پر اس کے ماسوں کی بابت پوچھا تو میں کوئی جواب نہ دے سکا لیکن انہیں یہ یقین دلایا کہ ایک روز ہم ان سے جا کر ملیں گے اور وہ آپ کو کچھ کر بہت خوش ہوں گے۔

فرمانے لگے ”نہیں بھی نہیں۔ میں ان سے ملوں گا بھی نہیں۔ آخری ملاقات کوئی خوشگوار اور روچک نہیں تھی اس لیے میں ان کے سامنے نہیں جاؤں گا۔“

میں نے کہا "کیوں؟"

بولے "شاید وہ مجھے دیکھ کر شرمندہ ہوں اور ان کو وہ سارا وقت یاد آجائے۔"

میں نے کہا "میں بھی تو ان سے ملتا ہوں۔ مجھے دیکھ کر تو وہ کبھی شرمندہ نہیں ہوتے بلکہ خوش ہی ہوتے ہیں۔ پھر ملنے کی کی آرزو کرتے ہیں۔ گلے لگا کر رخصت کرتے ہیں۔"

کہنے لگے "تمہاری اور بات ہے۔ تم نے اس وقت ان کی کم مدد کی تھی۔ میں نے اپنی حیثیت سے بڑھ کر ان کی سہاکی تھی۔ پھر پور مدد کرنے والے کو بھکاری پسند نہیں کرتا۔ لایچہ اٹھانے والا چتور سے آنکھیں چراتا ہے۔"

میں نے کہا "یہ تو کوئی منطقی نہ ہوئی اور آپ کی بات میرے دل کو نہیں لگتی۔ شاید کوئی اور وجہ ہو جس کا ذکر آپ مناسب نہیں سمجھتے۔"

دیکھی سے ہو کر بولے "اس وقت میں ان کا مدد ہی سہی تھا۔ ہم سب ایک تھے۔ اب میں ایک اور پرانا منگھ ہوں، آپ کے ساتھ کا نہیں۔ جو بھی مجھ سے ملے گا ہزاروں سوالوں میں گھرا ہو گا۔ لوگوں کو شانت رکھنا چاہیے، اذیت نہیں۔ یوں بھی ملنے ملانے میں کیا رکھا ہے۔ بس سارا کھیل تماشا ہے۔ اصل حقیقت کسی کو بھی معلوم نہیں۔"

تھوڑی سی دیر میں ہم رنجیت سنگھ کی مڑھی پر پہنچ گئے۔ سارے پلازی اندر میں جمع تھے اور بھوک ڈالا جا رہا تھا۔ دو مقامی گرنٹھی گرنٹھ صاحب کا ہاتھ کر رہے تھے اور باہر سے آئے ہوئے سنگھ اور سکھیاں بڑی شرما کے ساتھ ہاتھ سن رہی تھیں۔ کچھ لوگ باہر مچھ میں اور برآمدوں میں کھڑے تھے اور بے معنی قسم کے انتظامی امور کی مچھلیاں سلجھا رہے تھے۔ یہ لوگ زیادہ تر پٹوار دیہات سے آئے تھے اور ان کے ساتھ افغانستان کے سنگھ بھی شامل تھے۔ یہ آپس میں پنجابی بولتے تھے لیکن جب کسی بات پر جھجھ پڑ جاتے تو خفا کی قسم کی پشتو بولنا شروع کر دیتے۔ افغانستان کے فارسی بولنے والے سنگھ نرم دل، نرم زور اور نرم گفتار تھے لیکن ان کی بیویاں جب گھڑی کی رسی کھول کر مطلوبہ شے برآمد نہ کر سکتیں تو وہ بھی دوسرے سنگھوں جیسے ہو کر اونچے اونچے بولنے لگتے اور فارسی کے بجائے پشتو میں دیکے مارنے شروع کر دیتے۔

اتنے سال بعد اتنے سارے سنگھوں کو اکٹھا دیکھ کر مجھے اپنا لڑکپن اور چوٹی کا زمانہ یاد آ گیا۔ میں نے یہ سارا وقت سنگھ گھروں اور سنگھ گھرانوں میں گزارا تھا۔ ان کے بڑے بزرگوں سے ہر طرح کی سکھائی تھی اور ان کی عورتوں کی نرم مزاجی سے بڑے فائدے

اٹھائے تھے۔ پھر اچانک یہ نہیں ان کو کیا ہو گیا تھا کہ ہندوستان کی تقسیم کے وقت انہوں نے سارے پرانے تعلقات پر کبیر پھیر کر انہی لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا تھا جنہیں انہوں نے اپنی گود میں بٹھا کر چوریاں کھلا کھلا کر پالا تھا۔ میں اپنے دشمنوں کو اپنے شہر میں اپنی نگاہوں کے سامنے دیکھ کر حیران ہو رہا تھا کہ ان کو بخش دیا جائے یا ان سے پرانے کرموں کا بدلہ لے کر اسی وقت نیست و نابود کر دیا جائے۔

بھائی باہلی کو بہت سی سکھوں نے پہچان لیا اور وہ بھاگ کر ہمارے گرد جمع ہو گئیں۔ ان کے ساتھ کچھ مرد بھی تھے جنہوں نے بھائی باہلی کے بارے میں سن رکھا تھا مگر انہیں دیکھا نہیں تھا۔ انہوں نے ہاتھ باندھ کر میرے استاد سے ہنسی کی کہ وہ انہیں دھارمک بھاشن دیں اور سری گورد گر تھ صاحب سے گرنٹھ کنڈ کی کوئی ہائی سائیں۔

بھائی باہلی نے کہا "اس وقت اندر کھنڈ پانٹھ ہو رہا ہے اور ایسے وقتوں میں دھارمک بھاشن کا کوئی سے ہی نہیں چاہے گرنٹھ کنڈھی سے ہی کیوں نہ ہو۔" لیکن انہوں نے استاد مکرم کی کوئی بات نہ مانی اور جھوم جھوم کر احتجاج سا شروع کر دیا۔ اس احتجاج میں عورتیں پیش پیش تھیں اور استاد صاحب کو دونوں بازو پکڑ کر آگے کو کھینچ رہی تھیں۔ وہ نہ نہ کرتے ہوئے بڑی آہستگی کے ساتھ ان کی کھینچ میں لپٹے چلے آ رہے تھے اور بڑی شریطانہ سی مزاحمت کر رہے تھے۔

بزرگ سنگھ کہہ رہے تھے "بس شیخ منٹ کی بات ہے۔ اس برآمدے میں کھڑے ہو کر آپ کی بات سن لیں گے اور من پر سن کر لیں گے۔ روز روز تو آپ کے درشن ہونے نہیں اور روز روز آپ نے ملنا نہیں۔ ایک بار من توش ہو گیا تو یہ کوڑا پر ادلا سے بھرا جہنم کھل ہو جائے گا۔ آپ کا کچھ جانا نہیں ہماری زندگی من جانی ہے۔"

عورتوں نے ان کو برا آمدے میں لا کر کھڑا کر دیا اور چار پانچ بڑی عمر کی خوبصورت سکھوں نے ہاتھ اوپر اٹھا کر نعرہ مارا "داہورو کا خالہ۔ داہورو کی رنج۔" مردوں نے اپنی بھاری اور گھمبیر آواز میں کہا "جو یوں سو نہال۔ ست سری اکال۔"

بھائی باہلی گرنٹھی اپنے صاف شفاف کھدو کے پاچامے اور کھدو کے چست کرتے میں ان کی طرف بڑھے اور برآمدے کے ستون کے ساتھ ڈھونڈا کر کھڑے ہو گئے۔ پہلے تو ان کے بودے کھلے ہوا کرتے تھے اور کندھوں تک آتے تھے پھر انہوں نے گیسو رکھ لیا اور بڑے سنگھ کے بجائے چھوٹی چٹکیوں سے گیسو سنوارنے لگے لیکن اب ان کے سر پر نیلی

چکوی تھی جس نے ان کے کیسوں کو مضبوطی سے جکڑا ہوا تھا۔ یہ بگڑی کلف لگی نہیں تھی۔ اکالیوں کے انداز کی تھی لیکن اس کا رنگ گہرا نیلا نہیں تھا۔ بس نیلا تھا۔ اس رنگ میں ان کی اپنی مرضی شامل تھی۔ اس کی کوئی دھار تک وجہ نہیں تھی۔

انہوں نے ستون کے ساتھ ڈھونڈ کر پہلے تو ہاتھ باندھ کر اوپر کی طرف اشارہ کیا پھر بندھے ہوئے ہاتھ پاتریوں کی طرف گھما کر سب کو پر نام کیا۔ کچھ مرد اور عورتوں نے اونچی آواز میں کیر تن کا کوئی شہد اٹھایا لیکن ان سب کی آواز بھائی بائی مگر تھپی کی واضح اور شفاف آواز میں ڈوب کر رہ گئی۔

پہلے انہوں نے اسی طرح ہاتھ باندھے الحمد شریف کی قرابت کی اور پھر گورو گرنتھ صاحب سے محلہ ایک کی بھیدیاں سے راگ مار دکا انتخاب کیا۔ یہ گورو نانک دیو کی کاکام تھا اور اپنے بچن بیان کی بدولت بہت اونچے درجے کی چیز تھا۔ راگی اور ربانی اسے بار مونیہ اور طبلے کی سنگت کے بغیر نہیں گاتے تھے لیکن میرے مرشد کوا اللہ نے ایک ایسے کمال سے نواز تھا جس کا کوئی نام تو نہیں تھا البتہ اس کے اندر مگن سارے موجود تھے۔ ماری 'روحانی' نفسی' خلقی تزلو کی 'جہانی' جادوئی 'فکلی' نہیں اور فریادی۔

انہوں نے مدھم تہہ کی پکار میں کہا۔

کھ بوحتا لادیا دیا سمندھ تمھار
کندھی دس نہ آونی نہ آرا نہ پار
دنجھی ہتھ نہ کھینو مل ساگر آسراں
بابا جگ پھاتا مہاجاں
گورو پر سادی ابرے سچا نام سنبھال

کہنے لگے یہ شری گورو نانک صاحب پہلی بادشاہی کا شہد ہے۔ آپ دنیا کی اوستا بیان کرتے ہیں سنئے اور بچانے کے لائق مضمون ہے۔

مہراجی فرماتے ہیں کہ اس دنیا کا ہر ایک جو من روپی کشتی میں بیٹھا ہوا ہے لیکن جب تک روح پار برہم میں نہ جائے 'تینوں گن' تینوں شریر بچیں پر کرتی 'من' ناپا سے آزاد نہیں ہوتی۔ اس وقت روح من کے ماتحت ہے۔ ہم رشتے بناتے اور دنیا کے کام من کے کہنے پر کرتے ہیں۔ گویا ہم من کے کہنے پر سنسار سمندر میں بہتے جا رہے ہیں۔ سمندر کیسا ہے جس کا نہ درے کا کنارہ صبح ہے نہ پرے کا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا یہ دنیا کب سے بنی ہے۔ کئی پرے

مہاجر لے ہوئیں اور کئی ہوں گی۔ گورو نانک صاحب فرماتے ہیں:-

"تھت وار دنا جو گی جانے کرت ماونہ کوئی + جا کر تاسر ملی کو سا ہے آپ جانے سوئی"

یعنی نہ جو گیوں کو پتہ ہے نہ کسی اور کو پتہ ہے جس مالک نے یہ سرشتی بنائی ہے 'وہی جان سکتا ہے۔ ہم یہاں کروڑوں جگہوں سے آئے ہوئے ہیں۔ اگر راستہ ملا ہوتا تو یہاں نہ بیٹھے ہوتے۔"

گورو نانک جی مہراج فرماتے ہیں کہ دنیا کے جہازوں کے ساتھ کپتان ہوتے ہیں۔ دریاؤں والی کشتیوں کے ساتھ ملاج ہوتے ہیں جو بانس ڈال کر کچھ لیتے ہیں کہ پانی کتنا گہرا ہے مگر ہماری کشتی کے ساتھ نہ کوئی ملاج ہے نہ ملاج کے ہاتھ میں بانس ہے۔ کروڑوں جگہ ہو گئے 'ہماری کشتی' سمندر سمندر میں ڈگمگاتی پھرتی ہے۔ اگر ادھر سے ہوا آئی 'ادھر چلی گئی۔ ادھر سے ہوا آئی 'ادھر چلی گئی۔ کروڑوں جگہ بیت گئے۔ بے شمار قوموں کی قومیں 'مدہیوں کے مدہب اس میں غوطے کھا رہے ہیں۔ دچار کر دیکھو

بابا جگ پھاتا مہاجاں

گورو نانک دیو جی فرماتے ہیں کہ افسوس کل عالم مہاجاں میں پھنسا ہوا ہے۔ رحم کون کھاتے ہیں؟ جو اس جیل خانے سے نکل کر داگورو سے مل چکے ہوں۔ وہ داگورو کے پیچھے ہوئے آتے ہیں اور ہم پر ترس کھاتے ہیں اور آکر بتاتے ہیں کہ:-

گورو پر سادی ابرے سچا نام سمھال

یعنی وہ اگر یہ سمجھاتے ہیں کہ بھائی تیرے اندر سچا نام ہے۔ تو کچھ نہ کرنے قوم چھوڑ نہ نہ ہب 'نہ کام کاج چھوڑ نہ بال بچے چھوڑ۔ بس اپنے آپ کو اس سچے نام کے ساتھ جوڑ دے۔ اب سوچو سچا نام کون ہے؟ ہر مذہب ہر قوم اور ہر فرقہ اپنے اپنے نام کا دعویٰ کرتا ہے۔ کوئی اسے کلام الہی اور بانگ آسمانی کہتا ہے۔ کوئی اسے "ورڈ" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ کوئی بھگوان 'رام کہتا ہے لیکن خود خدا اور سچا نام اندر ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ملتا کیونکہ ساری خدائی نے آنکھوں کے پیچھے پردہ لگا کر اسے باہر نکالا ہوا ہے لیکن جب تک گورو کے پاس نہیں جاؤ گے کچھ نہیں ملے گا۔ گورو کے ساتھ ہو تو اندر جانے کے لیے اور شہ رگ تک پہنچنے کے لیے سیدھی جرنیلی سڑک ہے۔ گورو تیار ہے۔ وہ کہتا ہے اکیلا نہ جاؤ میں تیرے ساتھ چلوں گا۔ بس تو دروازے چھوڑ دے میں تیرے ساتھ ہوں 'تیری رہنمائی کروں گا اور تجھے نام کے ساتھ جوڑ کر آؤں گا۔ یہ نام کیا ہے؟ اس کا جن سادھارن سے کیا تا ہے اور

گوروناک دیو جی اس نام کو کیا مانتا دیتے ہیں؟

سب نے اونچی آواز میں سر پہلے انداز اور یقین کی لے میں کہا۔

ناک نام جہاز ہے چڑھے سواترے پار

پھر میرے استاد نے میری طرف دیکھا۔ میں سامنے کی دیوار سے ڈھونگ کر بیڑاری کے انداز میں کھڑا تھا اور مسلسل ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ آج کی بات نہیں تھی پہلے دن کا قصہ تھا۔ جب میں نے ان کو اپنے چوہارے پر کلا رٹ بجاتے سنا تھا اور میں بے اختیار ان کی سیڑھیوں پر چڑھ کر اُدھے راستے میں کھڑا ہو گیا تھا۔

مجھے ان کی بانج تو صاف سنائی دے رہی تھی ان کا ایک طرف کا پہلو بھی تھوڑا تھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اگر میں لڑکی ہوتا تو ماہر ہالی سے شادی کر لیتا یا ان کو احوال کر اپنے ساتھ کسی اور ملک میں لے جاتا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ کیفیت صرف میری ہی نہیں تھی وہاں کی جتنی دلفریب اور دلدار قسم کی لڑکیاں تھیں اور جو راہ چلتے ہوئے اپنی سہیلیوں سے اونچا ٹھٹھول کر تے گزرتی تھیں ان سب کے دل میں اس کرشن کہنیا کی ایسی ہی مورت تھی۔

مرد گن دان ہو ستواں ہو۔ سیدھی راہ چلتا ہو۔ عورت پر لہلوٹ نہ ہوتا ہو۔ سفید کپڑے پہنتا ہو۔ تیز خوشبو نہ لگاتا ہو۔ حقیر اور کھلے دل کا ہو۔ چھینید نہ ہو۔ لالچی کا چھلکا چھٹاتا ہو۔ مونالیزا جیسی مسکراہٹ رکھتا ہو۔ کسی کے آواز دینے پر رک جاتا ہو۔ پیچھے مڑ کر نہ دیکھتا ہو۔ تجارت قدم قدم گیر اور دست برس ہو۔ ناک جھانک کا عادی اور نشے کا مستلاشی نہ ہو۔ ایسے مرد پر عورت ہزار جان سے فریفتہ ہو جاتی ہے اور اس کا نقشہ مرتے دم تک اس کے ذہن سے معدوم نہیں ہوتا۔

مجھے پتہ نہیں کہ تک ان کا بھاشن ہوتا رہا اور کب تک مرد عورتیں بوڑھے بچے ان کی شگت میں گرو آلود فرش پر بیٹھے رہے۔ جب میں نے اپنے لیے خواب سے نکل کر ان کی طرف دیکھا تو گہری شام ہو چکی تھی اور وہ آخری جملوں میں راگ مارو محلہ ایک سلاپت کر رہے تھے۔

ان کا بھاشن ختم ہونے پر سب نے مل کر ایک زوردار غور لگایا۔ واگور و جی کا خالہ واگور و جی کی سچ۔ جو بولے سو نہال۔ ست سری اکال۔

لوگ اٹھ اٹھ کر ہاتھ باندھ کر ان کے گھٹنوں اور چرنوں کو چھوتے رہے اور وہ انہیں

منع کرنے کی زحمت کا بوجھ اٹھائے بغیر ایک مٹیو سہاں کھڑے رہے۔ جب لوگ چھٹ گئے تو وہ آہستہ آہستہ میری طرف آئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولے "اب کیا حکم ہے؟"

میں نے کہا "میں کیا حکم دے سکتا ہوں سرکار۔ ایک عرض ہے کہ آج آپ میرے ساتھ چلیں۔ میرے غریب خانے پر قیام فرمائیں اور صبح ناشتہ کر کے واپس آجائیں۔" کہنے لگے "کل صبح ہمیں حسن ابدال روانہ ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "مب روانہ ہونا ہے میں ٹھیک وقت پر پہنچا دوں گا۔۔۔ آخر میرا بھی تو کوئی حق ہے۔"

فرمانے لگے "کیوں نہیں کیوں نہیں شغالی۔ اول حق تمہارا ہے اور تمہارا ہی رہے گا۔ کچھ مجذریاں راہ میں آجائیں تو حق تلف نہیں ہوتا تو قی طور پر بوجھ تلے آجاتا ہے۔ چلو میں تیار ہوں!"

ان کی یہ بات سن کر میرے وجود کے اندر چاندناں سا ہو گیا اور میں نے چپک کر کہا "آپ کا سامان؟"

بولے "ایک بیگ ہے۔ وہ سینوار کے پاس رہے گا مجھے اس کی ضرورت نہیں۔"

جب ہم گھر پہنچے اور میں نے اپنی بیوی سے ان کا تعارف کرایا تو اس نے کچھ خوش دلی سے ان کا استقبال نہ کیا۔ مجھے اس بات کی ہرگز توقع نہ تھی۔ انہیں اس پر تاؤ کا یقین تھا۔ مسکرا کر کہنے لگے ”شفائی آپ کی بڑی تقریریں کرتا تھا لیکن مجھے اس کی بات کا کچھ ایسا یقین نہیں تھا۔ اب جو آپ سے ملا ہوں تو بات شیشہ ہو گئی ہے۔“

یہ کہہ کر وہ دروازے کے کمرے میں میری بیوی اس کے جواب میں کوئی روایتی نام نہ نہ کرے لیکن وہ اسی طرح چپ گڑب ناراضہ کی طرح صوفے پر بیٹھی رہی۔ استاد محرم نے اچھے سجاؤ اور خوش خلقی کی چند اور باتیں بھی کہیں لیکن میری بیوی نے ان کا کوئی خاطر خواہ جواب نہ دیا۔ ان کی طرف منہ اٹھا کر کہنے لگی ”گور و جی میں کھانے کا بندوبست کرتی ہوں“ آپ ان سے باتیں کریں۔“

مرشد نے ”مہربانی۔ شکریہ شکریہ“ کہہ کر اور اس کے اٹھنے کے ساتھ دروازہ اٹھ کر عزت افزائی کے انداز میں ”بس جی زیادہ“ کھینک نہ کرتا۔ میں رات کو تھوڑی روٹی کھاتا ہوں۔“

میری بیوی نے ان کی اس بات کا کوئی جواب نہ دیا اور اٹھ کر اندر چلی گئی۔

میں نے استاد محرم سے کہا کہ اگر وہ دروازہ پر کمر سیدھی کرنی چاہتے ہوں تو ساتھ کے کمرے میں اپنے بستر پر دراز ہو لیں۔ میں کھانا لگتے پر انہیں اطلاع کر دوں گا تو انہوں نے کہا ”نہیں“ انہیں اس کی چنداں ضرورت نہیں۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہوں اور مزے میں ہوں۔ یہیں بیٹھتے ہیں۔“

میں نے کہا ”سرکار ایک بات رہ رہ کر میرے دل میں اٹھتی ہے لیکن مجھے پوچھنے کا حوصلہ نہیں پڑتا۔ نہ پوچھ سکتا تو دل پر عمر بھر کا بوجھ رہ جائے گا۔ آپ کا مقام اونچا ہے، میری

ذات چھوٹی ہے۔۔۔۔۔“

کہنے لگے ”تخت پور کے ساتھ میرا جینا مرنا ہے۔ اس کو میں چھوڑ نہیں سکتا کہ وہاں پر میرا باپ دفن ہے اور وہ بہت ہی بزدل اور بودا انسان ہے۔ دراز راسی بات پر ڈر جاتا ہے۔ گھبرا جاتا ہے۔ یوں بھی ہم بھترے لوگ دل کے نرم ہوتے ہیں۔ محرم کے مارے ہوتے ہیں۔ وہ تو بہت ہی بزدل اور خوف کا مارا تھا۔ میں اس کو چھوڑ نہ سکتا تھا۔ چھوڑ نہ سکتا تھا تو ایک روز بلوائیوں نے چوک میں پکڑ لیا کہ یا تو سکھی دھرم اختیار کرو، نہیں تو تخت پور چھوڑ کر اپنی مسلمانی دھرتی پر چلے جاؤ۔ ہم بیچہ کو زیادہ دیر یہاں رہنے نہیں دیں گے۔ میں نے کہا ”لاؤ پر شاہ چمک لیتے ہیں۔“ انہوں نے کہا کڑا بھی پہننا پڑے گا میں نے آستین اوپر اٹھا کر کہا کڑا تو میرے مرشد نے کب کا ڈالا ہوا ہے۔ جھنجھلا کر بولے ”کیس بھی رکھنے پڑیں گے! میں نے کہا میں نے دو مہینے میں گیسو آپ دراز ہو جائیں گے۔ تم فکر کیوں کرتے ہو۔“

”اس طرح آپ نے سکھی دھرم اختیار کر لیا۔“ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

بولے ”بالکل اس طرح۔ عین اسی طرح۔ میں نے سکھی دھرم اپنا لیا۔ اگر ان کو اس بات کی خوشی تھی تو میرا اس میں کیا جاتا تھا۔“

میں نے کہا ”آپ تو پہلے بھی گور و دارے جا کر اور اس کرتے رہے تھے۔ پھر اس کی کیا ضرورت تھی۔“

میں نے کہنے لگے ”مجھے تو نہیں تھی لیکن ان کو شاید تھی“ اس لیے انہوں نے چوالا بدلنے پر زور دیا۔“

میں نے کہا ”آپ کے والد تو خود رہا بنے تھے پھر انہوں نے یہ کیا حرکت کی کہ آپ کو مجبور کر دیا۔ بھائی بانی کہنے لگے ”ہم اصل کے خاص رہا بنے ہیں اور بھائی مردانہ سے ہمارا نکھالی رشتہ ہے۔ سکھی دھرم تو بابا کی مسکنت میں ہماری وجہ سے پھیلا۔ سکھوں نے ہم کو ہی سکھ بننے کا حکم دے دیا۔ ہم نے ان کا حکم مان لیا کہ چلو یوں ہے تو پھر پوئیں سکھا۔“

میں نے دیکھی ہو کر کہا ”آپ نے کیوں مانا ان کا حکم۔ وہ کوئی آپ کے حاکم تھے۔“

کہنے لگے۔ ”ان کی اچھیا تھی ہم نے پوری کر دی۔“

میں نے کہا ”کیوں پوری کر دی؟ کیا آپ ڈر گئے تھے؟“

بولے ”اٹنی جب سو رکھ ہو تو اس کی اچھیا پوری کرنی ہی چاہیے۔ بالکل“ مہلا اور ہٹی کی

اچھیا پوری کرنے میں ہی پڑنا ہے۔“

وہ صوفے پر اکڑوں بیٹھے تھے۔ دونوں ہاتھیں زانوں پر تھیں اور دونوں ہاتھوں کی انگلیوں میں کنگھی ڈالی ہوئی تھی۔ میں ان سے اس سلسلے میں کچھ اور نہ پوچھ سکا۔ اصولاً مجھے پہلے بھی نہیں پوچھنا چاہیے تھا مگر میں نے حماقت کر لی تھی اور اب اس حماقت پر پریشان تھا۔ انہوں نے میرے دل کا بوجھ اور طبیعت کی پشیمانی دور کرنے کے لیے ادھر ادھر کے سوال کرنے شروع کر دیے جن میں زیادہ تر میری مالی اور اقتصادی زندگی کے متعلق تھے اور جن کی تفصیلات سن کر وہ ایک بزرگ استاد کی طرح خوش ہو رہے تھے۔

کھانے کا اعلان ہوا تو ہم کھانے کی میز پر پہنچ گئے۔ میری بیوی نے میری کوشش کے باوجود کھانے میں ہمارا ساتھ نہیں دیا اور بڑی چالاکی کے ساتھ گرم گرم چیزیں باورچی خانے سے لاتی اور لے جاتی رہی۔ اس کے رشتے کے ایک ماسوں جو اتفاق سے لاہور آئے ہوئے تھے وہ ہمارے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھے لیکن انہوں نے بھی نیلی پگڑی والے ایک دھان پان سکھ کو اپنے سامنے دیکھ کر نظریں جھکا لیں اور ایک لفظ بولے بغیر غراپ کھانا کھاتے رہے۔

جب ہم واپس ڈرائنگ روم میں آئے تو میں نے کہا ”اب آپ چل کر لیٹ جائیں۔ دن بھر کے تھکے ہوئے تھے۔ شام کو ان سوداگیوں نے اور تھکا دیا۔ کل آپ کو حسن ابدال بھی جانا ہے۔ میرا من تو لالچی ہے۔“

”میرا من بھی ایسا ہی لو بھی ہے۔“ انہوں نے بات کاٹ کر کہا ”تھوڑی دیر بیٹھتے ہیں“ جب تم کو فیند ستانے لگے تو اٹھ کر چلے جانا۔“

میں نے کہا ”آپ کی سنگت میں تو میں چالیس راتیں جاگ سکتا ہوں لیکن مجھے آپ کا خیال ہے۔“

فرمانے لگے ”میرا خیال نہ کرو ہم تو ان مت لوگ ہیں۔ کوئی نہ ہو تو اپنے آپ سے باتیں کر کے ہی وقت گزار دیتے ہیں۔ ہمارے لیے تو دن اور رات ایک ہیں۔“

میں نے کہا ”آپ کا فرمان ہے تو میں بھی بیٹھا ہوں بلکہ مجھے تو بہانہ مل گیا ہے۔۔۔۔۔ آپ پاؤں اٹھا کر اس چوک پر رکھ لیں۔“

کہنے لگے ”ہمارے دھرم میں چوکی کا بڑا اسم مان ہے۔ گوروں کی آسنی سے اس کا اونچا مقام ہے۔ ہم اس پر چیر رکھنا تو کیا اس پر بیٹھ بھی نہیں سکتے۔“

میں نے کہا ”سراہو جو آپ نو دروازوں کی بات کر رہے تھے وہ کیا تھا۔ میں نے پڑنا لگا

کر دیکھا وہاں بارہ درزی کے بارہ دروازے تھے۔ مڑھی کے ساتھ درزی تھی۔ اندر جانے کا ایک بڑا دروازہ تھا۔ مجھے نو دروازوں کی سمجھ نہیں آئی۔“

میں نے کہا ”ہمارا روحانی سفر جیروں کے تلووں سے لے کر سر کی چوٹی تک دو حصوں میں بٹا ہوا ہے۔ اس سفر کی دو منزلیں ہیں۔ ایک آنکھوں تک ہے اور دوسری آنکھوں کے اوپر ہے۔ ہمارے جسم کے اندر من اور روح کی جو جگہ ہے وہ ہماری آنکھوں کے پیچھے ہے۔ فقرا سے غلط سوید اکہہ کر بیان کرتے ہیں۔“

میں نے کہا ”سوید اودل کے اوپر ہوتا ہے۔ گناہوں کی کثرت سے اس کی سیاتی بڑھتی جاتی ہے اور جب انسان۔۔۔۔۔“

انہوں نے میری بات کاٹ کر کہا ”وہ شاعروں کا سوید ہے۔ صاحب حال فقیروں کا سوید اودلی ہے جس کا میں ذکر کر رہا ہوں۔ رشیوں منیوں نے اس کو شوہتر یادو یہ چٹکھ کہہ کر بیان کیا ہے۔ گورو نانک دیو جی اس کو تل یا تیسرا قل کہتے ہیں۔۔۔۔۔ اگر ہم کو کوئی بات بھول جائے یا کسی بات کو یاد کرنا ہو تو ہمارا ہاتھ قدرتی طور پر خود بخود ماتھے پر ٹک جائے گا اور ہم ماتھے پر انگلی بجا کر یا ہاتھ تھپتھا کر اسے یاد کرتے ہیں۔“

پھر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا ”کسی بھولی بھری چیز یا کسی بھولے بھرے واقعے کو یاد کرنے کے لیے ہم گھنٹوں پر یا بیٹ پر یا لالٹوں جیروں پر ہاتھ مار کر یاد نہیں کرتے۔۔۔۔۔ آنکھوں کے درمیان پیچھے کی جگہ کا ہمارے سوچنے سے بڑا گہرا تعلق ہے۔ ہر ایک خیال یہاں سے اتر کر نو دروازوں کے ذریعے ہماری دنیا میں پھیل جاتا ہے۔

میں حیرانی سے ان کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے ایک مرتبہ پھر وضاحت کرتے ہوئے کہا ”ہمارا خیال تیسرے تل سے اتر کر لمحہ بہ لمحہ ساری دنیا میں پھیلا جاتا ہے اور من ایک سیکنڈ کے لیے بھی آنکھوں کے پیچھے نہیں ٹکنا اور جتنا عرصہ یہ آنکھوں کے پیچھے نہیں ٹکنا اتنا عرصہ یہ من اپنے گھر ترکلی میں جا کر نہیں سہا سکتا۔“

ان کی یہ بات میری گرفت میں اس لیے نہ آسکی کہ میں ابھی تک نو دروازوں کے بارے میں سوچ رہا تھا اور ان سے پوچھنے کی مجھ میں ہمت نہ تھی لیکن اُسٹو بھی فہم کا ایک خاص مقام رکھتے تھے۔ میرا ہاتھ پکڑ کر بولے ”ہمارے شری کے اندر نو دروازے ہیں۔ پاؤں سے شروع کر کے اوپر کو آتے ہیں تو ناگوں کے اوپر دانوں کے درمیان دو دروازے ہیں۔

یہاں سر پر کھلا پڑا ہے۔“

ان کا یہ بات سن کر میں کہنے میں آگیا۔

فرمانے لگے ”کب اوپر چلو تو نہ پیٹ میں کوئی دردوازہ ہے نہ سینے میں نہ چھاتی میں۔ گردن بھی بند ہے اور مٹیوٹی سے اپنی جگہ قائم ہے۔ اوپر چلیں تو ایک اور دردوازہ ہے۔ منہ اوہن! منہ کر بولے ”دریدہ وہن“ ہر وقت کھلا ہر وقت بولتا ”سنتا“ اگلتا ہوا کہتے ہو گئے!“

میں نے کہا ”تین!“

فرمایا ”اب آگے دو اور ہیں۔ ناک کے تھنے تین اور دو پاؤں۔ ان پانچوں کے ساتھ چہرے کے دونوں جانب پہلوؤں پر دو کان ہیں، کھلے کواڑ۔ کہتے ہو گئے؟“

”سات“ میں نے کہا۔

اور ان کے اوپر دو آنکھیں ہیں۔ کسی کی کالی سیاہ، بھوڑا آنکھیں، کسی کی بھوری، شری کسی کی نیلی کنگھی۔ سات اور دو نو ہو گئے۔۔۔۔۔ تو اس سر پر کے اور اس دیبہ کے نوروازے ہیں اور ان نوروازوں سے ہمارا خیال ساری دنیا میں پھیلتا ہے اور ساری دنیا کے دچار اور کھیل قماشے ان نوروزوں کے ذریعے ہمارے وجود میں داخل ہوتے رہتے ہیں۔۔۔۔۔ آپ کیسی بھی اندھیری کوٹھڑی میں جا کر کیوں نہ بیٹھ جائیں، کہتے ہی تالے کو ٹھڑی کو لگے ہوں ہمارا من وہاں نہیں ہو گا۔ سر پر کو چھوڑ کر ساری دنیا میں باہر پھیلا ہو گا۔

یہ جو ہمارے من کو دلیلیں دینے کی اور سوچنے کی عادت پڑی ہے اور جس جس طرح سے ہم خیال کی میٹر می اور دچار کی کندیں لگا کر ہر وقت باہر گھومتے پھرتے ہیں۔ مہاتما لوگ اس کو سرن کرنا کہتے ہیں۔ خیال شکل کا روپ دھار کر اور دچار چتر بنانا کر گہیاں گھمنا تار پتا ہے۔ سرن کرنے کی ہر انسان کو قدرتی طور پر عادت پڑ چکی ہے اور جس کی ہم سرن کرتے ہیں اس کی شکل ہماری نظروں کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔ اگر بچوں کی سرن کرتے ہیں تو ان کی شکل ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے۔ اگر دوہن دولت کی سوچ کرتے ہیں تو اس کے اہار نظروں میں چھوٹے لگتے ہیں۔ اگر گھر کے کاروبار کا خیال آتا ہے تو گھر کے کاروبار آنکھوں کے آگے بھرنے لگتے ہیں۔ گیانی لوگ اس کو دھیان کرنا کہتے ہیں۔

اب گورو مہاراج ہم کو سمجھاتے ہیں کہ بھائی بندیا اسرن اور دھیان کی عادت تو تم کو قدرتی طور پر پڑ چکی ہے اور تم اس سے بندھ چکے ہو تو پھر اس قدرتی عادت سے غاکہ اٹھاؤ

..... دنیا کی فانی اور مٹ جانے والی چیزوں کا سرن کر کے ہم ان سے پیار محبت ڈالے بیٹھے ہیں اور ان میں سے کسی نے ہمارا ساتھ نہیں دینا تو پھر کیوں نہ ہم اس مالک کے نام کا سرن اور دھیان کریں جو کبھی فنا نہیں ہوتا اور جس کی طرف ہم کو بالا خر لوٹ کر جانا ہے اور جس کی حضوری میں ہم کو ابدیت کا جگ بٹانا ہے۔

پھر انہوں نے رک کر میری طرف دیکھا اور کہنے لگے ”گیانی گر تھی بھی شہدوں کا مارا ہوا ہوتا ہے۔ اس کو اس مارگ کے سوا اور کسی راہ کا علم نہیں ہوتا۔ بتاؤ مجھے بتاؤ سوجے۔ اسی راہ پر بھاگنے لگتا ہے۔ میں بھی ابھی سو رکھوں کی طرح اس بات پر چل نکلتا..... چلو کوئی اور بات کریں!“

”ناں ناسرناں“ میں نے چلا کر کہا ”اور باتیں تو اوروں سے بھی ہو سکتی ہیں، پر یہ چکی تو آپ سے ہی مل سکتی ہے۔ مجھے تو اس دن کا بڑی دیر سے انتظار تھا کہ دنیا داری کی سرن کو کس طرح چھوڑا جائے اور اس اشباک سے کیسے نکلا جائے؟“

انہوں نے مجھے اس استفسار میں سنجیدہ جان کر کہا ”دیکھ غفائی! ہمیں سرن کرنے کی اور خیال کی تکرار کی عادت تو قدرتی طور پر پڑی ہوئی ہے اور اس روز میں دنیاوی دنیا سائی ہوئی ہے۔ اب اس کو ذرا سا پھسلا کر اور ہلیات کھسکا کر چھوٹا سا کاغذ بنا لیا ہے۔ اس سرن میں دنیا کی جگہ مالک کے نام کو من میں لگاتا ہے۔ اگر ہم اس مالک کے نام کا دھیان اور سرن کریں جو کبھی فنا نہیں ہوتا تو ہمیشہ کے لیے ہم ان منہاری بندھنوں سے چھوٹ جائیں۔“

لیکن یہ ہو کس طرح ہے؟“ میں نے پوچھا ”اس کی ملٹیکس اور اس کی ڈرل کیا ہے اور کون طریقہ اپنا کر اس سرن کا رخ موڑا جاسکتا ہے۔“

انہوں نے کہا ”پہلے تو اپنے وجود کے نو کے نوروازے بند کرنے ہیں۔ من کو شانت کر کے آنکھ کے پیچھے اپنے خیال کو نکالتا ہے۔ پھر اس مالک کی سرن کر کے اپنے پھیلے ہوئے خیال کو سٹاکر آنکھوں کے پیچھے یکسو کرتا ہے۔“

میں نے کہا ”حضور بھی تو مشکل عمل ہے جس کے آگے بڑے بڑے فقیر اور صوفی عاجز ہیں۔“ جھٹ سے بولے ”ناں ناسرناں! یہ تو اتنا سادہ اور آسان طریقہ ہے کہ بچے سے لے کر بوڑھے تک سب اس کو آسانی سے کر سکتے ہیں۔“

”لیکن.....“ میں نے بات کاٹ کر کہا تو انہوں نے بھی اسی قدر زور سے کہا ”لیکن من اس جگہ نکلتا اور ٹھہرتا نہیں۔ اس کو بار بار نوروزوں سے باہر دوڑنے کی عادت پڑی

ہوتی ہے۔ کوشش کے باوجود کھٹاک سے بھاگ جاتا ہے۔ کوئی دید کا مشتاق ہے، آنکھیں سینکنے کا شوق ہے۔ انگارے کا شوقین ہے، آنکھوں کے کواڑ کھول کر باہر کو چاہے گا۔ کسی کو آواز سے لگاؤ ہے۔ سر سے عشق ہے۔ درد بھری بات سننا چاہتا ہے، آواز دے کر جواب مانگتا ہے۔ کافوں کے دروازے کھول کر سڑک پر آگیا ہے۔ اب کون اسے اندر لے جائے اور واپس لے جا کر یکسو کرے۔ پھر زبان کا چمکا ہے۔ بول نہیں کاذاقت ہے۔ ہونٹوں کی تپش ہے اور اب دین کی کشش ہے۔ ایک بار دروازہ کھول دیا تو سارا وجود باہر آگیا۔ گلی میں آوارہ گروی کرتے کرتے شجر کے دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

اسی طرح پاشا ہے۔ بوئے عیران ہے۔ بدن کی خوشبو ہے۔ بوئے گلاب۔ اناس اور پیاس کی ملی جلی خوشبو ہے۔ اس دروازے کا نکلا ہوا خیال کدھر سے گھر کے لاؤ گے۔ اور دو جو نیچے کے دروازے ہیں۔ انہوں نے شرم سے سر جھکا کر کہا، "ان کی کیا تفصیل بیان کروں۔ تم پڑھنے لکھنے والے آدمی ہو۔ لڑکچہ نے سارے شال انہی دروازوں کے ساتھ لگائے ہیں۔ تم میرے سے زیادہ جانتے ہو۔ تم مجھ سے بہتر پہچانتے ہو۔ یہاں میں ناچنا ہوں اور تم بیٹا ہو۔ سمجھ چکے ہو زیادہ دیکھ چکے ہو، پچھان چکے ہو اور بہت سوں سے بہتر جان چکے ہو۔ من کو خلا میں کھڑا کرنا بہت مشکل ہے۔"

"یہی تو میں عرض کر رہا ہوں۔" میں نے اتر کر کہا، "اسی سوال کا تو جواب مانگتا ہوں کہ من کو خلا میں کیسے کھڑا کرے اور خیال کو کوئی زنجیر پہنا کر سہل کرے۔"

کہنے لگے، "یہاں مرشد کی ضرورت ہوتی ہے۔ گورو کی سنت گورو کے ساتھ اور شکستہ ہوتی ہے۔ یہاں کسی کے سروپ کا دھیان دینا بڑا لازمی ہے۔ اس کو تصور شیخ کہتے ہیں۔ اس مقام پر مالک کے جھگٹوں اور پیادوں کی کھوج کرنی ہے۔ ان پیادوں کی کھوج جن کا تعلق اس سے جڑا ہوا ہے۔ یہ وہی انعام یافتہ لوگ ہیں جن کو قرآن شریف انوت، عظیم کہہ کر پکارا ہوا ہے۔ گورو نانک دیوی فرماتے ہیں:-

گورو کی مورت من میں دھیان

اور اکال مورت ہے خواہ متھن کی ٹھاہر نیکی دھیان کو

اس دھیان کے ذریعے ہمارے خیال کو آنکھوں کے پیچھے ٹھہرنے کی عادت پڑ جاتی ہے۔ دھیان تو ہم اپنے منگورو کا کرنا ہے اپنے مرشد کا کرنا ہے جس نے ہم کو مالک کی بھگتی کا طریقہ اور راستہ بتایا ہے۔ جب مرشد کے ساتھ تعلق گہرا ہو جاتا ہے اور وہ یکسو ہونے میں

ہماری مدد کرتا ہے تو ہمیں آنکھوں کے پیچھے اور منہ کی سریلی آواز سنائی دیتے لگتی ہے۔ ایک باجہ بیچے لگتا ہے۔ جسے فقیر لوگ اٹھ باجہ کہتے ہیں۔ بانگ آسمانی کہتے ہیں۔ کلام الہی، نداے سلطان اور اسم اعظم کا نام دیتے ہیں۔"

وہ اپنی ترجمہ میں بول رہے تھے اور میں ان کے سامنے ہم سم، چپ چاپ، سہوت ان کی بانی سن رہا تھا۔

کہہ رہے تھے "مولوی بیٹہ محراب کے اندر کھڑا ہو کر بانگ دیتا ہے۔ ہمارے ماتھے کا انداز بھی محراب جیسا ہے جو مالک کی درگاہ کی طرف سے قدرتی حکم آ رہا ہے، وہ اسی محراب یعنی ماتھے کے اندر آ رہا ہے۔ جس وقت اس کی آواز اس کا گلہ یا ای اسم کو پکڑتے ہیں تو ہم اس آواز کے پیچھے پیچھے چل کر اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتے ہیں۔"

منزل مقصود تک پہنچ کر اچانک رکے اور شفقت سے کہنے لگے، "تمہیں غیب آ رہی ہے۔ اب سو جاؤ، باقی باتیں صبح کریں گے۔"

میں نے کہا، "بالکل نہیں حضور، ہر گز نہیں۔ میں نے تو آنکھ تک نہیں جھپکی۔ آپ البتہ ضرور تھک گئے ہیں۔ آپ کو آرام کرنا چاہیے، انھیں آپ کا بستر ساتھ کے کمرے میں لگا ہے۔"

انہوں نے ذرا سی گردن گھما کر ساتھ کے کمرے کی طرف دیکھا اور پھر کہنے لگے، "اگر تم کو کوئی اعتراض نہ ہو تو میں یہیں اسی جگہ سو جاتا ہوں اسی صوفے پر۔"

"اس صوفے پر ایٹھے بیٹھے ایسے کیسے ہو سکتا ہے سر۔ آپ چل کر بستر میں آرام فرمائیں۔ آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔"

میں نے کہا، "اب کسی چیز کی کوئی خاص ضرورت نہیں رہی۔ آرام میری زندگی کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ وہ ساتھ ساتھ چلتا ہے اور ہر وقت آرام میں رکھتا ہے۔"

میں نے کہا، "تھوڑی دیر آرام کر لیجئے۔ پھر پتہ نہیں آپ لوگ کب اٹھ کر کیا کرتے ہیں اور کتنی دیر تک کرتے ہیں۔ یہ تو یہ ہماری کچھ سے باہر ہے۔"

"میرا کرتوبہ" سن کر مسکراتے ہوئے اٹھے اور شکستہ پاؤں دوسرے کمرے کی طرف چلے گئے۔ میں نے ان کے پیچھے جا کر کہا، "یہ آپ کا نائٹ سوٹ ہے۔ سفید دھوئی کی رحلی دھوئی ٹھڈر کا تازہ سلا کرتہ۔ سر پر باندھنے کا دھول اور ربڑ کے سلپرز۔"

کہنے لگے، "وہابی دل ہے تو موج ہو گئی۔ ایسے صاف ستھرے دستر بڑی دیر بعد دیکھنے کو

ٹے۔ تم اب جا کر سو رہو صبح ملاقات ہوگی۔“

میں نے کہا ”ناشتہ کب کریں گے؟“

بولے ”جب تم کرو گے تمہارے ساتھ ہی کروں گا لیکن ذرا جلدی ہو کہ کل جتنے کو حسن ابدال روکنہ ہوتا ہے۔“

میں نے کہا ”جو حکم..... جس وقت انھیں گے ناشتہ چارٹے گا۔“

کہنے لگے ”ٹھیک ہے۔“

میں چلنے لگا تو بولے ”یاد رہے کمرہ دہ گیا اس کی بڑی ضرورت تھی۔“

میرے دل میں تو آئی کہ ایسی کڑی ضرورت کی تفصیل سے آگاہی حاصل کروں لیکن ان کے مقام کی وجہ سے رک گیا اور سر کھلاتے ہوئے بولا ”وہ اگر آپ وہاں حسن ابدال میں کوشش کریں گے تو آپ کو ضرور مل جائے گا۔ ان دنوں روسی حملے کی وجہ سے بہت سے افغان سودا سلف بیچنے پڑی تک آتے رہتے ہیں۔ ان کے پاس ہر طرح کا سامان ہوتا ہے۔ کمرے بھی دیکھے ہیں۔ حسن ابدال میں ضرور مل جائیں گے۔“

کہنے لگے ”روسی ساخت کا چابیے وہ جو انہوں نے جرمن کمرے کی نقل میں بنایا ہے۔ بھائی کو درد ستکھ کے پاس ہے۔ بہت اچھا نوٹ کھینچتا ہے پائلنگ جرمن کمرے کا لگتا ہے۔“

میں نے کہا ”آپ خاطر جمع رکھیں وہاں مل جائے گا۔ سڑک کنارے دو روپہ دکانیں ہیں وہاں اسی قسم کا مال ملتا ہے۔ خریداری پر بھی کوئی پابندی نہیں۔“

کہنے لگے ”مل ہی جائے تو اچھا ہے۔ بڑی بڑی اچھیا تھی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔“

میں نے کہا ”آپ فکر ہی نہ کریں۔ کوئی اتنی بڑا اچھیا نہیں جو پوری نہ ہو سکے۔ حسن ابدال میں نہ مل سکا تو ہم پشاور بازار سے جا کر خرید لیں گے۔“

کہنے لگے ”ٹھیک ہے۔ مگر وہ پشاور بازار سے کامطلب اچھی طرح سے نہ سمجھ سکے کہ وہاں کیسے جائیں گے اور کس کو کہیں گے اور کدھر سے خریدیں گے۔“

مجھ جب میں ان کو چگانے کے لیے ان کے کمرے میں گیا تو وہاں موجود نہیں تھے۔

حسل خانے کا دروازہ کھلا تھا اور ان کے مدھر سروں کی آواز ڈراٹنگ روم سے آرہی تھی۔

رات میں جس صوفے پر ان کو چھوڑ دیا تھا وہ وہیں بیٹھے تھے اور دھیمے سروں میں کوئی پراختہ کر رہے تھے۔ میں نے پلٹ کر ان کے کمرے میں دیکھا بسزای طرح لگا ہوا تھا ان

کے رات کے کپڑے ویسے کے ویسے تھے اور ان کے چپلوں کا جوڑا اسی جگہ پڑا تھا جہاں میں رکھ کر گیا تھا۔

میں پھر ڈرائنگ روم میں جا کر دروازے سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ انہوں نے آہستہ پا کر سر اٹھایا اور میری طرف دیکھ کر بولے ”لاہور کی سویر بڑی متورم ہے اور یہاں کے بیچھی بڑے سریلے ہیں۔“

میں نے کہا ”وہ تو ٹھیک ہے حضور لیکن آپ نے یہ کیا کیا کہ ساری رات سوئے نہیں۔“

بولے ”سو یا بھائی سو یا..... سو یا کیوں نہیں۔ بس استحان بدلی نہیں کیا۔ یہ صوفہ بہت ہی آرام دہ تھا ناں کی طرح گود میں بٹھا کر بیٹھا رہا۔ جانے ہی نہیں دیا۔“

میں نے کہا ”جناب آپ کو لمبے سفر پر جانا ہے کچھ تو خیال کیا ہوتا۔“

بولے ”خیال کر کے ہی تو بیٹھا۔ خیال نہ کرتا تو اٹھ کر بیچھوئے پر چلا جاتا۔ پر یہ بچھوئے سے زیادہ کرپا لوتا تھا۔ سیوا میں ہی لگا رہا۔“

میں نے کہا ”چلیے اب ناشتہ کر لیجئے۔“

کہنے لگے ”ٹھیک ہے..... لیکن ان کا“ ٹھیک ہے۔“ کہنے کا انداز کچھ مختلف سا تھا۔ اگر اس کا پنجابی میں ترجمہ کیا جاتا تو یہ بننا کہ ”وہاں کہاں جاؤں گا۔ ایک پیالی اور چری لے آؤ۔“

آہستگی سے اٹھے اور میرے ساتھ چلنے لگے۔

ناشتہ کرنے کے بعد جب وہ میری سے بیوی آگیا لے کر باہر نکلے تو وقت ذرا زیادہ ہو گیا تھا لیکن ان کی چٹانم تھی کہ ذرا نیور گاڑی لے کر پورچ میں کھڑا ہوا انتظار کر رہا تھا۔

جب ہم رنجیت سنگھ کی مڑھی پر پہنچے تو بس تیار کھڑی تھی اور تقریباً سارے یازہی اس میں سو رہے تھے۔ بھائی باپلی کو کار سے اتارتے دیکھ کر جتنے داور نے پکار کر کہا ”مہر و مہراج کی سنگتو اس آپ ہی کی انتظار ہی تھی۔ آپ کا تھیلا بھائی بچن سنگھ کو دے دیا ہے اور وہ پری کھڑکی کے ساتھ بیٹھا ہے۔“

مرشد مجھ سے ہاتھ ملا کر کار سے باہر نکلے لگے تو میں نے ان کا ہاتھ مضبوطی سے اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ لیا اور ڈرائیور سے کہا ”کل فرازا حسن ابدال چلو۔“

اس نے میری طرف مڑ کر بہت اچھا صاحب کہا اور گاڑی شارٹ کر دی۔ میں نے کھڑکی سے چہرہ نکال کر جتنے داور سے کہا ”آپ چلیں ہم آپ کے پیچھے پیچھے آتے ہیں۔“

انہوں نے ذرا سختی سے کہا "یہ تم کیا کر رہے ہو شفا علی۔ حسن ابدال تو بڑی دور ہے۔" میں نے کہا "جی میرا دیکھا ہوا ہے۔ آپ کیلئے مرتبہ جارہے ہیں اتنی دور نہیں ہے۔" انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور شائستہ ہو کر بیٹھ گئے۔

جب گاڑی راوی کے پل پر پہنچی تو انہوں نے دونوں طرف نظریں گھما کر دریا کو دریا کے پانی کو اور کنارے لگی کشتیوں کو غور سے دیکھا اور کہنے لگے "مجھے دریا سے بڑا عشق ہے۔ اس کی شفتی مانتا جیسی ہوتی ہے۔ ماں کا سا برتاؤ کرتا ہے۔"

"اور جب طفیلی میں ہو۔" میں نے پوچھا۔ "کناروں سے باہر نکل کر بستیوں کو سمیٹنے لگا ہو۔۔۔۔۔ پھر؟"

کہنے لگے "پھر بھی ماں جیسا ہی ہوتا ہے۔ سوتیلی ماں کے انوسار۔ دکھ دیتا ہے پر اپنا روپ نہیں چھوڑتا۔"

میں نے کہا "سرکار! پہلے تو آپ ایسے نہیں تھے۔ اب کچھ اور ہی طرح سوچنے لگے ہیں۔"

مسکرا کر بولے "ناپ بدل رہا ہوتا ہے۔ گھٹت بڑھت ہوتی رہتی ہے۔ کچھ مورکھ پرانے کپڑوں کے ناپ پر نئے سلوا لیتے ہیں لیکن دیہہ پر ٹھیک نہیں بیٹھتے۔۔۔۔۔ جیسے باہر کا سر یہ ہے ایسے ہی اندر کا بھی ایک سر یہ۔ دونوں میں اور کچھ کھٹتی بڑھتی ہوتی رہتی ہے۔"

پھر اچانک میری طرف رخ کر کے بولے "تم دریا پر آتے رہتے ہو؟" میں نے کہا "وقت ہی نہیں ملتا سر ایڈی مشکل سے گھر جانا ہوتا ہے۔ اگر گھر والوں کا خوف نہ ہو تو بندہ گھر بھی نہ جاسکے۔"

کہنے لگے "بی بی کو بتا دینا کہ تم میرے ساتھ حسن ابدال چلے گئے ہو!"

میں نے کہا "وہاں پہنچتے ہی سب سے پہلے یہی فون کروں گا۔"

بولے "وہاں پہنچ کر نہیں رولستے میں کسی جگہ سے کروں گا۔"

میں نے کہا "بالکل ٹھیک ہے سر۔ گو چرنوالہ سے کروں گا۔"

پھر میں نے ان کا کندھا پیچھے دباتے ہوئے کہا "آپ سیٹ پر سر رکھ کر سو جائیں کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ آپ رات بھر جاگتے رہے ہیں۔"

انہوں نے میری بات کا کوئی جواب نہ دیا اور سر پیچھے لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ان کے ساتھ میں نے بھی دونوں ہاتھ گود میں رکھے اور کھڑکی کی طرف جھک کر گہری نیند سو گیا۔

۲۲

حسن ابدال پہنچ کر ہم نے سڑک کنارے شیشے والے ریسٹوران میں تلی ہوئی تازہ مچھلی کھائی۔ استاد کرم گوشت کے خنسن میں صرف مچھلی کھا لیتے تھے وہ بھی بہت تھوڑی۔ رک رک کر اور ٹٹول ٹٹول کر۔ ایک مرتبہ رجنی کو بتا رہے تھے کہ میں مچھلی کھا تو لپٹتا ہوں لیکن زیادہ نہیں۔ مجھے اچھی لگتی ہے اور لہسن کے ساتھ مل کر اس کی خوشبو اور بھی سوادشت ہو جاتی ہے لیکن میں ڈر رہا ہوں۔

رجنی آنکھیں چپکا کر بولی "مچھلی سے ڈرتے ہیں کہ بیوگ سے!"

یہ سن کر ان کے چہرے پر پینہ آگیا اور دو نظریں جھکا کر بولے "آج شاید مسالہ چیز ہے۔"

لیکن حسن ابدال کی مچھلی انہوں نے شوق سے کھائی اور ان کے چہرے پر کسی قسم کا پینہ نہ آیا۔ وہ مسکراتے رہے اور چھوٹے چھوٹے لقمے لیتے رہے۔

جب ہم کھانا کھا کر نکلے تو انہوں نے لجاجت سے کہا "اب جو تم ساتھ آئی گے ہو تو کیمبرے کی تلاش میں میری مدد کرو۔"

میں نے کہا "بالکل سرکار! بالکل۔۔۔۔۔ میں آیا ہی اسی لیے ہوں۔ کیمبرہ آپ کا آج ہی تلاش کریں گے بلکہ ابھی کریں گے اور اگر مل گیا تو باتریوں کی بس آنے سے پہلے پہلے خرید لیں گے۔"

میری یہ بات سن کر ان کے چہرے پر اطمینان کی ایک لہر دوڑ گئی۔ انہوں نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "تم کو بڑی تکلیف دی ہے شفا علی لیکن تمہارے سوا میرا کوئی اور ہے بھی نہیں۔"

میں نے چھپت کر ان کے ساتھ گھٹ کے جمی ڈال لی اور میری آنکھیں نمناک ہو

گئیں۔ زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں ان کے اس قدر قریب ہو سکا تھا۔ میری آرزو تو برسوں سے تھی لیکن مجھے ہمت نہیں پڑتی تھی۔

بازار میں دکانوں پر سرنگڑ چیزوں کی بھرمار تھی اور لوگ مقامی مسافر تاجر، سنگلر ان کو دیکھ چاکھ کر سونے کر رہے تھے۔ میں نے ایک دکاندار سے کمرے کی بابت پوچھا تو اس نے مجھے دو کمرے دکھائے۔ ایک بائیس روپے کا تھا اور دوسرا سو روپے کا۔

جب میں نے اس سے بڑھیا اور قیمتی قسم کے کمروں کی بابت پوچھا تو اس نے کہا "تھا ایک لیکن کل بک گیا۔" "کہاں بک گیا؟" مرشد نے بے چینی سے پوچھا تو دکاندار نے جس کر کہا "گیانی جی کوئی اپنا نام پتہ تھوڑی بنا کر جاتا ہے۔ سودا آتا ہے اور چلا جاتا ہے اور پھر ہماری طرز کی دکانداری کا سودا تو بالکل ہی نکل جاتا ہے کچھ بتائے بغیر۔"

میں نے کہا "اور کسی کے پاس ہو گا؟"

کہنے لگا "ایک دکان چھوڑ کر تیسری دکان سے پوچھئے۔ اس کے پاس پانچ آئے تھے شاید کوئی پڑا ہو۔"

میں جلدی سے تیسری دکان پر گئے تو اس نے گروں مروڑ کر کہا "پانچ آئے تھے پانچوں کے پانچوں ایک دکاندار لے گیا۔"

"کہاں کا دکاندار؟" میں نے جلدی سے پوچھا تو اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔

"کہاں کا دکاندار؟" استاد مکرّم نے پوچھا تو اس نے سر اٹھا کر دوڑ سڑک کی طرف دیکھا جیسے خریدار لاری اڈے پر کھڑا ہو اور پھر ہماری طرف دیکھے بغیر بولا "سایہ وال کا تھا اور صرف کمرے خریدنے آیا تھا۔"

"لیکن تھے بڑھیا؟" میرے مرشد نے پوچھا۔

"نمبر ون" دکاندار نے ہمیں لپٹاتے ہوئے کہا "جرمن ماڈل۔ لایکا نمبر ۱۱۱ ساختہ روس۔"

"اور قیمت؟" میں نے پوچھا۔

"قیمت تو ہزار روپے فی واٹ تھی لیکن وہ آٹھ آٹھ سو کے اٹھا کر لے گیا۔ میں نے بہت زور لگایا انکار کیا لیکن اس نے زبردستی پانچوں کے پانچوں تھیلے میں ڈال لیے اور چار ہزار کے نوٹ میرے سامنے پھینک کر چلا گیا۔"

"ایک اور نہیں مل سکا۔ ویسا" گیانی ہائی صاحب نے پوچھا۔

"کچھ کہہ نہیں سکتے گیانی جی۔" دکاندار بولا "آئے کو تو آج درجن بھر آجائیں نہ آئیں تو چھ مہینے گزر جائیں۔ یہ سنگلنگ کا مال ہے مگر قیمتی جی شریف گھرانے کی چور تیار جیسا۔ اس کی اپنی مرضی ہوتی ہے۔"

میں دکاندار کی یہ بات سن کر چونکا اور اس کی طرف حیرت سے دیکھنے لگا۔ اس نے سر ہلا کر کہا "بابو صاحب سنگلنگ کے مال پر کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ خود ہی آتا ہے اور خود ہی چلا جاتا ہے۔ جیسے بہار پر آئی ہوئی شریف گھرانے کی لڑکی خود ہی ادھل جاتی ہے اور پھر خرچ خرچ کر خود ہی واپس آ جاتی ہے۔ اس طرح سے ہمارا مال ہوتا ہے۔"

میں نے کہا "جناب آپ کی بات ہے تو مزید لیکن ٹھیک سے سمجھ نہیں آئی۔ شریف گھرانے کی لڑکی کیوں خاص طور پر؟"

کہنے لگا "کینن ذات کی لڑکیاں جب ایک مرتبہ ادھل جاتی ہیں تو پھر واپس نہیں آتیں۔ ان کو ادھلنے کا چکا پڑ جاتا ہے۔ اس لیے خود جا کر ان کی بائیں لانا پڑتی ہیں۔"

"اور شریف لڑکی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ اونچے گھرانے کی اشرافیہ کا بچہ ہوتی ہے۔ اس کو جب اتنا کھینکھینک کرنے کے بعد کوئی لطف نہیں آتا تو ایک شام خود ہی گھر واپس آ جاتی ہے۔ ہمارا مال بھی نکل جاتا ہے اور مگھوم پھر کر واپس بھی آ جاتا ہے۔ اس کا نہ کوئی بچک ہوتا ہے نہ منڈی ہوتی ہے نہ کشیمیمو کشا ہے۔ جس طرح جاتا ہے اسی طرح اسی صورت میں واپس آ جاتا ہے۔ انہوں نے والے لڑکی کو چھپا چھپو کر لکھ کر پردہ ڈال کر لے جاتے ہیں۔ اسی طرح سنگلنگ کا مال لے جانا پڑتا ہے۔ خیاردوں کو تیز رفتار گھوڑیوں پر ادھل کر لے جاتے ہیں۔ سنگلنگ کے مال مرہٹوں کھوتوں پر لے جاتے ہیں جو بیٹاؤں کی اوت میں اکیلی چلتی جاتی ہیں بغیر کسی کھوتے وال کے بغیر کسی رہنما ہادی بغیر مرشد کے۔"

جب میرے مرشد نے مجھے اس چسکے دار گفتگو میں کانوں تک ڈوبتے ہوئے دیکھا تو جلدی سے میرا کندھا ہلا کر کہا "ان سے پوچھو کسی اور کے پاس سے مل جائے گا۔ یہاں دکان پر نہ ہو گھر پر رکھا ہو۔"

دکاندار کہنے لگا "ایسا سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ اس کے پاس گھر پر بھی کچھ مال موجود رہتا ہے لیکن وہ پشاور گیا ہوا ہے اور بدھ دار سے پہلے واپس نہیں آئے گا۔"

”لیکن گیانی جی کو تو کل شام لاہور واپس چلے جانا ہے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔
دکاندار سوچ میں پڑ گیا۔

وہاں تین فوجوان کھڑے تھے جو بڑی ادب سے ہماری باتیں سن رہے تھے بلکہ میں تو یہ کہوں گا کہ وہ کسی حد تک ہمارا پیچھا کر رہے تھے اور کھسکتے کھسکتے ہمارے ساتھ ساتھ آ رہے تھے۔ ان میں سے ایک فوجوان نے آگے بڑھ کر کہا ”میرا نام طاہر خان ہے اور میں جردو کا رہنے والا ہوں۔ پشاور یونیورسٹی سے ایم فل کر رہا ہوں اور یہ دونوں افغان مجاہدین ہیں۔ جلال یار اور ہاشم خان۔“

ہم دونوں نے ان کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اپنے اپنے دست عقیدت سینوں پر رکھ کر ایک دوسرے کے سامنے ہلکا سا جھکے اور میں نے پہلی مرتبہ کلا شکوف کو اس قدر قریب سے دیکھا۔

طاہر خان نے کہا ”مگر آپ کو واقعی اچھے کمرے کی ضرورت ہے تو پھر اچھا کمرہ آپ کو پشاور سے ملے گا۔“ میں نے اپنے استاد کی طرف دیکھ کر کہا ”پشاور باڑے سے سرکار۔“
”نہ نہ“ جلال یار نے کہا ”باڑے سے نہیں اور چھاؤنی میں ایک خاص دکان ہے۔ قیمتی مال کا ادھر سے ملے گا۔“
میں نے کہا ”اب بھی ہو گا۔“

بول ”ضرور ہو گا۔ ابھی ہم نے پرسوں ادھر دیکھا تھا۔“

میں نے سوالیہ نظروں سے اپنے استاد کی طرف دیکھا تو ان کو متردد اور حزر لزل پایا۔ طاہر خان نے کہا ”مگر آپ مجھے پشاور کا کرایہ دے دیں اور ساتھ سو روپے تحفہ تھیں پشاور سے لا کر دے سکتا ہوں۔ ابھی چلا جاؤں گا اور صبح سویرے لے آؤں گا۔“
میں نے کہا ”ٹھیک ہے۔“

لیکن جب میں نے اپنے گورو کی طرف دیکھا تو وہ گردن گھما کر آسمان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے شرمندگی نالتے ہوئے کہا ”پھر یہ ٹھیک ہے ناں سر؟“
کہنے لگے ”ٹھیک تو ہے پر وارا نہیں کھاتا۔“

”کیوں وارا نہیں کھاتا؟“ میں اور طاہر خان ایک ساتھ بولے۔

”وہ اس لیے۔“ انہوں نے سوچتے ہوئے کہا ”وقت کم ہے“ کھل زیادہ ہے۔ ایسی کوئی خاص ضرورت کی بھی چیز نہیں..... رہنے ہی دو۔“

میں نے کہا ”ان کے ساتھ میں چلا جاتا ہوں۔ گاڑی پر جائیں گے“ ایسے ہی واپس آ جائیں گے۔ پانچ بجے گھنٹے کی بات ہے مجھے اور آئے؟“

کہنے لگے ”نہیں“ اندر نہیں مانا..... اور جب اندر نہ مانے تو پھر کچھ بھی نہیں کرنا چاہیے۔ چل کر چائے پیتے ہیں اور سنگتوں کو بھی پلاتے ہیں۔“
ان کے نہ نہ کہنے کے باوصف ہم ان کو سامنے چائے کے کھوکھے پر لے گئے اور پانچ بیالی پشاور کی قہوے کا آرڈر بک کرادیا۔

طاہر خان بار بار کہہ رہا تھا سزاوار صاحب آپ کے شوق کی چیز ہے۔ پشاور اتنی دور بھی نہیں مال بھی فریش آیا ہے۔

”بالکل فریش“ جلال یار نے لقمہ دیا۔

”پھر آپ کیوں نہیں ہمیں لانے دیتے؟ بلکہ میں تو کہوں گا آپ بھی ہمارے ساتھ چلیں۔“

میں نے نظریں گھما کر اپنے مرشد کی طرف دیکھا۔ وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلا رہے تھے اور طاہر خان کے کندھے پر ہاتھ مار کر زبان حال سے کہہ رہے تھے ”چھوڑو یار جی۔ کوئی ضرورت نہیں۔ چھوٹی چھوٹی خواہش پر قابو نہ پایا تو بڑی خواہش کو کس طرح سنبھال سکیں گے۔ بس ایسے ہی ٹھیک ہے۔“

ان کے طاہر خان کے کندھے پر ہاتھ مارنے سے میں کچھ جھپٹس سا ہو گیا۔ وہ بڑی محبت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے اور طاہر خان بھی تقریباً اسی انداز میں جواب دے رہا تھا۔ میں نے جھلا کر قدرے زور سے کہا ”آپ کیوں نہیں چلتے سرکار۔ یہ تو پشاور ہے۔ اتنی دور آئے ہیں تو اپنی بیویوں سال کی پسند کو کیوں لے کر نہ جائیں۔ پھر یہ موقع بار بار کہاں ہاتھ آئے۔ چلتے اٹھتے نہت کھینچے۔“

انہوں نے میری کھائی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر کہا ”ایسی کوئی آکاشک سوغات ہے شفا کی جس کے لیے جیون سمیت کر دیں۔ پھر کبھی سکی..... اور پھر کبھی کبھی نہ ہو سکا تو کوئی لالسا نہیں۔ لا بھر نہیں۔ بس ایک کھیل تماشا ہی ہے ناں یہ کبیرہ۔ ہوا ہوا نہ ہوا نہ ہوا۔ ایسی کوئی قیامت آئی جاتی ہے۔“

میں نے کہا ”یہ ایک دم کیسا فیصلہ ہو گیا؟“

مسکرا کر بولے ”بس اندر بریک لگ گئی۔“

جلال یار نے کہا "اگر تمہارا استاد ہے تو پھر اس کی خدمت کے لیے ضرور کو شش کرو۔"

"نہیں، نکل، نکل۔ میرے استاد نے ہاتھ ہلا کر کہا "اب ضرورت نہیں رہی، سارا سہین بدل گیا۔ دوسرا ڈرامہ چل پڑا۔"

"دوسرا کونسا؟" میں نے حیرانی سے پوچھا۔

"نہیں کر بولے" کوئی اور..... مجھے کیا پتہ دوسرا کونسا ابھی تو ناکل ہی آ رہا ہے۔

ہم سب ان کی اس بات سے لطف اندوز ہوئے۔ خاص طور پر افغان مجاہدین نے اسے بہت پسند کیا کہ وہ زبان کی وقت کے باوجود اس بات کی باریکی کو سمجھ گئے تھے۔

جب ہم قبوہ ملی چکے تو استاد مکرم نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا "تم اب چلو شغلی اور جب بھی لاہور پہنچو تو پہلے سیدھے اپنے دفتر جانا۔"

"خود دفتر بند ہو چکا ہو؟" میں نے شرارت سے کہا۔

فرمایا "بالکل.....! چاہے دفتر بند ہو چکا ہو۔"

میں نے کہا "ابھی آپ کے قافلے کو آنا ہے۔ کو غریبوں کی الاٹمنٹ ہونی ہے۔ پھر آپ کو اکھنڈ پائٹھ میں شامل ہونا ہے۔ جب آپ پائٹھ میں شریک ہوں گے اس وقت چلا جاؤں گا۔"

کہنے لگے "انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ لہذا سفر ہے۔ تم رات کے جاگے ہوئے بھی ہو۔ بہتر یہی ہے کہ ابھی چلے جاؤ۔"

میں نے کہا "یہ حکم ہے؟"

بولے "ہاں حکم ہے!"

میں نے کہا "امر ہے؟"

بولے "بالکل امر ہے۔"

میں بادل ناخواستہ دہان سے اٹھا۔ استاد مکرم کے نئے مہربانوں کو کڑی آنکھ سے دیکھا۔ اپنے اوپر لعنت اور نفرین کی اور شرمندگی ماننے کی غرض سے کہا "نکل، آپ کب تک پہنچ جائیں گے؟"

"لاہور!" مرشد نے لاہور پر زور دے کر پوچھا۔

میں نے کہا "جی۔"

فرمانے لگے "کل شام تک ہی پہنچیں گے۔ مغرب کے بعد.....!"

میں نے کہا "میں آؤں گا۔"

بولے "ٹھیک ہے، آ جانا۔ پھر بیٹھیں گے۔"

پھر سب باری باری مجھ سے گفتگو ہوئے اور مجھے یوں لگا جیسے حالات خان، جلال یار اور ہاشم خان میرے بچپن کے گھنٹے ہوئے دوست تھے جو اتفاق سے حسن ابدال کے بازار میں مل گئے۔

مغرب سے بہت پہلے میں رنجیت سنگھ کی مڑھی پر پہنچ گیا۔ ڈرائیور کو آزاد کر کے اس سے گاڑی کی چابی لے لی اور بیچ پر بیٹھ کر استاد مکرم کا انتظار کرنے لگا۔

میرے استاد ماسٹر اقبال صاحب جنہوں نے بڑی محنت اور محبت کے ساتھ مجھے کلاس روشناس کر لیا تھا اور بڑی توجہ اور لگن سے کلاس منت بھانا سکھایا تھا اور سر کے ایک مقام پر قائم کیا تھا اور جو بار بار انگلی اٹھا کر ایک ہی بات کہا کرتے تھے کہ سر چکر کے رکھو۔ سر کا مان مریدا نگہ میں رکھو۔ سر کو اونچا استھان دو۔ وہی ماسٹر اقبال اب خود سر چھوڑ کر ایک دوسری لے میں داخل ہو چکے تھے۔

مجھے ان کا کڑا پہننا اور پر شاد چکھنا اچھا نہ لگا۔ وہ میرے صاحب تھے۔ میں ان سے شکوہ تو نہ کر سکتا تھا البتہ اندر ہی اندر آنسو ضرور بہا سکتا تھا۔ جب سے وہ یہاں آئے تھے اور جب سے میں نے ان کی وضع قطع دیکھی اور ان کی بولی بھاشا سنی تھی، میرا دل اور بھی بیٹھ گیا تھا۔ وہ پرانا تعلق تو قائم تھا مگر اندر سے کچھ دھاگے ٹوٹ گئے تھے۔ میرے اندر لا تعلقی کی ایک لہر سی پیدا ہونے لگی تھی۔ جیسے شفاف براق ٹھنڈے پانی کے گلاس میں زہر مہرہ رنگ کا ایک ذرہ گر جائے اور اس کی لہر آہستہ آہستہ سنبھلنے لے کر اٹھ اٹھ کر کھانے لگے۔

وہ مجھے پیارے بھی بہت تھے اور میری نظروں میں قیمتی بھی اسی طرح تھے مگر اس بیش بہا تاریخی مرتبان کی درازوں پر پیش کے بہت سے گانٹھے لگ چکے تھے۔ دل کے اندر تھوڑی تھوڑی دیر کے ایک پیپ جتنی اور اس پیپ کے بعد ایک بے حد واضح جملہ مدہم آواز میں تین مرتبہ سنائی دیتا تھا۔ "کاش بھائی باہلی سکھو یہاں نہ آئے۔"

اس پیپ کے آنے پر کبھی میں دائیں دیکھتا، کبھی بائیں، کبھی سر اوپر اٹھا کر درختوں کی

ڈالیوں میں اچھا دھیان پھنساتا لیکن دیکھار ڈھنڈھ ٹھاکر کے اپنے مقام پر آ جانا۔
بچے سے اٹھ کر میں روش پر غصے لگا۔ ایک دیوار سے دوسری دیوار تک۔ کھسی پٹی، پھٹی اور سوکھی ہوئی گھاس پر۔ پرانے لفافوں، بیوں اور جھٹھروں پر چلتے ہوئے مجھے طے شدہ مسافت پر آتے اور جاتے ہوئے مجھے یہ چیزیں بار بار ملتیں اور میں ان کی طرف نہ دیکھتے ہوئے بھی پہچان جاتا کہ لب میں کس مقام پر ہوں۔

یاتریوں کی بس کے آنے، رکنے، دروازے کھلنے اور سنگتوں کے اترنے کے شور نے مجھے جلدی سے بس کے سامنے لا کھڑا کیا اور میں سب کچھ بھول بھال کر استاد مکرم کے اترنے کا انتظار کرنے لگا۔ مرد، عورتیں، آہستہ آہستہ اتر رہے تھے کیونکہ ان کے ہاتھوں میں حسن ابدال کی سوغاتیں، اکھنڈ پانچھ کی شیرینی کے لفافے اور پاؤں میں سونے کی بوجھل کیفیت تھی۔ سب لوگ سوچ سوچ کر اور رک رک کر اتر رہے تھے۔

میرے دل کی پیپ اب بند ہو گئی تھی۔ میں نے ایڑیاں اٹھا کر دو تین مرتبہ اس محبوب صورت کو دیکھا جس کے انتظار میں کب سے اس جگہ بیٹھا تھا لیکن میری ایڑیاں اٹھانا میرے کچھ کام نہ آیا کہ استاد مکرم کی شکل اترتی ہوئی سواریوں میں نظر نہ آئی۔

جب بس بالکل خالی ہو گئی اور وہ نظر نہ آئے تو میں نے پریشانی کے عالم میں ایک بڑی عمر کی عورت سے پوچھا "بی بی بھائی باہلی نہیں آئے؟"

اس نے چہرہ میری طرف گھمائے بغیر کہا "وہ تو چڑھے ہی نہیں۔ ہم ان کی بھال کرتے اوجھا گھنڈ ہارن بجاتے رہے۔"

میں نے اس بی بی کو چھوڑ کر ایک پڑھے لکھے معزز سکھ سے پوچھا "بی بی بھائی باہلی نہیں آئے آپ کے ساتھ؟"

اس نے میری طرف غور سے دیکھا اور پھر مجھے پہچانتے ہوئے بولا "وہ تو بس چڑھے ہی نہیں۔ ہم ہارن بجاتے رہے۔ لوگ ان کی کھوج کرتے رہے مگر وہ نظری نہیں آئے۔ ہم نے پکا اندازہ لگا لیا کہ وہ آپ کے ساتھ چلے گئے ہوں گے۔"

پھر اس نے مزید غور سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا "آپ انہیں اپنی کار میں لے کر نہیں گئے تھے؟" میں نے کہا "ضرور لے کر گیا تھا۔"

"پھر آپ ان کے ساتھ بازار میں بھی گھومتے رہے تھے انیک دکانوں پر۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

”جب آپ قہوہ پی رہے تھے کھوکھے پر اس وقت میں نے آپ کو دیکھا تھا۔“

میں نے کہا ”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“

”اس وقت آپ کے ساتھ کچھ افغانی پٹھان بھی تھے۔“

میں نے کہا ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“

تو پھر ہم نے تو یہی سمجھا کہ گوزد کے پیارے جیسے اگلے کار میں آئے تھے ویسے ہی

واپس چلے گئے ہوں گے۔“

میں نے ہزبوا کر کہا ”وہ میرے ساتھ تو نہیں آئے۔ میں تو اکیلا ہی آگیا تھا۔“

سکھ سردار نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور پریشانی کے عالم میں بولا ”پھر تو بڑی

مشکل ہوگی۔ کل صبح ہمیں جانا ہے۔ گنتی پوری نہ ہوئی تو خرابی ہو جائے گی۔“

میں نے کہا ”وہ اکھٹا پٹھو میں شریک نہیں ہوئے؟“

”ہوئے۔“ سکھ سردار نے کہا ”ہوئے کیوں نہیں۔۔۔ شروع میں کمال کا بھاشن دیا۔“

پھر سچی سرپدیش بھی دیا۔ اس کے بعد نظر نہیں آئے۔“

”کسی کو کچھ بتا کر بھی نہیں گئے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں۔“ سردار نے منہ سے نہ کا چٹائے دار صوتی تاثر نکال کر کہا ”کسی کو کچھ بتایا ہی

نہیں۔“

میری خاموشی اور پریشانی بھانپ کر وہ سکھ سردار کہنے لگا ”میں نے ان کو انہی پٹھانوں

کے ساتھ جیب میں بیٹھتے دیکھا تھا جن کے ساتھ آپ قہوہ پی رہے تھے۔“

”اُدھوا“ میں نے قسلی آمیز لہجے میں کہا ”وہ پشاور چلے گئے ہوں گے کیمرو

خریدنے۔“

سردار نے میری طرف ایسی حیرانی سے دیکھا گویا کہہ رہا ہو ”انہیں پشاور جانے

اور کیمرو خریدنے کی کیا ضرورت تھی۔ وہ تو دھارک آدمی ہیں۔ ان کا فوٹو گرائفی سے

کام؟“

میں نے کہا ”اب وہ رات کو سیدھے پشاور سے آئیں گے اور صبح آپ کے ساتھ بازار

کراس کر جائیں گے۔“

”کر جائیں بائی کر جائیں۔“ سکھ سردار نے رک رک کر کہا ”کچھ سب کو یہ نہ ڈال

دیں بگنے دیس میں۔“

میں نے ان کا کندھا چھپچھا کر کہا ”نہیں سردار جی نہیں۔ آپ فکر ہی نہ کریں۔ وہ پشاور

چلے گئے ہیں اور آدمی رات سے پہلے واپس آجائیں گے۔ اس وقت وہ انک کا پل کر اس کر

چکے ہوں گے۔“

سردار بابا کی قسلی کرنے کے بعد میں گاڑی میں بیٹھا اور گھر واپس آگیا۔ ان کو انوار

کہنے کی اور بھول چوک کی معافی مانگنے کی بڑی خواہش تھی لیکن ان کی ردا گلی کا کوئی ظلم نہ تھا۔

ان سے ملاقات ہو جاتی تو سارا پروگرام آسانی سے طے کر لیتا۔

دون کے بارہ بجے جب میں دفتر میں اپنے عملے کے ساتھ ہفت زبانی لغت کے کارڈ تیار کر رہا تھا تو ایک محکمہ ٹیم تھانیدار دو باوردی سپاہیوں کے ساتھ میرے سامنے آکر کھڑا ہو گیا اور کافی آواز میں بولا "مسی بھائی اقبال سنگھ المعروف بابلی گرختی کہاں ہے؟"

میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میرے ساتھ میرے عملے کے دوسرے لوگ بھی سرودھ اٹھ کھڑے ہوئے ہیں نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "تشریف رکھئے۔ بھائی بابلی گرختی صاحب کا انتہ پتہ مجھے معلوم نہیں۔ میں ان سے ملا ضرور ہوں....."

اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے میری بات کاٹ کر کہا "آپ کل انہیں اپنے ساتھ اپنی سرکاری موٹر میں لے کر حسن ابدال نہیں گئے تھے؟"

میں نے کہا "ضرور گئے تھے اور میری خواہش تھی کہ جس طرح ان کو ساتھ لے کر گیا تھا اسی طرح واپس لے کر بھی آتا لیکن انہوں نے مجھے یہ کہہ کر واپس پھیر دیا کہ اب میں خود آ جاؤں گا۔ تم جاؤ۔" لیکن وہ واپس نہیں آئے۔ "تھانیدار نے کہا" اور جتھہ ان کے بغیر واپس انڈیا گیا ہے۔ تین گھنٹے تک اس کی تھارو چیکنگ ہوتی رہی اور ایک ایک باتری سے پوچھ گچھ کی گئی..... وہ اب کہاں ہے؟"

میں نے کہا "مجھے ان کے محل تقریبی یا حدود موجودہ کا کوئی علم نہیں۔" میں ان کو چھوڑ کر واپس آ گیا تھا!

تھانیدار نے کہا "ان کے ساتھ تین پٹھان کون تھے؟"

میں نے کہا "وہ ہم کو اچانک مل گئے تھے اور ہم انہیں جانتے نہیں تھے..... لیکن ان کے ساتھ ہماری کوئی بھی ملاقات نہیں تھی۔ انہوں نے قبوے کی دھجوت دی تھی جو ہم

نے بڑے شوق اور غلوں کے ساتھ قبول کر لی تھی۔ اس کے علاوہ ہم ان کے ساتھ کہیں نہیں گئے۔"

تھانیدار نے کہا "ہماری اطلاع کے مطابق مسی اقبال سنگھ بابلی گرختی انہی کے ساتھ انہی کی جیب میں پشاور کی طرف گیا ہے اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں۔"

میں نے کہا "ضرور گئے ہوں گے کیونکہ ایک کمرے کی ضرورت تھی اور وہ کمرہ ان کو پشاور کے بازے سے ہی مل سکتا تھا۔"

"لیکن اس کو معلوم ہونا چاہیے تھا کہ وہ سوائے دو شہروں کے پاکستان کے کسی اور شہر میں نہیں جاسکتا تھا۔" یہ ان کو یقیناً معلوم تھا "میں نے جواب دیا "لیکن انہوں نے سوچا ہو گا کہ چند گھنٹوں کے لیے کسی دوسرے شہر ہو آنا کچھ ایسی خطرناک بات نہ ہوگی اس لیے ان کے ساتھ چلے گئے۔"

"وہ کہاں کے پٹھان تھے" تھانیدار نے پوچھا "پاکستانی پٹھان یا افغانی"

میں نے کہا "میں یقین سے تو کچھ نہیں کہہ سکتا البتہ ان کے لہجے سے پتہ چلتا تھا کہ وہ افغانی ہیں لیکن ان میں سے ایک پشاور یونیورسٹی کا طالب علم بھی تھا۔"

"کچھ پتہ نہیں چلتا اور کوئی بس نہیں چلتا" تھانیدار نے زور سے کہا "سب گڈ ٹا گیا اور ہر کوئی گھسروم گھسرو ہو گیا۔ اس روز کی جنگ نے تو آدھا افغانستان ہماری طرف دھکیل دیا۔"

میں نے کہا "وہ تو آپ کے سامنے ہے اور اس سلسلے میں ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ جنگوں میں اس طرح کے واقعات تو ہوا ہی کرتے ہیں۔"

تھانیدار نے اٹھتے ہوئے ہاں کی ایک گندی سی گالی دی جس کو ہم سب نے اپنے اپنے لیے سمجھا اور اپنے اپنے لئے جانا حالانکہ اس نے یہ گالی اپنے آپ کو خطاب کر کے دی تھی۔ پھر اس نے میری طرف منہ کر کے کہا "وہ تو چلا گیا مائی کا یار سکھو! گرختی! لیکن ہم کو ہاتھی کے چو کے ساتھ بندھوا گیا اب میں کہاں سے اس کی گنتی پوری کر دوں۔"

میں نے کہا "آپ فکر نہ کریں۔ وہ ذمہ دار آدمی ہیں۔ جو نہیں کمرہ مل گیا وہ خود ہی آ جائیں گے۔"

اس نے ایک گالی کمرے کو ایک اپنے آپ کو ایک گرختی کو اور ایک ڈرا سی پہلو کے

مل کر کے مجھے دی اور سپاہیوں کی طرف منہ کر کے بولا "اوائے بہن کے یار واپ تم بھی منہ اٹھا کر کھڑے ہو گئے ہو چلو آگے لگو۔"

دونوں سپاہی ایزی سی کھڑکا اس کے آگے لگ گئے اور وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ میرے غصے نے حیرانی سے میری طرف دیکھا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ تھانیدار ان میں سے کسی سے بھی مخاطب نہیں تھا۔

مجھے اٹھیا سے تقریباً ایک چھٹی عبارت کے دو خط آئے جن میں بڑی لطافت اور گہرے دکھ کے ساتھ بھائی باہلی کے بارے میں پوچھا گیا تھا کہ میں نے انہیں کیوں چھپالیا اور کہاں چھپالیا اور اب ان کی رہائی کی کوئی تاریخ مقرر ہوئی ہے۔

یہ دونوں خط رجنی کے معلوم ہوتے تھے کیونکہ وہ ہر دو کو دو چشمی لکھا کرتی تھی اور اس کی ہر سطر دائیں سے بائیں کو جاتے ہوئے آخر میں نیچے کو جھکتی جاتی تھی۔ گو اب اس کی اردو بہت کمزور ہو گئی تھی اور اس کے سچے جا بجا غلطی کرتے تھے لیکن اس کے اندر کا دکھ بہت بڑھ گیا تھا اور وہ دردی آخری منزل میں نظر آتی تھی۔ اگر اس نے مجھے اپنا پتہ لکھا ہوتا یا ہمارا کوئی رازداں اس قصبے میں موجود ہوتا تو میں ہر حال میں اس کو جواب لکھتا اور دبلے پتلے گرختی کا حال بتا کر اس کی تشفی کرتا لیکن اب تو کوئی صورت ہی نہیں تھی۔

ادھر ہر ہفتے دس دن بعد تھانیدار صاحب ایک رجسٹر اور چند فائلیں لے کر میرے پاس آ جاتے اور نئے سرے سے تفتیش شروع کر دیتے۔ میں نے ان کی اس آمد و رفت کا ذکر ایس بی سے بھی کیا لیکن انہوں نے ہنس کر ناں دیا اور یہ رائے دی کہ تھانیدار صاحب کو ایک پیالی چائے اور قریبی کسی دکان سے آدھ پاؤ مٹھائی منگو کر دے دی جائے تو وہ کارروائی ڈال کر جلد اٹھ جایا کریں گے۔ میں نے ایس بی صاحب کو بتایا کہ چائے تو ہمارے دفتر میں کمال کی جتنی ہے البتہ ہمارے قریب مٹھائی کی کوئی دکان نہیں ہے۔ انہوں نے کہا "تازہ مٹھائی کی چنداں ضرورت نہیں۔ کسی قریبی کھوکھے کے ٹین کنسٹر میں پڑی پرانی مٹھائی بھی آسانی سے چل جائے گی۔۔۔۔۔ خدا ایس بی صاحب کا بھلا کرے۔ انہوں نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب تھانیدار صاحب آتے تھے تو انہیں میرا پی۔ اے اور اکاؤنٹس آفیسر خود بھی سنبھال لیتے تھے مجھے ملنا نہیں پڑتا تھا۔

اس واقعے کو پورا ایک سال گزر گیا اور یہ عجیب بات ہے کہ میں نے اپنے استاد کی یاد میں کلا رنٹ کا ریاض باقاعدگی سے شروع کر دیا۔ رات کے چھلے پہر اپنی کوٹھی کے ایک مزوک چوبارے میں پرانے کاٹھ کپاڑ اور گودڑ پھونس کے اندر جب میں سٹول پر اکڑوں بیٹھ کر آسمان کی وار شروع کرتا تو میرے اندر دردی کی لہریں اٹھ اٹھ کر لے کی سنگت کر تیں اور میری محنت کی اٹھائی ہوئی لنگ کی چار دیواری کسی کسی لمحے پوری کی پوری ڈیہ کر فلیٹ ہو جاتی۔ گہری لذت کے اس وجد انگیز لمحے میں ساری کائنات میرے ساتھ اک مک ہو جاتی اور میں جھکا سا کھا کر ماؤ تھ پیس پرے کر کے اونچی آواز میں کہتا Oh! I Love you. Love you لیکن یہ لمحہ اس قدر مختصر ہوتا کہ میں پورا فخر بھی ادا نہ کر سکتا پھر مرگی کے جھٹکے سے نکلنے اور میں نسل ہو کر بیٹھ جاتا۔ لڑائیوں کی آوازیں آتیں، چھوٹے چھوٹے پرندے گرا ری دار بولی کا لوپ چلا دیتے۔ پو پھٹتی اور مجھے کوٹھڑی میں اپنے وجود کا احساس ہونے لگتا۔ کلا رنٹ کے جوڑ کھلتے۔ رومال سے پونچھے جاتے۔ ڈبے میں بند ہوتے اور ڈبے وچیں ایک طاقے میں رکھ دیا جاتا۔

پورے ایک سال بعد جب شہیدی گورو ارجن دیو پر سکھ یا تری اٹھایا اور افغانستان سے گورو دارہ ڈیرہ صاحب آئے تو ایک سکھ اور ایک سکھنی مجھے تلاش کرتے ہوئے میرے گھر پہنچ گئے۔ ان کے چہرے پر بھگدور کے آثار تھے اور وہ بے حد تھکے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ سردار گورو دیال سکھ نے کہا "میں ریٹائرڈ مجسٹریٹ درجہ اول ہوں اور چاندھر سے آیا ہوں۔ یہ میری دوسری بیوی ہیں اور آپ کے مالوے کی ہیں۔"

میں دوسری بیوی پر چونکا تو اس نے ہاتھ جوڑ کر فتح ہلائی اور ہنس کر کہنے لگی ان کی پہلی بیوی فوت ہو گئی تھی۔ پھر بچی کوئی تھا نہیں۔ ان کو مرنی تکلیف تھی تو انہوں نے میرے سے

بشاوی کر لی۔ میں کنیا مہا ویالا کی گرجیوٹ ہوں اور میں نے فیروز پور کے مشاعروں میں آپ کو لیڈی ہسٹن کا نسواری کرنا پڑنے کی بار دیکھا ہے۔

مجسٹریٹ صاحب نے ذرا سے ترش لہجے میں کہا ”اوہی میں نے دوسری بیوی اس لیے کہا تھا کہ میری اور تمہاری عمر کا فرق واضح ہو جائے تم نسواری کرنا لے کر بیٹھ گئی ہو۔“ اس نے خوش ہو کر کہا ”یہ پہنتے جو تھے اس لیے کہہ رہی ہوں۔ یہ درمیان میں دوسرا نکالا کرتے تھے۔“

سر داراجی نے کا آکر کہا ”اوئے جو کیس نہیں رکھے گا وہ دوسرا نکالے گا اور اسے کیا کرنا ہے؟ پھر انہوں نے معذرت بھرے لہجے میں کہا ”محاف کیجئے گا ہم اجازت لئے بنا آگئے لیکن ہم مجبور تھے۔ ہمیں گرجیوٹ بھائی باہلی کی تلاش ہے۔ میں نے تو خیر ان کو دیکھا نہیں لیکن میرے سرال والے سب ان کے عاشق ہیں۔“

ان کی بیوی نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ”اور میں سب سے زیادہ ہم ہر دوسرے بیٹے ان کا اور اس ستنے تخت پور جالیا کرتے تھے۔ سارا خاندان چھوٹے بڑے مرد و عورتیں سب۔۔۔۔۔ مجھ سے بڑا پیار کرتے تھے۔“

”اوئے یہ گرجیوٹ لوگ ساری جموں سے اسی طرح کا پیار کرتے ہیں“ مجسٹریٹ صاحب نے کہا ”لیکن ان کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ نکلا چڑت“ گیالی گرجیوٹ سب ایک ہی تھیلی کے منکے ہوتے ہیں۔“

میں نے کہا ”دھن بھاگ جو آپ میرے یہاں تشریف لائے اور میرا مان بڑھایا لیکن بھائی باہلی صاحب کے سلسلے میں بھی آپ کی طرح بے خبر ہوں۔ میرا ذاتی خیال ہے کہ وہ بارڈر کر اس کر گئے ہیں لیکن جھٹے کے ساتھ نہیں اس کے بعد۔“

”پنجاہ میں تو جتنے گوردوارے ہیں وہاں تو موجود نہیں۔“ بیگم مجسٹریٹ نے کہا ”کہیں اور چلے گئے ہوں تو کچھ کہہ نہیں سکتے۔ میرے چھوٹا چاچا جی نو ہمال سنگھ نے کہا تھا کہ آپ سے ان کا پتہ چل سکتا ہے۔“

میں نے کہا ”اصولی طور پر تو مجھی سے چلنا چاہیے لیکن میں بھی رہ گیا ہوں۔ کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس نے بھائی باہلی صاحب کو ترنادر میں دیکھا تھا۔“

”نہی بات کہیں سے میرے سوہرے کو بھی معلوم ہوئی“ مجسٹریٹ صاحب نے کہا ”اور تین دن لگا کر وہ ترنادر کی گلی گلی اور گھر گھر جھانک آئے پر ان کا کوئی پتہ نہ چل سکا۔“

ہوتے تو پتہ چلتا ہوں۔“

مجسٹریٹ کی بیوی نے کہا ”کچھ لوگ کہتے ہیں وہ کناڈا چلے گئے ہیں اور کئی منکھوں نے ان کو ٹورانٹو کے بڑے گوردوارے میں پانچھ کرتے بھی دیکھا ہے۔۔۔۔۔“

میں نے کہا ”ساتھ میں نے بھی تھا لیکن میرا دل نہیں مانتا۔“

”میرا دل بھی نہیں مانتا“ مجسٹریٹ صاحب نے کہا ”پر ان کو چھٹی ضرور لکھنی چاہیے تھی آپ کے نام۔ آخر آپ کا پرانا جنم مران کا ساتھ ہے گوردو چلے گا۔“

میں نے کہا ”آپ بالکل ٹھیک فرماتے ہیں۔ میرا ان کا ایسا ہی ساتھ تھا لیکن گوردو جب ایک مرتبہ روٹھ جائے تو پھر مشکل ہی سے مٹا ہے۔“

”ہاں ناں۔“ ویرجی ناں ”بیگم مجسٹریٹ نے انگلی اٹھا کر کہا ”گوردو کبھی ہراس نہیں ہوتا۔ چیلے کوستہ داوی رکھنے کے لیے دکھاوے کے طور پر ہراس ہو جاتا ہے۔ اندر سے اس کے ساتھ رہتا ہے مسوا دھان ہوشیار اور چو کس ہو کر۔“

”جھٹے کیسے معلوم ہے؟“ مجسٹریٹ صاحب نے پوچھا۔

”مجھے معلوم ہے ناں“ بیوی نے چرائی کیسا تھ شرمندگی ٹالتے ہوئے کہا ”پھر بھائی باہلی صاحب کی تو مجھے ہر اور کی دشا معلوم ہے!“

”کیوں تو ان کے ساتھ کیلیاتی رہی ہے“ مجسٹریٹ نے جھلا کر کہا۔

”کیلیاتی تو نہیں رہی“ بیوی نے شرمندگی سے کہا ”پر ان کی اسمرتی میں دیا ضرور جلا کر رکھتی رہی ہوں۔ وہ پوجہ گرجیوٹ ایک آکیلے تھے جن پر ساری سرشتی قربان کی جاسکتی ہے۔۔۔۔۔ میرا دل کہتا ہے وہ ایک دن اچانک آئیں گے اور سب کو درشن دیں گے۔“

”کیوں؟“ مجسٹریٹ نے پوچھا۔

”اس لیے کہ درام جھروکے بیٹھ کے سب کا حیرالے۔“

جیسی جاکی چاگری ویسا اس کو دے۔۔۔۔۔“ یہ دوبا پڑھ کر مجسٹریٹ کی بیوی رک گئی کہ اس نے لاقطع سی بات کر دی ہے اور موقع کل کے مطابق شعر نہیں پڑھا۔ لیکن مجسٹریٹ کو اس کا بالکل احساں نہیں ہوا اور وہ اسی طرح سے چائے میں چینی گول گول کر پیتا رہا۔

رفعت ہوتے وقت انہوں نے کہا ”ہم تو بڑی آس لے کر آئے تھے لیکن آپ کے یہاں سے بھی کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ اگر کچھ معلوم ہو جائے اور ان کی کوئی آگھ سکھ مل جائے تو ہم کو اس پتہ پر اطلاع کر دیں۔“

جسٹریٹ صاحب کا وزنگ کارڈ پڑھتے ہوئے میں نے بھی ان سے درخواست کی کہ اگر ان کو میرے ست گوروں کا کوئی پاس نشان مل جائے تو وہ مجھے بھی چیتا دینی دے دیں کیونکہ ان کے بغیر میری زندگی آدمی ہو چکی ہے۔

جسٹریٹ صاحب کی بیوی نے ہاتھ جوڑ کر مانگے ہوئے کہا ”ان کے بغیر تو بہت سے بندوں کی زندگیاں ورتھ ہو چکی ہیں۔ اب تو میں ایسے ہی زندگانی رہ گئی ہے۔ بے دھری اور خشک!“

جسٹریٹ صاحب نے کہا ”چلو چلو۔ جلدی کرو“ ان کو کوئی کام ہو گا۔۔۔ ایک تو ہم اطلاع کئے بغیر آگے دوسرے تم نے اپنی رام کٹھا شروع کر دی۔“

بابی نے گردن ہنسو کر سچ بلائی اور میں ان کو پھاٹک تک چھوڑنے گیا تو ان کا ٹیکسی ڈرائیور نیم تلے بیٹھا چھوہارے لکھا ہاتھ۔

۲۶

کوئی ہفتہ دس دن بعد کی بات ہے، میری بیوی نے ڈرائنگ روم کی صفائی کرواتے ہوئے صوفوں کی گدیوں کو اٹار کر بید سے جھاڑا تو اس صوفے کی گدی تلے سے کچھ کاغذ نکلے جو خاکی لفافوں کو کاٹ کر تحریر کے لیے استعمال کئے تھے۔ ان میں کچھ مفید اور بلی پیٹیاں بھی تھیں لیکن زیادہ تعداد خاکی کاغذوں کی تھی جو مختلف سائز اور مختلف کٹاؤ کے تھے۔

میری بیوی نے ان کاغذوں کو دیکھا۔ عبارت کو غور سے پڑھا لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ دفتر سے واپسی پر اس نے وہ کاغذ میرے حوالے کرتے ہوئے طرأ کہا ”یہ آپ کے گورو دیو کے کاغذات معلوم ہوتے ہیں۔ مثالی انہوں نے نکال کر کھائی اور لفافوں کو کاٹ کر تھمہ پے پیڑ بنائے۔“

وہ مڑے مڑے لپٹے لپٹائے اور اور کچھ بچھا بچھا قسم کے کاغذ انہی کے تھے اور ان پر انجلی کی نکھائی میں مختلف النوع عبارتیں درج تھیں۔ کچھ راگوں کے کھڑے تھے۔ کچھ بند شیش تھیں۔ کچھ شدھ راگوں میں بندھے ہوئے بھجن تھے لیکن زیادہ لمبی اور چھپیدہ عبارتیں ستر میں تھیں جو یوں شاید ان کے بھاشنوں میں مدد کے لیے مختلف حوالوں سے ایچی گئی تھیں۔ کہیں کہیں یہ بھی محسوس ہوتا تھا کہ وہ میرے لیے لکھی گئی تھیں اور انہیں سبھا میرے پڑھانے کے لیے محفوظ کیا گیا تھا۔ بہت سے سوال ایسے تھے جو میں نے ان سے پوچھے تھے لیکن انہوں نے ان کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کچھ نوٹس ان کے اپنے لئے بھی تھے جو ابھی تکلیک کے مراحل میں تھے۔

میں نے ان کاغذوں کو سیدھا کیا۔ ان کی پشت پر پانی کے ہلکے ہلکے تریڑے دے کر انہیں سیدھا کیا اور پھر ایک نئی فائل میں منتقل کر کے دفتر لے گیا۔
ایک کاغذ پر لکھا تھا:

انہد شہدوس طرح کے ہیں۔ ان کا باجو اپنے اپنے رنگ کا ہے۔ کوئی انہد باجو شہادہ ہوتا ہے کوئی فقیرانہ۔ پہلا شہد جن شہد ہے۔ دوسرا جن جن جھنگا شہد۔ تیسرا کھٹنے کی آواز۔ چوتھا کھٹنے کی آواز۔ پانچواں بین کی آواز۔ چھٹا مال کی آواز۔ ساتواں بانسری کی آواز۔ آٹھواں مردنگ کی آواز۔ نواں فقیری کی آواز۔ دسواں بادل کی سی گرج۔

پہلا شہد سننے سے سب روم بدن کے اٹھ جاتے ہیں۔ دوسرا سننے تن میں آگس چھپا دے۔ تیسرا سننے پریم کی زیادتی ہو۔ چوتھا سننے مغز میں سے خوشبو آئے۔ پانچواں سننے اکین اترنے لگے۔ چھٹا سننے گلے کے نیچے اکین آدے۔ ساتواں سننے اتر جاتی ہوئے۔ آٹھواں سننے تو باہر بھیتر سامن پڑے۔ نواں سننے ٹوکید ہونے کی سامر تھ ہو جائے۔ دسواں سننے سب بانٹا پیچھے ہو جائے ساری خواہش طلب تنگ و دو ختم ہو جائے۔ پر برہم ہو جائے گا۔ غاری میں ناک کی اپنا کو سلطان الاذکار کہتے ہیں۔ چشم بند گوش بند و لب پہ بند گردنہ پالی سر حق بر سن بجنہ۔ گورناک دیو جی فرماتے ہیں میں تین بند لگائے کے انہد سننے ٹوکور۔ نانک سن ساوہ میں نہیں سانجھ نہیں بھور حسب دیگر دھیانوں کے یعنی تصور ذکر ازمہ۔ ذکر قمری وغیرہ سے سلطان الاذکار افضل ہے۔

سن پڑے انہد کا باجو پر جاسے ہووے جسے راجا

سب ہی ساز تن میں بجیں چاہے کیسار آگ۔ دھن جا کو سن پڑن پڑے ہیں واکے بھاگ پیلے کاغذ کی پٹی پر لکھا تھا۔ تو کچھ نہیں ہے۔ اپنی خودی کو دور کر۔ کرتب یہ ہے کہ ایسا جانتا کہ سوائے خدا کے اور کچھ نہیں ہے۔ اور اس طرح بھی کہا جاسکتا ہے کہ سوائے میرے اور کچھ نہیں ہے۔ سب میں ہی ہوں اور جتن اپنے اختیار میں اور اصل جتن یہ ہے کہ خودی کو دور کرے اور دوئی سے نکلے جاتے۔ مسجد تیار کرانا کام بادشاہوں کا ہے۔ روزہ رکھنا اور ذکات دینا اور نماز پڑھنا کام گنہگاروں کا ہے۔ حج کرنا کام مسافروں کا ہے۔ روٹی کھانا کام درد مندوں کا ہے۔ پرہیز کرنا کام بیماروں کا ہے۔ غسل کرنا کام ناپاکوں کا اور عبادت کرنا کام امیدواروں کا ہے۔ گوشہ میں رہنا کام قیدی کا ہے۔ خوف اور رجائیں رہنا کام لڑکوں کا ہے۔ عاشق ہونا کام عیاشوں کا ہے۔ خدمت کرنا کام معاد تمندوں کا ہے اور بے خود ہونا کام مردوں کا ہے۔ اصل میں پیدا کرنے والا اور پیدا کنش سب ایک ہے جیسے جب تک دوات میں روشنائی ہے سیاہی کہلاتی ہے وہی جب کاغذ پر لکھنے میں آئی تو طرح طرح کی تحریر میں آئی۔ اب اس کو کوئی سیاہی نہیں کہتا بلکہ تحریر کہہ کر پکارتا ہے۔ مگر اصل میں جو تحریر ہے وہ

سب سیاہی ہے۔ پس اس طرح کل ایک ہی شے ہے۔ پیدا کرنے والا وہی ہے اور پیدا کنش بھی وہی ہے۔ مایا یعنی قدرت بھی وہی ہے۔ کامل و ناقص بھی وہی ہے۔

خاک لٹانے کے دوسری طرف لکھا تھا۔ دنیا اتم کہانی ہے کوئی ہید شاستری مہا کرتا ہے کوئی نندا کرتا ہے۔ کوئی بدیا کی مہا کرتا ہے کوئی خلاف اس کے بولتا ہے۔ کوئی ساوہ گرو کی سیدا کو کھ گاتا کہے کوئی کرم پاندا۔ گیان دھیان جوگ۔ چپ۔ تپ۔ پوجا۔ تیر تھ برت سب ہی کو اچھا کرتا ہے۔ پر مارتھی لوگ دھن کی نندا کرتے ہیں۔ دنیا دار دھن کو بڑا کہتے ہیں۔ کوئی نیک نامی کو بہت اچھا کہتا ہے۔ کوئی کہتا ہے نیک نامی بھی جگت کے لیے ہے۔ کوئی کہتا ہے ایکانت رہنا اچھا ہے کوئی کہتا ہے درس پرس اور ملنا ملا نا اچھا ہے۔ غرضیکہ ان لوگوں کو ایسے ایسے سند یہ اور چٹا اکثر سناتے ہیں بلکہ ست سنگ اور پر مار تھ سے ابھار کر دیتے ہیں۔ اگر انسان کہن کے عہد اور اپنے اوھکاوے واقف ہووے اور کچھ پات کو چھوڑ دیوے تو ایک سند یہ بھی پاس نہ چھٹے اور سب ایتھے دیکھیں۔

ایک شخص کے چار لڑکے ہیں۔ چاروں کی عمر عقل ذہن کوچ چلن اور بدن میں ایک دوسرے سے فرق ہے اور باپ کا مطلب یہ ہے کہ چاروں روزگار کریں۔ گھر سنبھالیں۔ نیک چلن ہو نویں خوش رہیں اور دوسروں کو خوش رکھیں۔

اب اگر باپ ایک ہی سیکھ اور ایک ہی تعلیم سب کو دیتا ہے تو کام نہیں چلتا۔ کس واسطے کہ عمر اور عقل وغیرہ میں سب کے فرق ہے۔ اب اس کو ضرور ہو کہ حسب استعداد اولیافت فی زمانہ ہر کو علیحدہ علیحدہ سکھ دیوے۔

سب سے بڑا لڑکا کھٹا پڑھا ہے۔ ہوشیار ہے۔ عمر پچیس تیس برس کی رکھتا ہے۔ تندرست ہے۔ بیاہ شادی ہو گیا ہے۔ اس کو اب باپ سیکھ نوکری کرنے کی دیتا ہے اور نوکری کے قاعدوں اور فائدوں کو سمجھاتا ہے۔ اگر وہ لڑکا تعریف اور سکھ سوداگری اور زمینداری وغیرہ کے بیان کرتا ہے تو باپ اس کا ہزاروں عیب اور نقصان ان میں دکھاتا ہے اور نوکری کو سب طرح سے مفید کہتا ہے کہ دیکھو نوکری میں عزت بڑی ہے۔ سو روپے کے شادی کی عزت لکھ پتی سے زیادہ ہوتی ہے۔ دو تین پہر نوکری کی پھر چھٹی ہے۔ معزز لوگوں کی صحبت میسر آتی ہے۔ علم و عقل کی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ حکومت ہوتی ہے۔ نام روشن ہوتا ہے۔ ہزاروں کی کار باری ہوتی ہے۔ بڑی رجوعات رہتی ہیں۔ اور سوداگری وغیرہ کیا ہے؟ کچھ بھی نہیں۔ بس پیٹ بھر لینا ہے۔ نہ علم میسر آتا ہے نہ چنداں عزت ہوتی ہے۔ گھر گھر پھرتا

پڑتا ہے۔ اسامی ڈوب جاتی ہے۔ دن رات فکر لینے دینے کی رتی ہے۔ جھوٹ بہت بولتا پڑتا ہے۔۔۔۔۔ کیونکہ لڑکا کہنے پڑھنے میں رہا تھا اس کو حسب فہمائش باپ کے نوکری بھی آسان اور مفید معلوم ہوئی۔ تلاش میں چل کھڑا ہوا نوکری پائی اور اس کا مطلب پورا ہو گیا۔

دوسرا لڑکا نہیں برس کی عمر رکھتا ہے۔ کچھ تھوڑا سی پڑھا ہے ذہن بھی اچھا نہیں ہے۔
شہزادہ سنی میں بھی فرق رہتا ہے۔ گفتگو میں بھی ربط و اجبی ہے۔ اس لیے لڑکے کو باپ واسطے
سوداگری اور دکانداری کے ہدایت کرتا ہے۔ اگر لڑکا نوکری کرنے کو کہتا ہے تو باپ نوکری
میں ہزاروں عیب نکال کر کہتا ہے یہاں نوکری غلامی ہے۔ ہر وقت حاکم کا خوف رہتا ہے۔
ویس گھر چھوٹ جاتا ہے۔ بچکونوں کے ساتھ کام کرنا پڑتا ہے۔ کل گھرا اپنے ذمہ ہوتی ہے اور
گئی کوٹیاں ملتی ہیں۔ نوکری میں سکھ نہیں۔۔۔۔۔ اور سوداگری میں یہ سب باتیں میسر آتی ہیں۔
گھر کی بادشاہت ہے نہ کسی کا حکم سہنا پڑتا ہے نہ کسی کی فرمائش سنی پڑتی ہے۔ روٹی کری کرائی
ہاتھ آتی ہے۔ رات کو گھر میں سونا ملتا ہے۔ سینکڑوں آدمیوں کی بھیڑ بھاڑ رہتی ہے۔ وقت
پر قابو ہوتا ہے۔ جب چاہا کام کیا جب نہ چاہا نہ کیا۔ کچھ بہت ساعلم اور گیان بھی نہیں چاہئے۔
اور ایسے پیشے والے دیکھ لو کیسے خوش ہیں۔ بڑے بڑے مکان تیار کراتے ہیں۔ لاکھوں
کرڑوں کی دولت ہے۔ کسی کی پرواہ نہیں رکھتے۔ لڑکے نے اپنا حال دیکھ کر اور باپ کی
نصیحت سن کر نوکری سے ہاتھ اٹھایا اور سوداگری کرنے لگا۔

تیسرے لڑکے کی عمر بارہ برس کی ہے۔ اس کو باپ واسطے تحصیل علم کے تاکید کرتا ہے اور فوائد علم کے سنا کر کہتا ہے کہ جو کھیل میں رہتے ہیں بد معاش ہو جاتے ہیں۔ روٹی کھانے کو نہیں ملتی۔ در بدر دھکے کھاتے ہیں۔ باپ اس کو کتب خانے کو رغبت دیتا ہے۔ کبھی کبھی بوقت ضرورت خوف دلا کر کہتا ہے کہ گھر سے نکال دوں گا۔ تجھ کو کھانے کو نہیں دوں گا۔ تمام رات کو ٹھڑی میں بند رکھوں گا۔ اگر کہنے سے نہیں مانتا تو مارتا بھی ہے اور کسی موقع پر دم دلا سہ بھی دینے لگتا ہے۔ پیار کرتا ہے۔ خود کھیل بھی کھلاتا ہے۔ اگر لڑکا گھر سے باہر جانے میں ڈرتا ہے تو اس کی امت بندھا تا ہے اور کہتا ہے کہ بد دن باہر جانے کے علم کیسے آوے گا۔ اور گھر کے رہنے میں لڑکے خراب بھی ہو جاتے ہیں۔ دوسرے لڑکے تیرا نام ڈرپو کنار کھ دیں گے۔ دیکھو باہر جانے میں بڑی سیریں دیکھنے میں آتی ہیں۔ تجھ سے کبھی چھوٹے لڑکے دن رات باہر پھرا کرتے ہیں اور مطلق نہیں ڈرتے۔ اب دیکھ بیٹے کہ لڑکے سے کچھ فائدہ دیا نقصان تو کر لی اور سوداگری کا نہیں بیان کرتا۔ جس سے مطلب ہے

اس کی تعریف بدرجہ اتم کرتا ہے۔

اب چوتھا لڑکا پانچ برس کی عمر کا ہے۔ اس کے لیے باپ کھیل کا سامان بناتا ہے۔ کھلونے خرید کر لاتا ہے۔ اسے کھلاتا ہے۔ اس سے ہنسا کرتا ہے۔ اس کی بے وقوفیوں کو ناز سمجھتا ہے۔ اس سے دن رات جھوٹی جھوٹی باتیں کرتا رہتا ہے۔ جھوٹے اقرار کرتا ہے۔ طرح طرح کی کہانیاں سناتا ہے۔ اگر لڑکا باہر نکلتا ہے تو اس کو باہر جانے کو منع کرتا ہے اور کہتا ہے باہر جانا اچھا نہیں ہوتا۔ چور پکڑ کر لے جائے گا۔ جو کوئی چاہے گا تجھے مار ڈالے گا۔ گھر سے باہر کبھی مت جانا۔ باہر پاؤں رکھنا بہت بُرا ہے۔ اب لڑکا باعث خوف و خطر گھر سے باہر نہیں جاتا۔ گھر میں کھیلتا ہے۔ لڑکے کو بھی اچھا اور باپ بھی راضی۔ اس لڑکے سے نکلنے پڑھنے کو نہیں کہتا۔ علم اور نوکری اور سوداگری کے فائدے نہیں سناتا۔

دیکھو اب اس شخص نے علیحدہ علیحدہ فصیحین چاروں لڑکوں کو کس دور بالکل الگ الگ کیے۔ بعض جگہ اچھی بات کو بُرا کہا اور بعض جگہ بُری بات کو اچھا مگر کوئی اس شخص کو جھوٹا نہیں کہے گا۔ نہ غلط کہے گا بلکہ عقلمند سمجھ والا کہے گا..... اس کے آگے کاغذ پچکا تھا شاید منضائی کا لافانہ تھا جس کی وجہ سے لکھائی پڑھی نہیں جاتی تھی۔ ساری عبارت پچکنائی میں اتر چکی تھی۔ ایک کھداری سے کاغذ پر گوز کھسی سی میں کچھ لکھا تھا جو تحریر کے انداز سے نظم دکھائی دیتا تھا۔ اس میں جگہ جگہ الفاظ کاٹے ہوئے تھے اور ان کی جگہ دوسرے الفاظ لکھے گئے تھے۔ کونوں میں فارسی کے باریک رسم الخط کے شعر تھے جو اپنی پیچیدگی کی وجہ سے ٹھیک سے پڑھے نہیں جاتے تھے۔

اسی گھدری کاغذ کی دوسری طرف اردو میں تبدیلی مذہب پر ایک پیر اور جتھا جو شخصیں تبدیلی مذہب کر ڈالتے ہیں اس کی یہ صورت ہے کہ حضرت کو اپنے باپ دادا کی جمع پونجی تو معلوم نہیں ہوتی کہ کتنے کروڑ خرانے رکھے ہیں اور دوسری طرف سے یقین کر کے کہ یہ بڑا جمع والا ہے جھٹ اپنے مالک کو چھوڑ کر دوسرا مالک کر لیتے ہیں۔ یہ دستور ہے کہ جب ایک مذہب والا دوسرے مذہب کی سزا کرنا ہے تو جو باتیں اس میں چھوٹے چھوٹے مقبذوں کے لیے لکھی ہیں ان کو سنا کر اپنے یہاں کی بلند سے بلند باتوں سے مقابلہ کر کے پھیلالیتے ہیں۔ اپنے گھر کی تور سوئی کاڑ کر کرتے ہیں اور دوسرے کے گھر کے بیت الخلاء کا نقشہ دکھاتے ہیں۔ پس بھوکاروٹی کے لالچ میں پھنس جاتا ہے۔ مگر چونکہ تعصب مذہب بھی درست ہے پس جس نے تبدیلی مذہب کر لیا کچھ عیناد نہیں کیا اور جس نے مذہب بدل اس کو بھی گناہی

نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس غریب کے بموجب معرفت میں داخل کیا۔ ہاں اتنی بات ہے کہ اپنے گھر کی اچھوتی روٹی چھوڑ کر دوسرے کے گھر کو جو ٹھن جا کھائی۔

اس کاغذ کی دوسری طرف لکھا تھا: جسم و زبان اور عقل و حواس اور دل کو قابو میں رکھ کر ہاتھ جوڑے ہوئے گورو کو دیکھا ہوا سامنے کھڑا ہے۔ گورو کے سامنے ایسا طریقہ اختیار کرے کہ جیسا گورو بھوجن کرے اس سے ادنیٰ درجہ کا بھوجن آپ کرے اور جیسا کپڑا گورو پہنے اس سے کم درجہ کا کپڑا آپ پہنے۔ جیسی صورت سے گورو ہے اس سے کمتر صورت میں آپ رہے۔ گورو بیٹھے ہوں تو آپ کھڑا ہو کر اور گورو کھڑے ہوں تو آپ چل کر اور گورو چلتے ہوں تو آپ سامنے جا کر اور اگر گورو دوڑتے ہوں تو آپ بھی پیچھے دوڑ کر گفت و شنید کرے۔ گورو کے پاس شہید کا بستر اور آسن پیچھے ہونے چاہئیں۔ گورو کے سامنے حسب من پسند ہاتھ پاؤں پھیلا کر نہ بیٹھے۔ جہاں گورو کا سچایا جھونا عیب کہا جاتا ہو وہاں سے اٹھ جائے یا اپنے کان بند کر لے کیونکہ گورو کا سچایا جھونا عیب کہنے سے گدھال اور مندا کرنے سے کتا ہوتا ہے اور گورو کی بڑائی نہ سہہ سکتے سے بڑا کپڑا ہوتا ہے۔ اٹھان کرانا اٹھان لگانا جو ٹھا کھانا اور پاؤں دھونا یہ سب کام گورو کے بیٹے کے نہ کرے صرف گورو ہی کے کرے۔ جو برہم چاری شریر تیاگ کرنے تک گورو کی سیوا کرتا ہے وہ بلا محنت اپنا شی برہم لوک کو پاتا ہے۔

اگر اے بیٹے نے اپنے چچا کو دید پڑھایا اور بیٹا کہا۔ وہ چچا تھا ہو کر دیوتاؤں سے پوچھنے گیا۔ دیوتاؤں نے جواب دیا کہ اس لڑکے نے ٹھیک کہا کیونکہ جو کچھ نہیں جانتا وہ بالک کہلاتا ہے اور جو مترو دیتا ہے وہ ہاپ کہلاتا ہے۔

ہلکے خیلے رنگ کی چھوٹی چھوٹی پرچیاں تھیں لیکن ان پر گورو کبھی میں عبارت لکھی تھی۔ میں نے یہ سارے کاغذ سنبھال کر اور سب سے کرپلا سنگ کے ایک لفافے میں رکھ لئے۔ بڑی دیر تک میں یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ انہوں نے یہ کاغذ میرے لیے چھوڑے ہیں یا ان کے اپنے لوٹس ہیں جو وہ بھول گئے ہیں۔ نفس مضمون سے لگتا تھا کہ یہ تحریریں مجھے بتانے اور سمجھانے کی غرض سے لکھی گئی ہیں اور ان میں میرے بہت سے ان پوچھتے سوالوں کے جواب موجود ہیں۔ لیکن ان پر چوڑوں کے اچانک اور یکایک ہونے کی بنا پر اندازہ ہوتا تھا کہ استاد مکرّم کے لوٹس ہیں جو انہوں نے اپنی تقریروں میں استعمال کرنے کے لیے جمع کئے ہیں۔

اس غرض میں دو تھانیدار تبدیل ہو گئے اور تیسرا آگیا جو ہیڈ کا فیصل سے ایس ایچ او

ہوا تھا۔ اس کا رویہ پہلے دو تھانیداروں سے مختلف تھا اور اس کا لب و لہجہ بھی کچھ عجیب سا تھا۔ اس نے اپنی گفتگو سے مجھے یقین دلادیا تھا کہ بھائی باپلی مگر منتھی کوش نے چھپار کھا ہے اور میں ہی اس کی سناوا بھئی "کا زمرہ دار ہوں۔"

پولیس کا کاروبار بھی عجیب ہے۔ اس میں ایک مرتبہ جب کوئی شے مسل کے اندر داخل ہو جاتی ہے تو پھر اس کا لکنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عدالت اپنا فیصلہ دے دے۔ سارے معاملے کی اصل حقیقت سمجھ کر اس کو نپٹا دے۔ معاملہ داخل دفتر ہو جائے۔ اس کی کوئی قانونی معاشرتی اخلاقی اور منطقی وجہ زندگی نہ رہے پھر بھی پولیس والے اس کو اپنی مرضی سے دوبارہ نکال کر اس پر تفتیش شروع کر دیتے ہیں۔ اس معاملے میں جان تو نہیں ہوتی نہ ہی اب اس کا حقیقت سے کوئی تعلق ہوتا ہے لیکن پولیس والے اس میں جھوٹی جان ڈال کر اور اس نڈلے کو کپڑے میں لپیٹ کر اس ڈسے ہوئے شخص کو پھر سے ڈرانے آ جاتے ہیں جو ایک مرتبہ کالے کے کانٹے کا شکار ہوا تھا۔ اب کی بار وہ مظلوم کے حالی بن کر ایک جھوٹے نڈلے کو محافظ بنا کر ساتھ لے آتے ہیں کہ اس کے دودھ پانی کا بندوبست کر دیتے پھر وہ کالا عمر بھر آپ کے نزدیک نہیں آئے گا۔

میں اپنے کیس میں بری طرح زنج ہونے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ محکمہ پولیس کے کارندے دراصل اس پیشے کے اہل نہیں ہوتے اور ان کو زبردستی اس کام پر مامور کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ چلیں بھرنے، بھینس چرانے، گڑھا کھودنے، زری بننے، کھوڑا نہلانے اور گزرتی ہوئی عورتوں کو دیکھ کر ٹپے گانے کے لیے بے ہوتے ہیں ان کو شر لاک ہو مز کے ہار یک کام پر فائر کر دیا جاتا ہے۔ اب وہ بھارے کیا کریں اور کس طرح سے یہ ذمہ داری نبھائیں اور کس کو بتائیں کہ یہ کام ان کے کرنے کا نہیں۔ انہیں زبردستی اس میں پھنسا دیا گیا ہے۔ جب ان کی فریاد اور نال و شیون کو کوئی نہیں سنتا وہ راہ چلتے لوگوں کو "زور زبردستی" پھنسانے لگتے ہیں اور اپنا غم فطرت کرتے ہیں۔ دراصل ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا وہ اس کام کے لیے بنے نہیں ہوتے اس مخصوص فنی پیشے کے لیے "مٹ آؤٹ" نہیں ہوتے۔

میں نے بہت کوشش کی۔ بڑا سرمایہ ہر ممکن طریق سے ڈھونڈا۔ دور دور سے معلومات حاصل کیں لیکن استاد گرامی کا کچھ پتہ نہیں چل سکا۔ یوں بھی جب وقت کے بہت سارے اوراق ایک ساتھ الٹ جائیں تو پچھلے باب آپ سے آپ دب جاتے ہیں اور نئے نقشے اور نئی صورتیں سامنے آ جاتی ہیں۔

ایک ایک دن کر کے تین سال کا عرصہ گزر گیا اور ہمارے درمیان موت کی دراز قد محبوب کو لیے اٹھا کر لیٹ گئی۔ زندگی کے اندر وہ جو ایک کھٹ مارنے اور سپرٹ مارنے کا پنگا تھا وہ ختم ہو گیا۔ وہ جو گرمیوں کے اندر ایک کم قیمت موم بنی کچھ اپنی گرمی سے کچھ باہر کی گرمی سے خمد ہو جاتی ہے زندگی بھی ایسی ہی "بچپن کی غلط کاریوں" جیسی ہو گئی۔ اوپر سے ٹھیک ٹھاک "سرخ و سفید نمونہ" اندر سے ماتھے ہی ماتھے۔ جب زندگی کے سامنے کوئی بڑا مقصد نہ ہو تو یہ ایک اولڈ سنسٹر کی طرح صاف ستھری دھلی دھلائی پاکیزہ سی ملی بن کر غلطی گدی پر بیٹھی رہتی ہے۔ کوئی بلا اس کی بے مقصد پاکیزگی کی وجہ سے قریب نہیں آتا۔

کچھ ایسی ہی زندگی تھی اور کچھ ایسا ہی کام تھا۔ بلکہ زندگی میں ڈائریکشن نہ ہونے کی وجہ سے کام اور بڑھ گیا تھا اور مصروفیت کے انبار لگ گئے تھے۔ زندگی کے لان پر آوارہ گرد کتے رات کو گندے کام کر کے جگہ جگہ گند پھیلا گئے تھے۔ ایسے میں کیا ہو سکتا تھا۔

میں ایک جگہ سے اٹھا اور دوسری جگہ جا کر بیٹھ گیا۔ لیکن وہاں بھی کچھ نہیں تھا۔ وہ جگہ بھی ویسی ہی شاواں و فرحان تھی اس کے ارد گرد بھی دیوہی گند تھا..... کتابوں میں لکھا تھا کہ مشکل کے وقت سکاوٹ مسکراتا اور سیٹی بجاتا ہے۔ میں نے مسکرا کر سیٹی بجانے کی کوشش کی تو پھونک دانتوں کے اندر سے نکل گئی۔ سیٹی نہ بج سکی۔ جب سیٹی نہ بجی تو میں شرمندہ ہو کر مسکراتے لگا۔

ایک روز اخبار میں خبر دیکھی کہ حیدر آباد اور کراچی کے درمیان ٹینٹل ہائی وے پر کراچی سے پشاور جاتے ہوئے ایک آئیل ٹرک نے حیدر آباد سے کراچی آتی ہوئی ایک فوکسی کو ٹکرا دی۔ یہ ٹکر تو کچھ ایسی شدید نہیں تھی لیکن اس نے فوکسی کا رخ پھر حیدر آباد کی طرف موڑ دیا۔ اندر بیٹھی ہوئی سوار یوں کو غراش تک نہ آئی۔ موٹر کا کوئی نقصان نہ ہوا اور گاڑی اس طرح سے چلتی رہی مگر الٹی سمت کو۔

البتہ اس ٹکر سے فوکسی کو آگ لگ گئی اور وہ دیکھتے دیکھتے تاریخی خیلوں کا ایک ایسا جہاز بن گئی جس کی چوٹی پر کالا سیاہ حوالاں گھٹا ٹوپ اندھیرا بن کر آسمان سے وصل ہو گیا۔ فوکسی کے دونوں دروازے جام ہو گئے اور اس کے اندر بیٹھی ہوئی سواریاں پیچھے چلانے اور تڑپنے لگیں۔ دونوں طرف کا ٹریفک رک گیا۔

کراچی سے آتے ہوئے ایک تاجر نے اپنی مر سڈیز کی پچھلی سیٹ سے دیکھا فوکسی کے اندر ایک دروازہ بخوبی صورت لڑکی دونوں ہاتھ باندھ کر باہر کھڑی پبلک سے اٹھا کر رہی تھی اور لوگ سبے کھڑے تھے۔ وہ کبھی دونوں ہندے ہاتھ اس شیشے کے کونوں کی طرف لہراتی کبھی دوسرے شیشے کی جانب لیکن کسی میں بھی آگے بڑھنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔

سیٹھ اپنی مر سڈیز کا دروازہ کھول کر پبلک کی طرح لپکا اور فوکسی کا دروازہ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔ چنڈل کو گرم پا کر اس نے جلدی سے رومال نکالا اور ہاتھ پر لپیٹ کر چنڈل پر زور لگانے لگا۔ دروازہ نہ کھلتا تھا نہ کھلا۔ سیٹھ کے براؤن کوٹ کے لیبل کو آگ نے پکڑا تو اس نے سینے پر ہاتھ مار مار کر آگ کا لا بند مٹا دیا۔ گاڑی کے پیچھے سے ہو کر وہ دوسرے دروازے پر پہنچا تو اس کا چنڈل زیادہ گرم اور زیادہ مضبوطی سے بند تھا۔ اس نے چیتابی کے عالم میں چنڈل کو زور زور کے جھٹکے دیئے اور چنڈل اور جام ہو گیا۔

سیٹھ کے کوٹ کے گھیر کو آگ نے پکڑ لیا۔ اس کے سر کے بال راکھ ہو کر گر گئے۔ اس نے ناامیدی اور نامرادی کے عالم میں چنڈل کو اس زور سے دھلایا کہ گاڑی کی پوری سائیڈ اوپر اٹھنے اور نیچے گرنے لگی۔ اپنی سیدھ بدھ کھو کر اور مکمل طور پر بے اختیار ہو کر اس نے اپنا ہاتھ جلتی ہوئی فوکسی کی چھت سے ٹکراتا شروع کر دیا اور دیوالگی کے عالم میں اپنا سر اس زور سے بجایا جیسے مست مہنگ درگاہ کی سلوں سے اپنا سر ٹکرایا کرتے ہیں۔

اپنا ایک دوسری طرف کا دروازہ کھل گیا اور فوکسی کے تینوں مسافر چنچیں مارتے باہر نکل آئے۔ سیٹھ نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی اور اس کا وجود جلتی ہوئی گاڑی کے ساتھ چسٹ کر رہا۔

گیا۔ مرد عورتیں اونچی اونچی آوازیں رونے اور بکھرنے لگیں۔ سیٹھ کا جلتا ہوا وجود پہلے
برہنہ ہوا۔ پھر لال انگارہ پھر کالا سیاہ اور پھر پھول کر گاڑی کے ساتھ ایک کھبا سا بن گیا۔
بڑی دیر بعد فائر بریگیڈ پہنچا اور گاڑی پھنسنے سے بچائی گئی۔ چنے ہوئے سیٹھ کی موتھ کو
بڑی مشکل سے اور بڑی بیدردی سے گاڑی سے الگ کیا گیا اور اسے اس کی سرسبز میں ڈال
کر گھر واپس بھیج دیا گیا۔

یہ تفصیل جو میں نے ابھی بیان کی اگلے دن کے اخبار میں پوری جزئیات کے ساتھ
چھپی تھی اور اس میں شوقین مزاج سیٹھ کی بد معاشی کے ساتھ مسکراتی ہوئی تصویر تھی۔۔۔۔۔
سیٹھ میرا پیارا دلیر جانی بابا سنگھ شاہ تھا جو بعد میں گجرات پکھری کا وختیہ نویس بنا
اور پھر ایک سپورٹ کا تاجر بن کر جرمنی اور ہالینڈ رودہ بھیجے لگا۔ اب وہ اپنی تجارت کو مزید
وسعت دینے کے لیے بہاولپور اور ملتان جا رہا تھا اور راستے کے مذبح خانوں کی تفصیلات بہم
کر رہا تھا۔ اس کو یقین تھا کہ اگر وہ ان مذبح خانوں سے رابطہ کر کے اور اپنے ایجنٹ وہاں بٹھا کر
بلا واسطہ طور پر رودہ حاصل کرنے لگے گا تو ایک قواسم بھی بہت سستا پڑے گا۔ دوسرے
رودے کی وافر سپلائی سے وہ ہالینڈ کی مارکیٹ بھی اپنی گرفت میں لے لے گا۔ لیکن ہالینڈ کی
منڈی کو گرفت میں لینے سے پہلے وہ خود لات کی لپیٹ میں آ گیا۔

یہ کیوں ہے؟ اور ایسا کس لیے ہوتا ہے اور اس کا کون ذمہ دار ہے۔ میں نے پورے
دھرم ایمان اور علم حلیان کے ساتھ اس پر سوچا۔ کافر، مشرک اور ناشک ہو کر اس پر غور
کیا۔ تشکیک کے کھلے میدانوں میں عقل اور منطق کے گھوڑے دوڑائے۔ نہ کوئی آگے نکل
سکا نہ پیچھے رہا۔ پھر فلسفہ اور نفسیات کا سہارا پکڑا۔ اس نے بہت ساری گتھیاں سلجھائیں لیکن
سلجھانے کے بعد ایک ایسے مقام پر لے جا کر چھوڑ دیا کہ واپسی کے سارے راستے گم ہو گئے۔
بڑی دیر تک فرائینڈ اور مارکس کا مطالعہ کیا۔ ان کو سیٹھا سیٹھا پڑھا۔ استادوں سے مدد لی لیکن
آخر پر پہنچ کر یہی معلوم ہوا کہ دونوں ہی ایک مٹھے کے اندھے فقیر تھے۔ ایک زن کی صدا
لگاتا تھا دوسرا ان کی۔ لیکن کسی سے کچھ دان دکھنا نہ مل سکی۔ جیسے خالی ہاتھ آئے تھے ویسے
ای خالی چھوٹی لے کر واپس چلے گئے۔ زندگی کا کوئی بھید نہ کھلا۔

ایک چوٹی لالو کھیت سے چلتی چلتی کھنٹن کے ساحل پر پہنچی۔ لڑکی پانچے چڑھائے
سمندر کی چھوٹی چھوٹی لہروں میں بھاگی پھرتی تھی۔ لڑکے نے ریت پر دری بچھاتے ہوئے
اور کھانے کی اشیاء چاروں کناروں پر بچھاتے ہوئے غور سے نیچے کی طرف دیکھا تو چوٹی
ریت کے ایک موٹے سے ڈوڑے کو پرے دھکیلی کر دری پر چڑھ رہی تھی۔ لڑکا اسے اتنی دور
سے ایسے ٹانوس ماحول میں دیکھ کر حیران ہوا اور پھر ہنس کر بولا "بوا! اوھر کہہ رہی تھی"۔
چوٹی نے ہانپتے ہوئے کہا "میاں لالو کھیت سے یہاں تک کا سفر بارہ دن میں طے کر
مشکل سے سمندر کنارے پہنچی ہوں اور اب بھوک سے غرہاں ہوں۔"

لڑکے نے کہا "حیرت ہے آپ کی عقل پر! یہاں آپ کی پسند کا دانہ دٹکا کہاں؟ یہ تو
سمندر ہے۔ یہاں تو ریت ہے یا پھر پانی! آپ نے بھوکوں تو مرنا ہی تھا۔"
چوٹی نے کہا "میاں ایک زمانے کی غلط دل میں پوشیدہ تھی کہ سمندر کو دیکھوں۔"

اس کو سمجھوں اور اس کے بارے میں کوئی رائے قائم کروں۔ سو یہاں آگئی ہوں۔ اب اس کی وسعت کا اس کی گہرائی کا اور اس کی گہرائی کا خود اندازہ لگائوں گی اور واپس جا کر اپنی قوم کو تفصیل سے بتاؤں گی کہ سمندر اصل میں ہوتا کیا ہے اور اس کی حقیقت کیا ہے؟

اسی طرح انسان زندگی کے بارے میں ٹانگ ٹوٹیاں مارتا رہتا ہے۔ کبھی نظم، کبھی نثر، کبھی ریاضی کے معاملات میں۔ کبھی زمینی دور بین سے کبھی آسمانی مہل سے۔ کبھی مفروضوں کے زور پر کبھی ایمان و اعتقاد کے سہاروں سے ٹک کر۔ لیکن بھید کھلتا نہیں ہے کہ فرما دیا گیا ہے کہ ہاں تم کو علم دیا گیا ہے الا قلیلا!

میرے صاحب فرمایا کرتے تھے کہ شفا کی یہ زندگی کچھ نہیں بس ایسے ہی کھیل تماشا ہے۔ اس کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ بس اس کے اندر سے گزر جانا چاہیے۔ بہتے کھیلنے لگاتے بجاتے ریز پڑھتے 'عدی خوانی کرتے' 'نعرے مارتے' 'آنسو بہاتے' 'ناکام ہوتے' 'خوشی مناتے' 'صلیب اٹھا کر سولی چڑھتے' 'سولی سے اتر کر پھاگ کھیتے' 'لنگوٹی اتار کر دھوپ میں کھڑے ہوتے' 'دھوپ سے نکل کر سیلاب میں ڈوب جاتے' 'تو پھر اٹھتے' 'بھر آتے' 'تو لوگ پکڑ لیتے'۔۔۔۔۔ یہ تو لمبا کھیل تماشا ہے، پیسے بچے سوئی کے گھوڑے پر سوار ہو کر گل کے دس دس پتھر لگا لیتے ہیں اور ان کا بھی نہیں بھرتا۔ منزل آگئی جاتی ہے پھر بھی گھوڑا بچکے پھرتے ہیں۔

میرے مرشد 'میرے استاد' میرے گرد بھائی اقبال سنگھ گر نٹھی پتھر نہیں اب کہاں تھے۔ ان کا ٹھیک ٹھور ٹھکانہ معلوم نہیں تھا لیکن اندر کے بھیدی جانتے تھے کہ وہ آسام کی طرف نکل گئے تھے اور ناگالینڈ کے لوگوں کے ساتھ نیا تعلق پیدا کر لیا تھا۔

جو لوگ ان سے مل کر آئے تھے انہوں نے بتایا کہ گوبائی کے چھوٹے گوردوارے کی میانی میں رہتے ہیں۔ شبد کیرتن کرنے کے بعد اپنے آپ کو اس میانی میں بند کر لیتے ہیں اور کسی سے ملتے نہیں۔ بھائی بدھ سنگھ سیوا دار کو حکم ہے کہ اگر علاقے کا گوردوارہ بھی ملے کے لیے آئے تو اس کو انکار کر دیا جائے۔

جن لوگوں نے شبد کیرتن کے بعد ان سے بات کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر جواب دینے سے منع کر دیا۔ سب یہی کہتے تھے کہ انہوں نے دیکھا ضرور ہے۔ سنا ضرور ہے پر بھائی باہلی سے کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ وہ مسکرا کر کندھے پر ہاتھ ضرور دھرتے ہیں لیکن کسی بات کا کوئی جواب نہیں دیتے۔ اور اگر گوبائی گوردوارے سے آئے

والے ایک سے زیادہ ہوں تو پھر جھگڑا شروع ہو جاتا ہے اور وہ آپس میں بحث کرتے ہوئے ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ ان کو یقین تھا کہ وہ گر نٹھی بھائی باہلی ہی تھے۔ اگر وہی تھے تو پھر انہوں نے اپنا پتا کیوں بدل لیا ہے۔ اگر بدل ہی لیا ہے تو وہ پنجاب سے آنے والوں کی سنگھ ساند کیوں نہیں لیتے۔ کیا وہ کچ بچ ہیں یا پردہ کر گئے ہیں اور ان کی آتما گر نٹھی کے روپ میں آکر شبد کیرتن کر جاتی ہے۔ اگر وہ آتما نہیں ہے جو گوردوارے کی میانی میں رہتی ہے تو اس نے آج تک بھائی بدھ سنگھ سیوا دار سے کوئی کھانے پینے کی چیز کیوں نہیں مانگی۔

جھگڑا کرنے والے پوچھتے ہیں کہ اگر وہ صرف آتما ہیں اور آتما کسی سے کوئی بات نہیں کرتی تو انہوں نے ملوث کی کر پور درزن سے یہ کیوں پوچھا کہ "تخت پور کی راجنی کیسی ہے؟ اور کر پور کا جواب ملنے پر کہ راجنی تو سودائی ہو کر گھر سے نکل گئی ہے اور اب شمشان بھونی میں رہتی ہے" تو بھائی باہلی نے ٹھنڈی سانس بھر کر یہ کیوں کہا تھا کہ "بس کر پور پر سنسار تو کھیل تماشا ہے اور اکالی پر کھ کی لیلیا اس سے آگے کچھ نہیں؟"

پر بہت سے لوگ ایسے ہیں جو اسے کھیل تماشا نہیں سمجھتے۔ وہ کہتے ہیں یہ دنیا ایک حرکی قوت ہے اور اس کے آچار سائنس کے طے شدہ اصولوں کے مطابق رونما ہیں۔ یہ کھیل تماشا کہہ کر ہو گیا! اندہ ہی لوگ ایسے ہی یادہ کوئی کرتے رہتے ہیں۔ ان کا تہاہو۔ یہ دفع بھی نہیں ہوتے ساتھ ساتھ چلے آتے ہیں۔

ایک کوئی بڑا میانی تھا۔ گورا گیانی۔ وہ کہا کرتا تھا "بھائی یہ دنیا تو ایک سادہ اور صاف خفگی ہے اور میرا یقین ہے کہ زندگی کے کوئی معنی نہیں۔ اس کا کوئی مطلب نہیں۔ بس ایک موجود خلا اور با حقیقت خلا ہے جس کو ہم انفرادی طور پر اور اجتماعی طور پر اپنے ذخیرہ الفاظ سے بھرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں اور ایک مقام ایسا آتا ہے جب بڑا سوچا سمجھا جانا پڑتا ہے اور چھانا پھکانا ذخیرہ الفاظ ایک ہڈیاں میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ہک بک جھک اور بسیار کوئی کی ایک لمبی لڑی بن جاتا ہے۔ سادے سیانے بیانے و انشید اور نیک بناد و انشور ستھ ستھ مارنے لگتے ہیں اور بے شمار لفظوں کی دھونکیاں چلا کر ہانپنے لگتے ہیں اور با حقیقت خلا اور با حقیقت ہو جاتا ہے!

میرا یاد ملک انجیار، منگل شاو، عیش پسند اور عیش کوش، عبادت کے ٹوکیے کیلوں والے پچھے پر بیٹھا اس دنیا کے مزے لے رہا تھا اور چٹھارے بھر رہا تھا۔ اس کو کیا ہوا۔ یا اس نے کیا کیا کہ اپنی خوبصورت سی 'تھری چیس کی پلیس' زندگی چلتی چتا کے حوالے کر دی اور

موٹر کے ہینڈل سے ہاتھ نہ چھڑوا سکا۔ اور جن کو سر جانا چاہئے تھا جو موت کے گولے کے اندر بند تھے اور موت کے شجرے میں محبوس تھے اور دوسرا دروازہ کھول کر باہر نکل آئے۔ اگر ہم ایک دنیا بنائیں تو کیا وہ موجود دنیا سے بہتر نہ ہو۔ اس میں خطرے کے وقت پہلے تو تھکنی بجا کرے۔ پھر حفاظتی دروازے خود بخود کھل جائیں۔ سیر حیاں آپ سے آپ لگ جائیں۔ ہنڈوے کنوئیں کو گڑوں کی طرح اوپر چائیں اور لوگوں کے ڈھیر اٹھا کر نیچے اتار آئیں۔ کوئی حفاظت تو ہو سکیورٹی تو ہو۔ اب تو زندگی ایسے ہی کھڑی ہے۔ الف ٹنگی۔ کسی کو کچھ دیتی ہی نہیں۔ دے ہی نہیں سکتی۔ اس کے اختیار میں ہی کچھ نہیں۔ اس سے تو انشورنس کبھی لاگھی ہے۔ ایک سکیورٹی تو ہے۔ بند اچا ہے رہے نہ رہے لیکن اس کی سکیورٹی تو باقی رہ جاتی ہے۔ جیسے مرنے والے کے بعد اس کی ٹوپی 'صدری' سوئی اور جو باقی رہ جاتی ہے۔

لیکن جانے والا رک رک کر اور مقابلہ کر کے جا رہا ہے۔ جیسے جانور مرنے سے پہلے موت کا بھرپور انداز میں مقابلہ کرتا ہے۔ وہ موت کو روک کر مقابلہ کرتا ہے۔ موت کے روکنے پر پورا زور لگاتا ہے اور زندگی کے لیے لڑتا ہے۔ ایک ڈوڈا آدمی سے زیادہ سانپ کے منہ میں جا کر پورا زور لگاتا ہے اور اپنے پچھلے پنجوں کی کھدیز سے ہار ہار سانپ کے منہ سے باہر نکل آتا ہے۔ باہر نکل کر وہ کھبک جانے کی کوشش کرتا ہے لیکن سانپ اسے پھر پکڑ کر اپنے منہ میں ڈٹ کر لیتا ہے۔ اس دھینگا شستی چھینا جھینا اور بچن بچاؤ کے بعد سانپ بالآخر ہمت کر کے اسے منہ میں ڈال کر اندر اتار لیتا ہے۔ یہی حال انسان کا ہے۔ میں نے جانوروں کو لڑتے دیکھا ہے انسان کو لڑتے دیکھا ہے۔ اور ایسے میں لڑتے دیکھا ہے جب حالات ان کے مخالف تھے اور وہ دشمن کے ساتھ مل گئے تھے۔ ان کو ابھی طرح سے معلوم تھا کہ اگر بچ گئے تو چوڑی اتر جائے گی لیکن وہ لڑتے تھے اور زندہ رہنے کے لیے موت کے آخری کنارے تک لڑتے تھے۔ شاید ہم کسی خاص شے کے لیے یا کسی خاص آدرش کے لیے نہیں لڑتے بس ایسے ہی لڑتے ہیں۔ زندہ رہنے کے لیے اور زندگی سے پیار کرنے کے لیے اور زندگی کو پیاری بناتے رہنے کے لیے۔ لیکن پتہ نہیں اصل راز کیا ہے اور میں جو یہ کہو اس کو رہا ہوں تو میں اس پر کوئی اتھارٹی نہیں ہوں۔ مجھے تو سنگل شاہ کی وجہ سے یہ سب باتیں سمجھ رہی ہیں ورنہ میرا ان چیزوں سے بلا واسطہ کوئی تعلق نہیں ہے۔

میں تو اس تکمیل تماشے میں زندگی کے تضاد سے بہت لطف اندوز ہوتا ہوں۔ زندگی

کی عقلی اور غیر عقلی شائی تقسیم ہے۔ اس کی دورنگی ہے اس کے تناقض ہے۔ صبح سے شام تک اور ازل سے ابد تک زندگی تناقض کی چوڑی پر ہی چلتی ہے اور اپنی وی ہوئی مضبوط اور قابل عمل دلیل کو خود ہی چلی چلی جاتی ہے۔ زندگی کا یہی کھیل سب سے بڑا تماشا ہے۔ اور اسی تماشے کو دیکھنے کے لیے زندگی کے نمائندے دور دور سے آتے ہیں۔

میرٹھ میں کوئی آدمی تھا۔ بہت ہی غریب اور مفلوک الحال۔ باقاعدہ بھکاری تو نہیں تھا لیکن اس کی گزر لوقات کا دار و مدار مانگنے پر تھا۔ سکے بند فقیر نہیں تھا بس ایک معمولی سا منگتا تھا۔ ایک روز اس کنگھے کو نہر کنارے پڑی پر ایک تھیلی ملی جس کے اندر بارہ سو روپے اور پانچ طلائی اشرفیاں تھیں۔ اس نے اس خزانے کو جھولی میں اندر لے کر پانچ مرتبہ گنا اور پھر یہ تھیلی پکھری لے چاکر جھڑپٹ کے پاس جمع کرادی کہ جس کی ہونٹانی بنا کر لے جائے اور فقیر کے حق میں دعا کرے۔

اسی میرٹھ کے اندر ایک مرد کہن سال سرد و گرم کشیدہ گرگ ہار اس دید و سیشن جج کی عدالت میں پیش ہوا جس نے ایک پانچ سالہ بچی کے کانوں سے سونے کی بالیاں کوچ کر اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالا تھا اور معصوم کی لاش اس نہر کے اندر پھینک دی تھی۔ سیشن جج کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ وہ بالیاں سات سو میں بکنا تھیں اور سنا نے سو روپے اس بنا پر کاٹ لئے تھے کہ مال چوری کا معلوم ہوتا ہے ا

سیشن جج نے آہ بھر کر کہا "اے ظالم اور سفاک قاتل آج سے چند سال پہلے جب میں اس شہر میں جھڑپٹ تھا تو ایک مرد درویش اس نہر کے کنارے سے بارہ سو روپے کی تھیلی صبح پانچ عدد طلائی اشرفیوں کے میری عدالت میں جمع میں کر گیا تھا کہ جس کی ہو آکر لے جائے اور ایک تو ہے کہ تو نے چند نکلوں کی خاطر خون ناحق سے ہاتھ رنگے اور معصوم بچی کے والدین کو عمر بھر کے لیے روتا بلکتا چھوڑ دیا۔ مجھ سمجھ میں نہیں آتا کہ تجھے اس گناؤ نے جرم کے لیے کیا سزا دی کہ لوگوں کو عبرت ہو اور معصوم کے گھر والوں کو قرار آئے۔"

بجرم نے ہاتھ باندھ کر کہا "جج صاحب میں وہی شخص ہوں جس نے نہر کنارے سے تھیلی اٹھا کر آپ کی عدالت میں جمع کرائی تھی اور کسی قسم کا انعام لینے سے انکاری ہو چکا تھا۔ مجھے پتہ نہیں جب کیا تھا اور اب کیا ہے۔ میں بھی وہی ہوں۔ شہر بھی وہی ہے۔ نہر بھی اسی طرح سے چل رہی ہے لیکن یہ واقعہ گزر گیا ہے اور اس پر میرا کوئی کنٹرول نہیں رہا۔

یا تو زندگی کے کچھ معافی ہیں یا بالکل نہیں ہیں۔ یا پھر تم خود زندگی کو معافی عطا کرتے

ہو۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے۔ یا تو تم کو اس بات کا احساس ہے کہ تم یہاں کس لیے ٹھہرے ہوئے ہو اور تم حالات و واقعات کا رخ اس طرف پھیرتے رہتے ہو یا پھر یہ سب کچھ ایسے ہی ہے اور کسی کو کوئی رخ معلوم نہیں۔

ایک مرتبہ ہم نے بابا مردان شاہ سے پوچھا "بابا جی یہ زندگی ہے کیا؟" تو انہوں نے گھور کر ہماری طرف دیکھا۔ پھر مسکرائے اور تالی بجا کر چو گوئیہ ٹوپی سر سے اتار کر پرے پھینکی "سجیدگی سے بولے" یہ زندگی ایک سمندر ہے۔ اور ہم اس سمندر کے بیچوں بیچ اونچی لہروں پر گھوم رہے ہیں۔ پتہ نہیں کہاں ہیں اور سمندر کا رخ کدھر کا ہے۔ اگر سطح آب پر نشان منزل ہوتے تو ہم بتا دیتے کہ ہم کہاں ہیں۔ لہروں پر سگ میل ہوتے تو ہمیں اپنے مقام کا پتہ چل جاتا۔ لیکن ہم پھر بھی بڑی ذہناتی سے خدا کو تلاش کر رہے ہیں اور ابد تک کرتے رہیں گے کیونکہ تلاش ہی ہماری منزل ہے۔"

خوش ہو کر بولے "انسان جب اپنا مقصود حاصل کر لیتا ہے تو اس کو روحانی سعادت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ آئندہ کی گود میں اتر جاتا ہے۔ لیکن جس طرح ایک گوجا کڑا سی گوشت کا ذائقہ نہیں بتا سکتا اسی طرح ہم بھی نہیں سمجھا سکتے کہ روحانی سعادت کیا ہوتی ہے اور نروان کا تانا بانا کیا ہوتا ہے؟"

لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ زندگی ایک طرف گھومتی گھومتی بالکل الٹ کیسے گھومنے لگتی ہے۔ وہ کونسا عمل ہے جو اس کا رخ دوسری طرف پھیر دیتا ہے اور وہ کونسی پھرت ہے جو پھرتے پھرتے اس میں دوسری جانب کا عمل پیدا کر دیتی ہے کیوں؟ کس لیے؟ کیسے؟ جب ہمارے یہاں کپڑے دھونے کی دلاکشی مشین آئی تو ہمارے تایا صاحب نے پہلے تو اس کے قریب کھڑے ہو کر سو دھو منون پڑھی (وہ صبح سویرے اس کا ورد کیا کرتے تھے) اور پھر مشین کے دونوں کناروں پر ہاتھ رکھ کر اس سے بیعت کر لی اور اونچی آواز میں پکار کر میری والدہ سے کہا "بی بی! از زندگی کاراز معلوم ہو گیا اور اس کا جید تمہاری اس کپڑے دھونے والی مشین نے کھولا کہ پہلے تو چکر سیدھے ہاتھ چلتا ہے اور گھڑی کی سوئیوں ہار گھومتا ہے پھر خود ہی الٹ جاتا ہے اور برعکس گھومنے لگتا ہے۔ نہ کسی نے کہا ہوتا ہے نہ سمجھایا ہوتا ہے نہ کوئی شمن دیکھا ہوتا ہے۔ بس یہ اس کی مرضی ہے کچھ زندگی کی کچھ زندگی کے مالک کی۔ ہم بے دخل لوگ ہیں۔ ہمارا کوئی عمل دخل نہیں۔"

مگر یہ سنگل شاہ نے کیا کیا۔ جس طرح ایک وزنی کٹڑی نہر کے پانی پر تیرتے ہوئے

ڈبکیاں کھاتی ہے کہ اب ڈوبی پھر نکلی پھر غرق ہوئی پھر باہر نکل آئی۔ سیدھی سپاٹ تیرتی رہی پھر غوطہ کھا گئی ایسے ہی سنگل شاہ نے کیا۔ کہاں سے ابھرا۔ کدھر کو ڈوبا پھر کیسے نکلا پھر کیونکہ غرق ہوا۔ نیچے ہی نیچے چلتا چلتا کس کنارے پر جا لگا۔ نہ اس کا کوئی اور معلوم نہ ٹھور۔ وہاں سے لوٹا تو ایک گرداب میں گھونسے لگا۔ گرداب سے بچا تو جل دھارا سمیت جولا بکھی میں جا گرا۔

ایسا کیوں ہوتا ہے! کیا کسی کے پاس کوئی ایسی کتاب ہے جس میں زندگی کے رموز ترتیب سے لکھے ہوں۔ جیسے فزکس کی کتاب میں باریک باریک مشاہدات ایکوشن کے دھاگوں سے باندھ کر لٹکادیے جاتے ہیں۔ جیسے عورتیں سردیوں میں خلیج کھانے کے لیے انہیں ڈوریوں میں پرو کر لٹکا دیتی ہیں۔ پتنگ اڑتے اڑتے جھپ کیوں کھا جاتی ہے۔ پتنگ باز استاد لوگ اس کی وجہ جانتے ہیں۔ دو پتنگ نیچے اتار کر ایک چھپی تھوک سے لاہر لگا دیتے ہیں۔ ایک چھکی پتنگ کے لنگوٹ سے نونچ کر پرے پھینک دیتے ہیں۔ پھر کنگولہ لٹا کر کہتے ہیں "جاؤ اڑاؤ۔ سیدھا اڑے گا۔"

گلد پٹڑ کے استاد ساتھ بیٹھے شاگرد کو بتا دیتے ہیں کہ جہاز کو ٹیڑھ سے بچانے کے لیے اسے ہائیں ہاتھ کی کرنٹ میں ڈال دو۔ پھر دونوں لٹیر پورے دبا دو۔ تاک کی سیدھ اوپر کو اٹھے گا اور کئی نہیں کاٹے گا۔

لیکن زندگی کو سیدھ میں رکھنے کے لیے کوئی فارمولا نہیں۔ امریکی لوگ اس قسم کی بہت سے کتابیں چھاپا کرتے ہیں: دوست بنانے کے گر، ہاس کے ساتھ مفاہمت، لڑکی پھنسانے کے طریقے، ازدواجی زندگی سے عہدہ بردار ہونے کے راز، حق مہر ادا کئے بغیر طلاق لینے کا طریقہ، لوگوں پر اثر انداز ہونے کے سات راستے۔۔۔۔۔ یہ اور اس طرح کی بے شمار ہفتے شائع ہوتی رہتی ہیں۔ لیکن زندگی پر حاوی ہونے اور حیات انسانی کے طیارے کا صحیح ٹیک آف کر کے سیف لینڈنگ کرنے کے کوئی اصول کسی بھی کتاب میں موجود نہیں۔

دوس والوں نے ایک سیدھا سارا راستہ بتایا تھا اور وہ دل کو بھی لگا تھا کہ زندگی کا جد لیاقتی عاذا عظیم نکال کر اسے نوع انسانی پر بقدر طلب ڈال دیا جائے تو زندگی پورے طور پر کنٹرول میں آ جاتی ہے۔ جس طرح منہ زور گھوڑا کانٹے دار دلہنہ دانتوں میں دبا کر سوار کے اشاروں پر گھومتا ہے اس طرح جد لیاقتی اقدار کو اپنا کر زندگی کا ہر مسئلہ آسانی کے ساتھ حل کیا جاسکتا ہے۔

اگر روس کچھ دیر اور زبردست اور اس کے فلسفے کو انسانوں کی جانید مل جاتی اور جیتے جاتے لوگ اس کے علم و فکر کا ٹھکانا بن جاتے تو کونہ جس کے رہنے والوں کی تقدیر بدل جاتی مگر افسوس روسی ناقد کی کو عجیب کاٹ کر اسے چشمہ حیاں پر اوڑھ دے منہ گرا دیا گیا۔ اس کی کھلی آنکھوں والے بے حس و حرکت چہرے کے نیچے ٹھنڈے ٹیلے بدل لیا کرتے تھے کاپانی گرگلا رہا تھا اور چھوٹی چھوٹی گھوم گھوم نکلیں ڈال رہا تھا۔

قلندر صاحب نے کہا ”یہ بھی ایک سنت ہے۔ ہمیں راہِ گراہ چلنا پڑتا ہے اور بھروسوں کا سناغزو کرنا پڑتا ہے۔ فرمانے والا فرماتا ہے کہ کبھی ہمیں قلاب تو سین کی مسند پر بٹھاتے ہیں اور کبھی ابو جہل کے دروازے پر بھیجتے ہیں۔ کبھی ہمیں ”شاہد اور منیر“ کا لقب عطا کرتے ہیں اور کبھی جلاوگر اور سوداگر کہلاتے ہیں۔ کبھی جبرئیل کو ہماری رکاب داری کے لیے بھیجتے ہیں اور کبھی بغیر عہد نامے کے ہمیں سکے میں داخل نہیں ہونے دیتے۔ کبھی آسمانی خزانے ہمارے حجرے میں لا رکھتے ہیں اور کبھی ایک جو کی خاطر ابو حمزہ کے دروازے پر بھیجتے ہیں۔ کبھی ہمارے نوکروں سے کسی کے ہاتھ سے چیز کھلواتے ہیں اور کبھی ہمارے دانت نا ایمان والوں کے ہاتھ سے تڑواتے ہیں۔ اور یہ اس لیے ہے کہ جہان والوں کو معلوم ہو جائے کہ ہماری راہ بہت مصیبتوں سے بھری ہوئی ہے۔ اگر تجھ کو اس راہ کا خیال ہے تو سر کو پاؤں دھالے اور سر کے بل سارا سفر طے کر نہیں تو اس راہ سے الگ ہو کر بیٹھ جا اس واسطے کہ یہ راہ معمولی پاؤں سے طے نہیں ہوتی!

میرا خیال ہے میرے دوست سنگل شاہ نے بھی یہ راہ معمولی پاؤں سے طے کرنے کی کوشش کی تھی اور زخم کھا کر جان سے ہاتھ دھو بیٹھا تھا۔

اس واقعہ کو گزرے پورے پانچ سال ہو چکے تھے۔ اس سے ایک ڈیڑھ برس پہلے میں اپنے استاد مرشد اور گرو سے آخری مرتبہ ملا تھا اور پھر ان کے درشن نہیں ہوئے تھے۔ لیکن مجھے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ وہ گوبائی کے گوردوارے میں رہتے ہیں اور ان تک پہنچنا بہت مشکل ہے۔ ایک تو وہ کسی سے ملتے نہیں اور کسی سے بات نہیں کرتے۔ دوسرے ایک پاکستانی کا آسام جانا اور وہاں چند روز قیام کرنا ایک مشکوک سی بات ہے۔

لیکن اب کی بار میں نے میسا کھی کے میلے پر آئے ہوئے نامانوس سکھ یا تریوں کو دیکھ کر فیصلہ کر لیا کہ میں بھائی اقبال سنگھ باہلی سے ملنے ضرور جاؤں گا اور جیتے روز کا ویرا ملا سارا وقت ان کے چہلوں میں گزار کر آؤں گا۔

انڈیا کا ویرا تو مل رہا تھا مگر گوبائی جانے کی اجازت نہیں مل رہی تھی۔ کسی نے مجھے بتایا کہ اگر عبدالغفار خان کے گھرانے سے رابطہ کر کے ان سے حکومت ہندوستان کے نام ایک رقعہ حاصل کیا جائے تو انڈین گورنمنٹ کو کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ رقعہ بردار کو نہ صرف وہاں جانے کی اجازت مل جائے گی بلکہ اس کے ساتھ شاہی مہمان کا سا سلوک کیا جائے گا۔

میں لاہور سے باچا خان کے گھرانے کو سفارشی فون کرا کے اور یہاں سے ان کے نام ایک پرزور تعارفی خط لے کر پہلے پشاور پہنچا تا کہ پشتوا کیڈی کے ایک کارندے کو ساتھ لے کر چار سو حاضری دے سکوں۔ لیکن گل زمان ایک دن کی چھٹی پر تھا اور مجھے مجبوراً پشاور قیام کرنا پڑا۔

روس افغانستان کی لڑائی آخری دہائیوں پر تھی اور پشاور افغانی مجاہدوں کی چھاؤنی بنا ہوا تھا۔ مقامی لوگ بہت تنگ تھے اور اپنے شہر کی ہر خرابی کا باعث افغان مجاہدین کو گردانتے تھے۔ جو سیاسی، معاشرتی اور حرکی طور پر تو مقامی لوگوں کی راہ میں حائل نہیں تھے البتہ

اقتصادی اور معاشی طور پر یہاں کی ہر صنعت سے بھرپور فائدہ اٹھا رہے تھے۔

شام کے وقت جب میں گرین ہوٹل سے باہر نکلا تو کسی نے مجھے میرا نام لے کر آواز دی۔ میں نے ٹھٹھک کر پیچھے دیکھا تو میری پہچان کا کوئی بھی نہ تھا۔ میں چلتے لگا تو پھر وہی آواز آئی۔ میں اپنی جگہ پر رک گیا اور گردن گھما کر کھڑا ہو گیا۔

ایک نوجوان میرے پاس آکر رکا۔ اس نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور شکرانے لگا۔ میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر زور سے بلایا اور اس کے جواب میں بہت سی مسکراہٹ اپنے چہرے پر بکھیری۔ وہ میرا ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے بولا "آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟"

میں نے نفی میں سر ہلایا تو اس نے کہا "میں حالات خان ہوں اور پشاور یونیورسٹی میں پڑھاتا ہوں۔" میں نے کہا "آپ کا چہرہ تو کسی حد تک مانوس سا نظر آتا ہے لیکن آپ کا نام میرے ذہن میں کہیں بھی موجود نہیں۔"

کہنے لگا "چند سال پہلے میں آپ سے ملا تھا اور ہم نے دو پہر کا کھانا کھٹے کھایا تھا۔ اس وقت آپ اتنے بھاری نہیں تھے۔"

میں نے شرمندگی ہاتھ ہونے کہا "میری نوکری ہی ایسی ہے۔ سارا دن بیٹھے رہنا پڑتا ہے اور بیٹھ بیٹھ کر آدمی فریہ ہو جاتا ہے۔"

کہنے لگا "آپ کا وہ دوست کہاں گیا؟"

میں اس کی بات نہ سمجھ سکا اور الوداع کی طرح اس کا منہ ہلکنے لگا۔

بولا "آپ کے اس سکھ دوست کو کیرے کی تلاش تھی۔۔۔۔۔ اور وہ۔۔۔۔۔"

لیکن جیستہ اس کے کہ وہ فقرہ مکمل کرتا میں پک کر اس سے بے یلگیر ہو گیا۔ میں نے کہا "تم تو حالات ہو حالات خان۔ ہم سے حسن ابدال میں ملے تھے اور ہم نے اسٹھے کھانا کھایا تھا۔ پشاور کی قہوہ اور ساتھ بھلی اور کچڑے؟"

اس نے کہا "وہ سکھ اقبال سکھ آپ کا مرشد تھا؟ باقاعدہ جیر بابا"

میں نے کہا "اس سے بھی زیادہ۔ وہ میرا سب کچھ تھا اور اس نے مجھے۔۔۔۔۔"

"تو اب وہ کہاں ہے؟" حالات نے مسکراتے ہوئے پوچھا "آپ کا سکھ جیر؟"

میں نے کہا "میں اسی کی تلاش میں انڈیا جا رہا ہوں اور یہاں سے سفارشی رقعہ لینے آیا ہوں۔۔۔۔۔ میرا جیر بابا بھائی باہلی گرختی ان دونوں گوبائی کے چھوٹے گوردوارے میں شہدہ

کیرتن کی بیٹھک کرتا ہے اور دوردور کے ہندو سکھ اس جہاں میں ارداس کرنے آتے ہیں۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہے؟" اس نے مسکرا کر پوچھا۔

میں نے کہا "جس لوگوں نے گوبائی میں ان کے شہد کیرتن میں حصہ لیا ہے انہوں نے خود مجھے بتایا ہے کہ گرختی بھائی باہلی بہت اونچے درجے کے گیانی ہو گئے ہیں لیکن ان کی صحت دن پردن گرتی جا رہی ہے۔"

"میں نہیں سمجھتا ان کی صحت گرتی جا رہی ہے، حالات نے یقین بھرے لہجے میں کہا "میں تو بلکہ یہ کہوں گا کہ وہ پہلے کے مقابلے میں زیادہ صحت مند زیادہ پرسکون اور زیادہ خوش باش ہو گئے ہیں۔"

میں نے اس سے یہ تو نہیں پوچھا کہ "آپ کو کس نے بتایا؟" لیکن میری مشکل کچھ ایسی بن گئی تھی کہ میرے سارے وجود کا تھکوا اس سوال میں ڈھل گیا تھا۔

حالات خان نے میرا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں پکڑ کر محبت سے دہلایا اور بڑی عقیدت کے ساتھ کہا "ہم سے ملنے کے بعد تو بھائی باہلی واپس انڈیا گئے ہی نہیں پھر وہ گوبائی کس طرح سے پہنچ گئے؟"

اب کی بار میں زور سے چیخا مگر ان سے پوچھ نہ سکا کہ "پھر وہ کہاں ہیں؟"

حالات خان نے میری چیخ کے جواب میں کہا "وہ ہمارے پاس ہیں اور ہمارے ساتھ رہتے ہیں۔"

"یہاں؟ پشاور میں؟ اس جگہ؟ آپ کے پاس؟"

حالات نے کہا "یہاں تو نہیں البتہ ہیں ہمارے ساتھ۔ ہم ادھر ہوتے ہیں اور وہ مستقل طور پر دروہام میں ہیں۔ لیکن ہمارا آنا جانا ہوتا ہے۔ میل ملاقات رہتی ہے۔"

"دروہام؟" میں نے حیرت سے پوچھا تو حالات نے بڑی آسانی سے کہا "نورستان میں ہے۔ افغانی نورستان میں۔"

میں نے کہا "بھائی باہلی صاحب نورستان میں رہتے ہیں؟ افغانستان کے علاقے میں؟ ان حالات میں؟"

حالات نے کہا "اب تو روسی فوجیں پسپا ہو کر واپس جا رہی ہیں۔ اب حالات ویسے نہیں البتہ اس زمانے میں بہت خراب حالات تھے جب انہوں نے اس سرزمین کو پسند کیا۔"

پھر حالات نے ادھر ادھر دیکھا جیسے بیٹھنے کی کوئی جگہ تلاش کر رہا ہو لیکن میں نے

اسے اس کا موقع نہیں دیا۔ میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر جھنجھوڑا اور اس کا سارا وجود ہلاتے ہوئے کہا ”مجھے ابھی اسی وقت اسی لمحے کھڑے کھڑے یہ بتاؤ کہ میرے مرشد وہاں کیسے پہنچے اور کس نے انہیں اس خطرناک علاقے میں لے جانے پر مجبور کیا۔“

طاہوت نے کہا ”جب ہم حسن ابدال سے آپ کو لاہور روانہ کرنے کے بعد پشاور جانے لگے تو بھائی اقبال سنگھ نے کہا ”اگر میں آپ کے ساتھ خود پشاور جا کر کیمرو تلاش کر سکوں تو کیا یہ زیادہ اچھا نہیں ہو گا؟“ جلال یار نے کہا ”یہی رائے تو میں آپ کو دے رہا ہوں کہ انڈیا سے اتنی دور آئے ہیں۔ کیمرو کی تلاش ہے۔ پشاور دو چار ہاتھ پر ہو گیا ہے۔ خود ہی چل کر دیکھیں اور خود ہی پسند کر کے خریدیں اور اگلے دن واپس آجائیں اگر زیادہ جلدی ہو تو اسی شام واپس آجائیں۔“

”اور بھائی بابلی آپ کے ساتھ پشاور جانے پر تیار ہو گئے“ میں نے تھملا کر پوچھا۔
”تیار کیا ہو گئے“ طاہوت نے کہا ”وہ ہمارے ساتھ آگئے۔۔۔۔۔۔ یہاں تین طرح کے روسی کیمرو تھے اور تینوں کے درمیان انتخاب مشکل تھا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ ہیرا تھا لیکن ماسٹر بابلی صاحب تینوں خرید نہیں سکتے تھے۔ ایک مرتبہ انہوں نے اپنی کلارنٹ فروخت کرنے کا بھی سوچا لیکن میں نے منع کر دیا کہ ایسی نایاب چیز پھر نہیں ملے گی۔ اس کو رہنے دیں۔ دو چار سو کی ضرورت ہو تو ہم حاضر کر دیتے ہیں لیکن کلارنٹ نہ بیچیں۔ وہ ہنس کر کہنے لگے نہ یہ کلارنٹ کوئی سوغات ہے نہ وہ کیمرو کشتوری کی گاتھ ہے بس ایسے ہی کھیل تماشا سا ہے اور اسی کھیل تماشے کے ساتھ دل لگاتا ہے۔“

پھر لے لیا انہوں نے کیمرو؟ میں نے جلدی سے پوچھا۔

”لے لیا اور سب سے اچھے والا لیا۔ ہم نے اس سے بہت سے فوٹو اٹھائے۔ کچھ ہمارے پاس ہیں کچھ انہوں نے رکھ لئے۔۔۔۔۔۔ اگلے روز ہم کو افغانستان میں غزا پر جانا تھا۔ ہماری بڑی مضبوط چھاپہ مار پانی تھی اور ہم نے کندوز کے علاقے میں روسی ٹینکوں کے چھکے چھڑا دیئے تھے اور ایک مرتبہ پھر ہم کو اصرار جانے کا امر ہوا تھا اس لیے ہم نے ماسٹر بابلی صاحب سے اجازت طلب کی اور اپنے ڈیرے پر آگئے۔ وہ اپنے کیمرو کو دو لفافوں میں لپیٹ کر اور پلاسٹک کے تھیلے میں ڈال کر اپنے ہوٹل چلے گئے۔“

پروانہ ہوٹل ریلوے سٹیشن کے بالکل قریب تھا اور اس کے ارد گرد افغانی پناہ گزینوں اور افغانی جاننازوں کے ڈیرے تھے اور ان پناہ گزینوں میں کچھ تعداد کا بلی سکوں

کی بھی تھی۔
صبح جب ہم غزا کے لیے چلے گئے تو ماسٹر بابلی سنگھ اپنے کیمرو کا تھیلہ اور کلارنٹ کا کیس اٹھا کر ہمارے ڈیرے پر پہنچ گئے اور سنجیدگی سے بولے ”میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گا۔“
میں کیمرو سے ساتھی اور گروپ کا سردار یہ اعلان سن کر حیران رہ گئے۔ ان کو ساتھ لے جانا تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں تھا لیکن حفاظت خود اختیاری کے تحت ایک افغانی کو ایسے حساس مقام پر ساتھ لے جانا جنگی مصلحت کے خلاف تھا۔

کندوز کا علاقہ شمالی افغانستان کا علاقہ تھا اور یہاں احمد شاہ مسعود کا عمل دخل تھا جو کٹلو دینی مجاہد ہونے کے باوجود روسیوں کے ساتھ گہری وابستگی رکھتا تھا۔ گورو سیوں کے ظلم و ستم اور روزمرہ کی مالدعا نے اس کو کافی بدول کر دیا تھا لیکن پھر بھی وہ اپنے نظریاتی جھکاؤ کے باعث ان کی دوستی کا دم بھرتا تھا اور اندر سے نہیں چاہتا تھا کہ روسی اس طرح سے واپس جائیں جس طرح سے کہ ان کو جانا پڑ رہا تھا۔

جلتی بجھتی لڑائی اب بھی افغانستان میں جاری تھی اور دنیا کی عظیم ترین سپر پاور پتھروں سے سر پھوڑ کر واپس جا رہی تھی۔ احمد شاہ مسعود نہیں چاہتا تھا کہ یہاں وسطی افغانستان جیسے ملاؤں کا زور بڑھ جائے لیکن زور پھر زور ہے۔ بڑھتا ہے تو بڑھتا ہی چلا جاتا ہے۔ روسی فوجی دلوں کے اندر نفرت کی آنکھوں میں انتقام کی اور گھروں کے اندر اور باہر ہارنگی شعلوں کی آگ بھڑکا کر جا رہی ہے تھے اور ظلم بھی کر رہے تھے۔

افغانی ان کے خلاف پورے زور سے جہاد کر رہے تھے اور ان کے سامنے سیدہ چلائی ہوئی دیوار بن کر کھڑے تھے لیکن اپنے مزاج سے مجبور اور اپنی سرشت کے آگے سرنگوں آپس کے اختلافات مٹانے سے معذور تھے۔ ہر سردار نے اپنے اپنے علاقے کی پشتیبانی کی ہوئی تھی لیکن ان کے درمیان ہم آہنگی اور یکا گت کی کوئی ڈوری نہیں تھی۔

”پھر تم نے ان کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟“ میں نے پوچھا۔

طاہوت مسکرایا اور آنکھیں بند کر کے بولا ”وہی سلوک جو ایک فریڈم فائٹر دوسرے فریڈم فائٹر سے کرتا ہے۔۔۔۔۔۔ سکھ بھی تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ میں نے کہا کوئی پروا نہیں۔ ہر چہ باوا باا۔۔۔۔۔۔ ماسٹر بابلی سنگھ ہمارے ساتھ مجاز پر جانے گا اور ہمارے ساتھ لڑے گا۔“

طاہوت نے کہا ”لڑنے کا نام سن کر ماسٹر صاحب ذرا گھبرائے اور ڈالڑھی کھجا کر

بولے ”ہم بھرتی لوگ ہیں۔ گاجا کر سندھیا کرتے ہیں ہمارا لڑنے بھڑنے سے کیا کام۔“
 ”لیکن ہم نے ڈھانا بند ہوا کر ان کو اپنے ساتھ جیب میں بٹھالیا اور چترال روانہ ہو گئے۔ لواری ٹاپ ان دنوں کھلا تھا اور تھوڑی ٹرکوں اور مال و اسباب کی گاڑی کے بجائے وہاں مجاہدین کی آمد و رفت زیادہ تھی۔ ہم ہاسٹر صاحب کو لے کر چترال کے راستے شگلیاب گھاٹی سے نورستان اتر گئے۔“

”جیب لے کر؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا۔

”نا بابا“ طاہر نے کالوں کو ہاتھ لگا کر کہا ”جیب اوھر کو ہر جاتی ہے۔ وہاں تو پیدل ہی سفر کرنا پڑتا ہے۔ جیب ہم نے چترال پہنچنے کو ٹرکوں میں چھوڑ دی اور خدا کا نام لے کر گہرے نورستان میں اتر گئے۔۔۔۔۔ راستے میں ”جونی“ پر درختوں کی خوشبو پر ہاسٹر صاحب ایسے موہت ہوئے کہ انہوں نے خوشبودار پتے کھسٹ کھسٹ کر اپنی ساری جیبیں بھر لیں اور کھارنٹ کے کیس میں بھی ”جونی پر“ کے لیٹ دار پتے بھر لئے۔“

”کھارنٹ وہ ساتھ لے گئے۔ حجاز جنگ پر؟“ میں نے حیرانی سے پوچھا تو طاہر نے ہنس کر کہا ”یہی تو ایک ان کے پاس ہتھیار تھا اپنی حفاظت کے لیے۔ دوسروں پر حملہ آور ہونے کے لیے۔ گلے میں سائل کرنے کے لیے“

پھر وہ ذرا سا رک کر بولا ”پشاور میں انہوں نے کھارنٹ کیس کے ساتھ ہولسنر کی ایک چری بدھی فکس کر لی تھی اور وہ اس بدھی کو کندھے پر ڈال کر یوں چلتے تھے جیسے انہوں نے پستول لٹکایا ہوا ہو۔ شگلیاب گھاٹی سے اترتے ہوئے اس ظالم کیس نے ہٹو کے مار مار کر ان کا پہلو زخمی کر دیا لیکن وہ ہنسی خوشی ہمارے ساتھ نیچے اترتے گئے۔“

”کو مسلک سرائیک نے لڑائی کا نقشہ بدل دیا تھا اور افغان مجاہد شکر چلانے کے ایسے ماہر ہو گئے تھے کہ اس کے موجد بھی ہنگام دار و گیر اس کی باریکیوں سے اس قدر واقف نہ ہوں گے تاہم لوجو افغانوں کے مقابلے میں بڑی عمر کے افغان اس کو زیادہ بہتر انداز میں چلاتے تھے اور اس سے سو فیصد مطلوبہ نتائج حاصل کرتے تھے۔ پھر بھی روس ایک سپر پاور تھی اور اس کے اندر غرور کی ایسی تزچہ می تھی کہ اسے پورے طور پر پسپا کرنا بھی دور تھا۔“

میں نے طاہر کی لمبی گفتگو کو سچ ہی میں کانٹے ہوئے کہا ”لیکن وہ اس وقت کہاں ہیں۔ میرے گورو میرے مرشد میرے وطنی میرے ہادی؟“

اس نے کہا وہ ابھی وہیں ہیں۔ افغانستان میں۔ سنگانہ کے علاقے میں گاؤں کے ساتھ

والی چھوٹی بستی میں۔۔۔۔۔“

اور سنگانہ کہاں ہے؟“ میں نے چٹائی سے پوچھا۔
 ”پچ شیر کا ایک گاؤں ہے۔“ طاہر نے بولا ”ایک طرح سے ہمارا ہیڈ کوارٹر تھا لیکن پھر ہم کو یہاں سے بھاگنا پڑا۔“
 ”کیوں؟ بھاگنا کیوں پڑا؟“

”اسے روسیوں نے مل ڈوز کر کے کھنڈر بنا ڈالا۔ سارے گھر گرا دیے۔ بہت سے لوگ مارے گئے باقی کے عورتوں اور بچوں کو لے کر بھاگے۔“

پھر وہ سنگانہ کی یاد میں کھو گیا اور کہنے لگا ”یہ ایک بہت ہی خوبصورت بستی تھی جہاں میرے نضیال کا گھر تھا۔ ہمارے گھر کا محن بہت کھلا تھا جس میں پاکستان تھے اور اعلیٰ درجے کے انگور پیدا ہوتے تھے۔ ساری کھپ ستمبر کے مہینے میں پک کر بے حد میٹھی اور لب دوز ہو جاتی تھی۔ ایسے انگور جنت میں ملتے ہوں تو شاید ورنہ اس دنیا میں سوائے سنگانہ کے اور کہیں نہ ملتے تھے۔ لیکن اب سارے پاکستان اجڑ چکے ہیں اور وہاں انگور نام کی کوئی شے دستیاب نہیں۔“

پھر وہ خاموش ہو گیا اور بڑی دیر تک اسی طرح سے خاموش بیٹھا رہا۔
 میں نے دیکھا اس کے چہرے پر کرب کے آثار پیدا ہونے لگے تھے اور وہ شدت غم سے کانپنے لگا تھا۔ مجھ میں اس سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی۔

اس نے اپنے چہرے پر دعا مانگنے کے انداز میں ہاتھ ملے اور مطمئن ہو کر بولا ”روسی ہماری بستی سے میرے والد کو پکڑ کر لے گئے۔ اس پر پٹرول کا چپا ڈالا اور پھر اس کو دیا سلائی دکھا دی۔“

میرا والد جلد رہا، ہتھیار ہا، سنگانہ لیکن اپنی جگہ سے نہیں ہلا دیں کھڑے کھڑے کوئلہ ہو گیا۔ روسیوں کا خیال تھا مرنے سے پہلے وہ ان کو قصہ بیل دکھائے گا اور وہ تالیاں بجا بجا کر اپنی بھڑی دھن پر فتح کا ترانہ گائیں گے لیکن ایسا نہیں ہوا۔۔۔۔۔ اس کے بعد میرے چاروں بھائی روسیوں کے خلاف لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ ایک بھائی کاٹل جیل میں ہے اور میں یہاں ہوں۔“

پھر اس نے اچانک پوچھا ”اپنے مرشد سے ملو گے؟“

میں نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا ”ضرور۔۔۔۔۔ ہر حال میں۔۔۔۔۔ ابھی اسی وقت!“

اس نے کہا "کل تو چترال کی فلاح نہیں ہے۔ پرسوں چلیں گے۔"
 آپ اندازہ نہیں کر سکتے۔ بلکہ کوئی بھی نہیں کر سکتا کہ میں نے کس مشکل سے یہ وقت
 گزارا اور کیسے کیسے گھڑی دیکھ کر اور بازار کے چکر لگا کر رات کو دن کو رات میں
 تبدیل کیا۔ میں تو اندیا کا ویرا اور گوبانی تک پہنچنے کی سفارشی چٹھی لینے آیا تھا اور مجھے اس سے
 بالکل الٹی سمت سفر اختیار کرنے کا حکم ہو گیا۔ حکم بھی عجیب سمندر ہے جب پھینکا ہے تو ہر
 فیصلہ ہر حکمت ہر منطق ہر منصوبہ اور ہر تجویز اس کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ جب لہر واپس
 جاتی ہے تو ریت پر کوئی نشان بھی باقی نہیں رہتا۔ سارا ساحل پھر سے کونرا ہو جاتا ہے۔

۲۷

چترال پہنچ کر علالت نے مقامی مرکز سے تین برقدار غلام نبی احمد شاہ اور اعظم اپنے
 ساتھ لیے اور ہم شام کے اندھیرے میں ان کے ہاتھوں سے نورستان کی طرف اترنے
 لگے۔ انتقال ہائیڈل سفر میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔ چترال سے سیدھے پیشہ وادک
 وہاں سے جنوب کی جانب برگ مظل اور پھر وہاں سے درہ سم کے راستے کا نئی واد کی جانب۔
 سفر کے دوران ہم نے ایک رات پاپوک کے چائے خانے میں بسر کی۔ غلام نبی بتا رہا
 تھا کہ میں امام صاحب کا رہنے والا ہوں اور چار وزہ کے مقابلے میں مجاہدین کے ساتھ تھا
 جب ایک سو ستر روسی ٹینکوں نے چار وزہ میں داخل ہو کر یکے بعد دیگرے فائر کھول دیا۔
 مجاہدین ان کا مقابلہ کرنا چاہتے تھے اس لیے ہم گاؤں کے اندر مختلف مقامات پر پھیل گئے
 اور مقابلہ شروع ہو گیا۔ جب ہم نے چھپتے روسی ٹینکوں کو جاہ کر دیا تو روسیوں نے شہریوں
 سے لڑنا شروع کر دیا۔ انہوں نے تین چار سو گھرجاہ کر دیے تو مجاہدوں نے روسیوں کو
 گھیرے میں لے لیا اور ان پر نشانہ باندھ کر فائر کرنے لگے۔ عین اس وقت چالیس پچاس
 روسی جہاز پر باندھ کر کندوز کی طرف سے آئے اور انہوں نے سربینگ کر کے روسی
 محاصرین کے گرو مجاہدین کا گھیرا توڑ دیا۔ اس جھڑپ میں ایک روسی جرنیل مارا گیا اور مجاہدین
 ہوائی حملے کی تاب نہ لاتے ہوئے پسپا ہو گئے۔

اپنے جرنیل کی موت کا بدلہ لینے کے لیے روسیوں نے قصبے کی اینٹ سے اینٹ بجا
 دی اور سڑھے سات سو افراد کو گولیوں سے بھونک دیا۔

روسی سپاہی بہت سے قالین، کیسٹ پلیئر اور نقدی لوٹ کر خوش ہو گئے۔ پھر انہوں
 نے نو عمر افغان لڑکوں کو درختوں کے ساتھ کھڑے کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا اور قصبے کی
 عورتوں کی چھاتیاں کاٹ دیں۔

غلام نبی نے کہا "یہ روسی سارے خوک مفت انسان ہوتے ہیں۔ نہ ان کے دلوں میں رحم ہوتا ہے نہ ان کے سروں پر رحمت ہوتی ہے۔ ان کی شکل و صورت تو انسانوں جیسی ہے لیکن یہ انسان ہوتے نہیں۔ بس ایسے ہی انسان نما لگتے ہیں۔۔۔۔۔ انہوں نے افغانستان پر ایسے ایسے ظلم کئے ہیں کہ کوئی ان کی روداد لکھ نہیں سکتا۔ لکھے گا تو درمیان میں ہی دہل کر مر جائے گا۔ ہم ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ چائے خانے کے لڑکے نے آکر کہا "ہمارے اوپر سے روسی جہاز گزر رہے ہیں۔"

طاہوت نے دونوں کانوں کے پیچھے ہاتھ کر کے غور سے سننے کی کوشش کی تو غلام نبی اور احمد شاہ نے ایک ساتھ کہا "غور کرنے کی کیا ضرورت ہے ان کی گھوکر تو صاف سنائی دے رہی ہے۔"

واقعی ان کی گھوکر صاف سنائی دے رہی تھی اور وہ بہت نیچی پرواز میں بہتی کے اوپر سے گزر رہے تھے۔

اعظم نے کہا "سارے واپس نہیں جاسکیں گے۔ اگلے موڑ پر کوئی سنگڑ ان سے ٹکرائے گا ضرور۔ اور جب ایک کھڑا ہو گیا تو پھر کئی عاشق مزاج سنگڑ بوسہ بازی کے لیے اوپر لپک آئیں گے۔"

ہم ابھی یہ باتیں کر رہے تھے کہ چائے خانہ کے مالک نے لڑکے کو بھیجا کہ مہمانوں سے کہئے کہ چار پائیوں سے اٹھ کر بڑے پتھروں کی اوٹ میں چلے جائیں "مصافحہ" شروع ہو گیا ہے۔"

طاہوت نے اپنا تکیہ اٹھاتے ہوئے مجھ سے کہا "اپنا تکیہ اور چادر لے لیں۔ آپ نے پتھروں پر کوئی رات نہیں گزاری ہوگی۔ یہ بھی خدا کی ایک رحمت ہے۔"

ہم اپنے اپنے تکیے اٹھا کر کھڑے پتھروں کی اوٹ میں چلے گئے اور ہم سے تھوڑی دور سبباری بھی ہوتی رہی اور نشانہ بازی بھی اپنے عروج پر رہی۔ غلام نبی اور اعظم خراسانی لینے کے عادی تھے لیکن احمد شاہ اپنی نیند سویا ہوا تھا۔ گہری اور مٹھی نیند۔ دنیا و مافیہا سے بے خبر۔

طاہوت حق میزبانی ادا کرنے کے لیے میرے ساتھ جاگ رہا تھا اور مجھ سے بار بار کہہ رہا تھا "یہ آپریشن ہم سے کافی دور ہے۔ خطرے کی کوئی بات نہیں۔ لیکن پھر بھی بے آرمی اور بے لطفی کا وقت ضرور ہے۔ آئی ایم سوری۔"

صبح جب ہم پتھروں کے اندر سے براہد ہوئے تو موسم بڑا صاف اور ماحول بالکل

شفاف تھا۔ دھوپ نکل آئی تھی اور ہر طرف ایسا سکون تھا جیسے یہاں کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ہم پہاڑوں میں گھر سے ہڑے کی بہت سے حریف علاقے سے گزر رہے تھے۔ طاہوت اور غلام نبی میرے آگے تھے اور اعظم اور احمد شاہ میرے پیچھے۔ راستہ بھر انہوں نے یہی التزام رکھا تھا۔ اتنا لمبا سفر پیدل طے کرنے سے میرے پاؤں متورم ہو گئے تھے اور تھکاوٹ کی وجہ سے میرے قدم ڈگمگانے لگے تھے۔ لیکن یہ عزت کا معاملہ اور محبت کا مظاہرہ تھا میں کسی طرح سے بھی اپنی مامدگی ان پر ظاہر نہیں ہونے دیتا تھا۔

کوئی ایک ڈیڑھ میل چلنے کے بعد طاہوت نے کہا "آپ کے پیشوا ماسٹر باہلی سنگھ اس علاقے میں بہت مشہور تھے۔ لوگ انہیں "باہی والا جی" کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ صبح ایک پہاڑی نیلے کی چونچ پر بیٹھ کر اپنے کلا رٹ پر کوئی مشکل ساراگ بجاتے تھے اور شام کے وقت کسی اور پہاڑی پر چڑھ کر ایسی سواگتی دھن بجاتے کہ تھکے ہارے کسان زخمی مجاہد اور بھوکے ذہور ڈگر ہستی کی طرف آتے ہوئے شادمانی اور کامرانی سے بھر جاتے تھے۔۔۔۔۔ میں نے ہوائی حملوں کے درمیان کئی مرتبہ ان کو اسی طرح پہاڑی پر بیٹھے تائیں اڑاتے اور بدن لہراتے دیکھا تھا جب کہ ارد گرد کی عورتیں اور بچے پکار پکار کر ان کو اتر آنے کے لیے اور چھپ جانے کے لیے کہتے تھے۔ کئی مرتبہ بڑی عمر کی کوچی عورتیں انہیں پتھر مار مار کر اور گالیاں دے دے کر نیچے اتر آنے کو کہتی تھیں لیکن ان کو کچھ سنائی ہی نہ دیتا تھا۔ دواہنی توتی کا منہ اوپر اٹھا کر ہم پھینکتے طیاروں کو منع کرتے جاتے تھے اور ان کی سناہنی کی کڑک و حرک اور پھر عاجزی بے بسی اور لاچارگی کے بین پہاڑوں کے اندر راتنی شدت سے گونجنے لگتے تھے کہ طیاروں کے اندر گولہ پھینکنے والی مشینیں رنجک چاٹ جاتی تھیں۔

یہاں کے لوگ تو نہیں جانتے لیکن میں نے ہر مرتبہ پھرے ہوئے جہازوں کو بڑی شرمندگی کے ساتھ واپس جاتے ہوئے دیکھا۔

میں نے کہا "لیکن ان کی ملاقات میں اب کتنی مسافت جاکل ہے۔"

طاہوت نے کہا "ابھی تو کچھ دیر ہے اور کچھ لمبا ہی فاصلہ ہے لیکن ان سے آپ کی ملاقات آج دوپہر سے پہلے پہلے ہو جائے گی۔"

"اور اگر وہ ہستی میں نہ ہوئے۔۔۔۔۔ پھر؟" میں نے خوفزدہ ہو کر پوچھا۔

"انہیں کہیں اور کہاں جانا ہے" غلام نبی نے یقین سے کہا "بہتی کے لوگ ان کو دور جانے ہی نہیں دیتے۔"

ہمارے دائیں ہاتھ پر ایک چھوٹا سا گاؤں ہمساری سے زمین بوس ہو چکا تھا۔ کچے پکے گھر سب مسار ہو چکے تھے۔ پہاڑ کی اوٹ پتھر کی ایک گرائل دیوار کو ہمارے کھڑی تھی۔ اس دیوار کے ساتھ ایک کمرہ اپنی نازل صورت میں موجود تھا۔ جن لوگوں کے یہاں گھر تھے وہاں اب انہوں نے جھوپڑیاں اٹھالی تھیں۔ کچھ نجیف و نزار بکریاں اور ذینے ان جھوپڑیوں کے گرد بندھے تھے۔ عورتیں کھانے پکانے میں مصروف تھیں۔ لڑکے بالے قریب قریب کھیل رہے تھے اور سارے گاؤں پر مایوسی اور پشیمانی کی فضا مسلط تھی۔

طاہر نے وہاں دیک کر ہاتھ کے اشارے سے کہا "یہ اس بستی کے سردار کا گھر تھا۔ اس کی خوبصورت بالکنی پر اخروٹ کا ایک گرائل درخت چھایا ہوا تھا جس میں بے شمار پرندے شام کے وقت بیزا لیتے تھے۔ بالاخانے کے آخر میں ایک صاف ستھری بیت الخلا بھی جو افغانستان کے دیہی علاقوں میں ایک کیاب چیز ہے۔ ہم اس پہاڑ کی اوٹ میں گھات لگا کر بیٹھے تھے۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ سہ پہر کے قریب روسیوں کی ایک جیپ اس طرف ریکی کرنے آئے گی جس پر واپسی کے سارے راستے مسدود ہونے بہت ضروری ہیں کہ وہ یہاں سے کوئی اطلاع لے کر اپنے پونٹ تک نہ پہنچ سکیں۔ یہ کام کچھ ایسا مشکل نہیں تھا۔

تین بج کر کچھ منٹ پر یہ جیپ آئی۔ اس کے چاروں کناروں پر آٹوینک مشین گنیں لگی تھیں اور اس میں پانچ روسی سوار تھے۔

ہم اپنی اپنی کلاشکوف سنہیل کر اڑت ہو گئے۔

جیپ رکی اور اس میں سے تین روسی اتر کر اور اپنی آٹوینک بستی کی طرف تان کر آگے بڑھے۔ دو لڑکے خوفزدہ، متحسرس، حیران ان کے سامنے آگئے۔ ایک بڑا تھا کوئی دس حکیمار سال کا ایک چھوٹا سا بچہ ساڑھے پانچ سال کا۔ ایک روسی سپاہی نے چھوٹے کو کندھے سے پکڑ کر اپنی طرف اشارہ کیا اور پوچھا "دوست کہ دشمن؟"

چھوٹے بچے نے خوف سے کانپتے ہوئے کہا "دوست۔"

روسی نے اس کے کندھے پر چھکی دی تو اس کے بڑے نے زمین پر نفرت سے تھوک کر کہا "دشمن دشمن!!" اور پھر سر اونچا کر کے کھڑا ہو گیا۔

دوسرے سپاہی نے آگے بڑھ کر زور سے اس کے منہ پر طمانچہ مارا اور زمین پر اچانک

پوٹ مار کر کہا "دوست دوست!!"

اس لڑکے نے پھر کہا "دشمن دشمن۔"

سپاہی نے اسے گریبان سے پکڑ کر زمین پر پٹا اور اس کی پسلیوں میں زور کا ٹھٹھا مارا۔ لڑکا دوسرے چٹخاؤ دینے ہوئے بولا "دشمن دشمن!!"

چھوٹا لڑکا اونچے اونچے رونے لگا لیکن کوئی اس کی مدد کو نہ آیا۔ بستی کے اندر عورتیں زیادہ تھیں اور انہوں نے خوف کے مارے دروازے بھیڑ رکھے تھے۔ ہم لوگ پہاڑ کی اوٹ میں ایسے اینگل پر تھے کہ روسی سپاہی ہماری زد میں نہیں تھے۔

جب زمین پر پڑے لڑکے پر ایک سپاہی نے اپنا پوٹ رکھ کر اسے سلا تو دوسرے نے آکر اس کے گھٹنے پر ہاتھ مارا اور پاؤں اٹھانے کے لیے کہا۔

پاؤں اٹھا تو لڑکا بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس رحول سپاہی نے جس نے لڑکے پر سے ہانگ اٹھوائی تھی لڑکے کو کان سے پکڑ کر اور دو تین مرتبہ اس کے سر کو جھٹکے دے کر اسے اخروٹ کے ایک درخت کے پاس لے گیا۔ اس نے لڑکے کا سر اخروٹ کے تنے سے لگا کر جیب سے ایک کیل نکالی اور اسے لڑکے کے کان پر رکھ کر اپنی آٹوینک کے دتے سے اسے تنے میں ٹھونک دیا۔ لڑکے کے کان سے خون کی دھار بہہ نکلی۔

روسی سپاہی نے ہنستے ہوئے پوچھا "دوست کہ دشمن۔"

لڑکے نے ایک مرتبہ پھر تھوکا اور کہا "دشمن دشمن۔"

جب ایک سپاہی نے لڑکے کی طرف اپنی تالی کا رخ کیا تو گھروں کے اندر چھپی ہوئی عورتوں نے نالہ و فریاد سے آسمان پر اٹھالیا۔ پھر بیت نہیں کیا ہوا میرے پاس ایک بیولا سا لڑکا اس نے میرے ہاتھ سے میری کلاشکوف چھین کر باہر چلا نکلا۔

مجھے تم پنجابی لوگوں کی ایک گندی سی گالی سنائی دی۔ اس کے ساتھ عین سامنے سے کلاشکوف چلی اور تینوں روسی فوجی آن واحد میں ڈھیر ہو گئے۔ جیب میں بیٹھے ہوئے دونوں روسیوں نے ہماری طرف غار کھول دیا۔ میں بے اختیار ہونے کی وجہ سے اور اوٹ میں ہو گیا اور میرے چاروں ساتھی دشمن پر حملہ آور ہونے کی کوشش میں ایک ایک کر کے شہید ہو گئے۔

پھر میں نے گرنہی کی آواز میں "یا علی" کا ایک دیوانہ وار نعرہ سنا اور جیب کی طرف سے قاتر بند ہو گیا۔ لڑکے نے درخت سے اچانک چھڑوانے کے لیے سر کو زور سے جھٹکا اور پٹھا ہوا لہو لہان کان لے کر میرے پاس اوٹ میں پہنچ کر اونچے اونچے روتے ہوئے بولا "دشمن دشمن! ہو گیا۔ ہمارے مجاہد بھی شہید ہو گئے۔ پانچوں کے پانچوں شہید۔ باجے والا جوگی بھی شہید

ہو گیا۔“

”میں تڑپ کر باہر نکلا۔ مختصر سی زمین لاشوں سے اٹی پڑی تھی۔ بھائی اقبال سنگھ مگر ننھی نے میری کٹا شکوف کو منسوب ملی کے ساتھ سینے سے لگایا ہوا تھا اور ان کی بگڑی کے دو تین بل کھل گئے تھے۔“

جب ہم لمبی کے قبرستان میں گئے تو طاووت نے ایک الگ تھلک قبر کی طرف اشارہ کر کے کہا ”لیجئے مریہاں رہتے ہیں آپ کے مرشد۔ آپ انہیں دھوٹے اتنی دور گواہی جا رہے تھے۔“

میں نے طاووت کی بات کا کوئی جواب نہ دیا اور گم سم قبر کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے کہا ”ہمیں معلوم ہے سنگھ لوگ بھی اپنے مردوں کو بندوں کی طرح جلاتے ہیں لیکن یہاں مشکل تھی اس لیے ہم نے ان کو بھی مجبور دفن کر دیا۔ انہی کپڑوں میں اور اسی لباس میں جو وہ پہنے ہوئے تھے..... اس علاقے کے لوگ اب ان کو پہلے سے بھی زیادہ یاد کرتے ہیں۔ بڑا ہی دلیر انسان تھا حالانکہ باجوہ بھانے والا تھا۔“

جب میں نے اس کی کسی بات کا کوئی جواب نہ دیا تو اس نے مجھے تسلی دینے کی خاطر میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا ”ہم نے ان کا کارٹ بھی انہی کے ساتھ دفن کر دیا! ٹھیک ہے؟“

میں نے آہستہ سے اثبات میں سر ہلایا اور پھر ہم ہولے ہولے قدم اٹھاتے قبرستان سے باہر آ گئے۔